رجسٹر شدہ بہ سرکار عالی نمبر ۴

جلد (۴) شہریور ١٣٣٩ ف م جولائی ۱۹۳۰ء شمارہ (۱)

زیر سرپرستی جناب آغا فضل محمد خان صاحب ایم اے نائب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

دائرۂ ادارت:۔

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن بی۔ اے۔ بی ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبدالنور صدیقی بی اے۔ بی ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدا کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا

اُصول

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ
صرف اُردو حصہ (عہ) فی پرچہ اُردو و انگریزی (۱۲) صرف اُردو (۸ر)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اُردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـــ۵	صہ۸ر	سے
نصف صفحہ	صہ	عالہ۱۲ار	صہ۸ر
ربع صفحہ	عالہ۸ر	عہ۲ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ شہریور ۱۳۳۸ف م جولائی ۱۹۲۹ء

جلد (۴) شمارہ (۱)

فہرست

افتتاحیہ

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کی تیسری سالانہ کانفرنس کا انعقاد ۲۹ و ۳۰ امرداد ۱۳۳۸ف م ۴ و ۵ جولائی ۱۹۲۹ء کو حمایت سٹی کالج کے وسیع ہال میں ہوا۔ اس کانفرنس کی دو خصوصیتیں جو اسے سابقہ کانفرنسوں سے ممتاز کرتی ہیں یہ ہیں کہ اولاً اس کی صدارت خود ناظم صاحب تعلیمات ریاست ابدمدت نے قبول فرمائی جس کی وجہ سے یہ جلسہ خالصتہً جلسہ اساتذہ ہوگیا جس میں کسی بیرونی اشخاص کو دخل نہ تھا۔ ثانیاً میر مجلس صاحب کی جدت طراز طبیعت نے طبقہ معلمین کی فائدہ رسانی کے نئے اسلوب پیدا کردئے۔ یہ حیدرآباد بلکہ ہندوستان کی پہلی تعلیمی کانفرنس ہے جس میں مختلف مضامین نصاب کی تعلیم کے متعلق مدرسین کے نقطۂ نظر سے رپورٹیں پیش کی گئیں اور ایک ہی وقت میں جو تعداد رپورٹوں کی پیش ہوئی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ ان کمیٹیوں کے ارکان اول سے آخر تک مدرسین تھے۔ وہ جو ہر کمیٹی کے مفوضہ مضمون سے دلچسپی اور عملی تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح یہ کمیٹیاں طبقہ معلمین کی حقیقی معنوں میں ترجمان تھیں۔ رپورٹیں بعد غور و خوض اور بڑی معرکہ آرائیوں کے بعد مرتب ہوئیں۔ عام طور سے کمیٹیوں کی سفارشیں عملی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں اور مدرسین کی دشواریوں ضرورتوں اور خیالات کا آئینہ ہیں۔ ان رپورٹوں کو جو قبول عام حاصل ہوا ہے اس کے بعد یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ آئندہ کانفرنسوں میں بھی دیگر مضامین کے متعلق رپورٹیں سنائی جائیں۔

امسال جو پانچ کمیٹیاں مقرر ہوئی تھیں وہ تعلیم انگریزی، تعلیم ریاضی، تعلیم پیشہ ورانہ، تعلیم اردو اور تعلیم جسمانی کے متعلق تھیں۔ ان کمیٹیوں کی روئیدادوں کو حاضرین نے "گوش نصیحت نیوش" کھول کر سنا اور سب کمیٹیوں کی محنت کی تصدیق "بدست" کی ان تمام کمیٹیوں کی کامل روئیدادیں باستثنا رپورٹ کمیٹی تعلیم انگریزی، متن رسالہ میں شائع کی گئی ہیں۔

افتتاح نمائش کی تقریب کے بعد جب جلسہ کا آغاز ہوا تو حمایت سٹی کالج کا فداریال اساتذہ بلدہ و اضلاع سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ چونکہ جناب ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی نے ازراہ کرم اساتذہ و افسران تعلیمات اضلاع کو بھی شرکت کانفرنس کی عام اجازت عطا فرمائی تھی اس لئے اجتماع زیادہ تھا۔ کمرہ میں تل ڈالنے کی جگہ نہ تھی اور دیر سے آنے والے حضرات زینتِ بام و در ہوگئے تھے۔

"اس نفسیاتی لمحہ" میں جبکہ فضا برقی قوت سے تھرتھرا رہی تھی، صدر استقبالیہ کے سحر آفریں ترنم نے مہر سکوت کو توڑا۔ مولوی احمد حسین خان صاحب نے محترم صدر نشین کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا اور اپنے

ہمہ گیر انداز اور اپنے تُلے الفاظ میں ریاست کی تعلیمی حالت، تعلیمی مسائل اور تعلیمی اصلاحوں کی طرف توجہ دلائی۔ سامعین کرام مسحور ہو رہے تھے اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی چہروں کی شگفتگی، نیم باز آنکھوں کی چمک اور زیرِ لب تبسم دلی کیفیات کی غمازی کر رہے تھے اور گو آدابِ مجلس مانع لب کشائی تھا لیکن دلوں میں ایک ایک لفظ پر آمنا و صد قنا کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ دفعتہً تعطیل کے ذکر پر اربابِ علم چونک پڑے۔ ایک جمعہ کی بجائے "دو جمعہ فی ہفتہ" کا مژدۂ جاں نواز "فردوس گوش" تو تھا لیکن کشمکش امید و بیم سے دل دھڑکنے لگا۔ آنکھیں میچ میچ کر دیکھا کہ کہیں خواب تو نہیں۔ ابھی عین الیقین نہ ہوا تھا کہ نو تا تین کی تجویز نے ولولوں کا پارہ کئی درجہ گرا دیا۔ "نو تا تین؟ خوب۔ سہ پہر میں جلد برخاست۔ ۴ پر جائیے۔ لیکن صبح کو ۹ بجے مدرسہ؟ یہ کیسے ہوگا؟ ناشتہ؟ خیر اس کو چھوڑو۔ مگر ٹیوشن؟ ۷ سے ۸ تک فقط ایک گھنٹہ۔ معاوضہ عنقا بہت ٹے تو صرف وقت ناکافی۔ معاوضہ ناکافی۔ اچھا سہ پہر میں؟ مگر لڑکے؟ وہ تو کھیل۔ ہا۔ کچھ دال میں کالا ہے۔ "یہ تحفۂ خونیں" نامنظور"

نو سے تین تک اوقات مدرسہ رکھنے کے لئے سالِ گذشتہ بھی تحریک ہوئی تھی لیکن صدر دفتر سے سوکھا جواب مل گیا۔ "عرض مکرر بھی جائے در قبول تک اس کی بلا کو کیا غرض" خیر اس کو غرض ہو یا نہ ہو لیکن سررشتۂ تعلیمات سے حال میں ورزش جسمانی کے متعلق جو احکام نافذ ہوئے ہیں اُن کے مدِ نظر تبدیلی اوقات کا مسئلہ ذرا غور طلب ضرور ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ تازہ حالات میں ۹-۳ کا وقت بھی کام نہ دے اس لئے اور دوسری ممکنہ صورتوں پر بھی لگے ہاتھ غور کر لینا بہتر ہوگا۔ مثلاً ۸-۲ یا ۹-۱۔ بہر صورت یہ مقتضائے مصلحت ہے کہ قطعی احکام کے قبل مختلف مدارس میں مختلف اوقات کی آزمائش کی جائے اور جو وقت بہترین ہو وہ مقرر کیا جائے۔

خیر مقدم کے آخری مسرت زا فقروں کی لرزش امواج ہوا میں کچھ تھوڑی سی باقی تھی کہ جناب سید محمد شریف صاحب مشہدی معتمد عمومی نے "بیک سانس" انجمن بیتی سُنا ڈالی۔ انجمن کی کارگزاریاں قابلِ اطمینان ہیں۔ اگر اس کا کوئی شعبہ "مرثیہ خواہ" ہے تو وہ رسالہ حیدرآباد ٹیچر ہے جو باوجود اپنی خدمات کے ناقدریِ زمانہ سے خستہ حال ہے۔ بچے بالعموم زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال میں اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے لگتے ہیں لیکن ٹیچر اپنی عمر کے تین سال پورے کر چکا اور ابھی تک مادر شفقۂ "انجمن" کی انگلیاں چھوڑ کر دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ سررشتۂ تعلیم متعدد ادبی، تاریخی، اخلاقی اور سائنٹفک

رسالوں پر گہر باریاں کرتا ہے کاش " اے ابر کرم بہر سخا کچھ تو ادھر بھی"۔

خطبۂ صدر صدر الخطب تھا۔ گرجتی ہوئی آواز سے سارا ہال گونج رہا تھا اور ایک ایک حرف دور و نزدیک سنائی دیتا اور دلوں پر نقش کالحجر ہوتا تھا۔ سرخیاں پیغام عمل تھیں۔ بادۂ پند کے ساغر چھلکے پیمانۂ نصیحت گردش میں آیا اور "بلاکشان تعلیم" جام پر جام چڑھا کر جھومنے لگے۔ طرز ادا کی خاطر نشینی کام کرگئی بے حس مردہ دل اور تقدیر یہ فرقۂ معلمین کے خون میں ایک مرتبہ جوش آیا اور کم از کم تھوڑی دیر کے لئے "دریا ہیجانہ خروشش" پیدا ہوگیا۔ ادبی تعلیم رائجہ کا چل چلاؤ دیکھ کر آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک پڑے لیکن پیامیانہ ایثار سے انہوں نے ان تجاویز کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جو ملک و قوم کی فلاح و نجات کے لئے ناگزیر تباتی گئیں۔

سابقہ تحریکوں کی توثیق کے علاوہ تین اہم تحریکیں پیش کی گئیں پہلی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ و جغرافیہ دکن فرسٹ فارم سے نکال کر ان کی جگہ ہندوستان کی تاریخ و جغرافیہ داخل نصاب کی جائے۔ گویا کہ جو نصاب دو سال قبل تھا اسی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ تو غالباً تمام مدرسین تسلیم کرتے ہوں گے کہ تاریخ دکن کی تعلیم ایک سال میں تسلی بخش طور پر نہیں ہوسکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ حیدرآبادی طلباء دوسرے صوبوں کے طلبہ کے دوبدوش رہیں اس لئے ان کو فرسٹ فارم میں تاریخ و جغرافیہ ہند پڑھانا پڑے گا مگر ہمارے نزدیک سابقہ نصاب بحال کرنے سے پہلے ایسی کتابیں تاریخ و جغرافیہ کی چھپوائی جائیں جن میں دکن کے حالات کا خصوصی لحاظ ہو تاکہ ان دو مضامین کی تعلیم کا جو اہم ترین مقصد ہے یعنی حب وطن اور حب قوم۔ وہ حاصل ہو۔

دوسری تحریک میں "یہ کانفرنس سرکار عالی سے استدعا کرتی ہے کہ وظائف رعایتی کے عطا کرنے میں ملازمین سررشتۂ تعلیمات کے بچوں کا خاص لحاظ فرمایا جائے۔ نیز سالانہ وظائف کی تعداد ملازمین سررشتہ تعلیمات کی تعداد کی مناسبت سے ہونا چاہئیے"۔ مدرسین کی مالی خستگی ادماغی محنت اور جز و معاشی اور جبری کثیر الاولادی کے مدنظر یہ استدعا بالکل حق بجانب ہے۔ یہ بڑی عاقبت اندیشی کی گئی کہ جو "مردہ بدست زندہ" تھے ان کو بھی شریک و سہیم بنالیا گیا اس اتحاد عمل سے یقین ہے کہ زندہ مدرسین کی دماغی و جسمانی اور مردوں کی روحانی کوششیں نخل مراد کو بار آور کریں گی۔

تیسری تحریک بھی ایک حق کا جائز مطالبہ ہے جس سے مدرسین محروم ہیں لیکن جو دلائل ثبوت استحقاق کے لئے پیش کئے گئے ہیں ان کی وجہ سے یہ تحریک ذرا دلچسپ ہوگئی ہے۔ اصل تحریک کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ کانفرنس سرکار عالی سے استدعا کرتی ہے کہ مدرسین کے لئے علاوہ موسمی تعطیلات سے مستفید ہونے کے مدت ملازمت میں کم از کم ایک دفعہ حج و زیارت مقامات مقدسہ یا تیرتھ جاترا کے لئے زیادہ سے زیادہ چار ماہ کی رخصت بیافت سالم ماہوار پیشگی بطور خاص عطا کی جائے۔" یہ تحریک معلمانہ ایثار کی موٹی مثال ہے۔ سرکار عالی تسلیم کرتی ہے کہ حج و زیارت کے لیے چھ ماہ درکار ہوں گے اور جبکہ ملازمین سرکار کو چھ ماہ کی رخصت خاص بیافت سالم دینے کے احکام ہیں۔ اس رعایت سے صرف مدرسین محروم ہیں۔ حالانکہ قصور اُن کا نہیں کہ وہ ایسے سررشتہ میں ملازم ہیں جہاں بقول مولوی محبوب الحسن صاحب وہ "موسمی تعطیل سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں" اس پر بھی انہوں نے ڈرتے ڈرتے صرف چار ماہ کی رخصت کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہ مدرسین کے پر لگے ہیں یا بعض طیران و طی الارض کے مشاق ہیں جو چھ ماہ کی مسافت کو چار ماہ میں طے کرلیں گے اور نہ اساتذہ ایسے برگزیدہ و خدارسیدہ ہیں کہ ان کے لئے سرزمین عراق و عرب کی طنابیں کھینچ لی جائیں گی۔ بنا برایں ہمیں سرکار عالی کی فیاضی و علم نوازی سے توقع ہے کہ معلمین کو وہی مراعات عطا کی جائیں گی جو دوسرے سررشتوں کے ملازمین کو حاصل ہیں۔ مدت سے قطع نظر، تحریک کا زیادہ دلچسپ حصہ تو وہ ہے جس میں حج و تیرتھ کے تاریخی و جغرافی فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ استدعا کو زوردار بنانے کے لئے "بیک کرشمہ دو کار" کی چاشنی دینے میں چنداں مضائقہ نہیں لیکن خوف یہ ہے کہ کہیں سرکار کو یہ خیال نہ ہو کہ مدرسین حج و زیارت کے بہانے سیر و تفریح کرتے پھرتے ہیں۔

تعلیم کنڈرگارٹن پر سجاد مرزا صاحب کا فاضلانہ لکچر نہایت سبق آموز تھا اور اُس "سروش عمل" کے نغمۂ دلنواز کی گونج تھا جو اپنے نورانی پروں کی ہوا سے تعلیم و تعلّم کے مردہ قالب میں نئی جان ڈال رہا ہے۔

دبیر صاحب کی تقریر آخری نشست کی سب سے زیادہ "ولولہ آور" و ولولہ انگیز تقریب تھی۔ موصوف کی خوش مزاجی، ظرافت طبعی اور جوش نے بزم معلمین پر پورا اثر ڈالا اور "جادو کیا" و پیر کی آنکھوں نے اشارہ کردیا" کہ صدر محترم و لیڈیاں محتشم، استاداں مفخم و "عطاریف غشمشم" سب کے سب دو تھی ہو کرنے اور ڈنڈ پیلنے لگے۔

آخر میں ہم کارکنان کانفرنس اور معتمد صاحب نمائش کو مبارک باد دیتے ہیں جن کی انتھک کوششوں سے کانفرنس کو قبول عام اور کامیابی نصیب ہوئی۔

خیر مقدم

از جناب احمد حسین خاں صاحب بی اے پرنسپل مدرسہ فوقانیہ دار العلوم بلدہ
(صدر استقبالیہ کمیٹی)

خواتین و حضرات! محترم و گرامی قدر صدر جلسہ اور دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کا خوشگوار فرض میرے ذمہ ہوا ہے لہذا انجمن اساتذہ کی جانب سے میں تمام حضرات کا اس تیسری سالانہ کانفرنس کی شرکت پر تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ نظام العمل کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس سال کی کانفرنس کے نظم و نسق میں خفیف سی مگر نہایت اہم تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ اس نئی تبدیلی کی جو حیدرآباد کے لئے نئی ہے لیکن ہندوستان کے دیگر حصص میں پہلے ہی سے عمل میں آچکی ہے ایک یا دو اہم امور کی بنا پر ضرورت لاحق ہوئی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ممالک محروسہ میں زمانہ حال سے کانفرنسوں کی تعداد مائل بہ ترقی نظر آرہی ہے گو یہ شگون نیک ہے جو حیدرآباد کی تعلیمی ضروریات کے متعلق پبلک کی بیداری کا پتہ دیتی ہے لیکن اپنے نظم و نسق کی نوعیت کے لحاظ سے یہ کانفرنسیں صرف تعلیم کے عام مسائل ہی کو مدنظر رکھ سکیں اور مسائل فن تعلیم کو نظر انداز کرنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ جو مسائل تعلیم کے عام نصب العین اور مالی و انتظامی حالت سے متعلق ہیں وہ ان اساتذہ کی دلچسپی کا باعث ہیں جو آج یہاں جمع ہیں لیکن بعض ایسے دیگر مسائل بھی ہیں جو مسائل مذکورۂ بالا کو بروئے کار لانے میں موثر ثابت ہوتے ہیں ان مسائل کا تعلق تعلیم کے فنی پہلو سے ہے۔ چونکہ اس فنی پہلو کے نظر انداز ہو جانے کا سخت اندیشہ تھا لہذا اس نقص کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ ایسی سب کمیٹیوں کا جن کا تعلق خالصتہً فن تعلیم کے مسائل سے ہو تقرر کیا جائے چنانچہ ان کمیٹیوں نے اپنے متعدد اجلاس منعقد کئے اور اب ان کی سعی و کوشش کے نتائج غور و خوض کی غرض سے مختصر رپورٹوں کی شکل میں آپ کے روبرو

پیش کئے جانے والے ہیں۔ اس تبدیلی کا دوسرا سبب وہ ضرورت ہے جو انجمن اساتذہ نے بجائے توسیع تحریکات کے ان کے استحکام کے متعلق محسوس کی ہے۔ حال میں تعلیم کی ترقی حیدرآباد میں اس سرعت کے ساتھ عمل میں آئی ہے کہ اگر ریاست ہذا مزید توسیع کے نظام العمل پر غور کرنے سے پہلے ہی پہلے استحکام کی جانب توجہ نہ کرے تو اس سے بہت ہی غیر اطمینان بخش نتائج ظہور پذیر ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اس بیان سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہو جائے اور چونکہ میں بہ نسبت تعلیم کی وسعت کے استحکام پر زیادہ زور دے رہا ہوں وہ یہ خیال کرنے لگیں کہ میری پالیسی تعلیمی ترقی کے منافی ہے لہذا میں اس امر کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ان اعداد و شمار کے دیکھنے سے جو اس ریاست ابد مدت کی تعلیم سے متعلق ہیں اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ تعلیم کی حالت اندیشہ ناک ہے اور ہر ایک قسم کی تعلیم میں ابھی بہت کچھ اضافہ کی ضرورت ہے۔ گو میں ان باتوں کو محسوس کرتا ہوں تاہم مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ کسی کام کو نااہلیت کے ساتھ اور نامکمل طریقے پر انجام دینے کے بجائے بہتر تو یہی ہے کہ اس کو کسی قدر مکمل طریقے پر انجام دیا جائے۔ لہذا میں اس امر کو شد و مد کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم توسیع کے خیال کو چھوڑ کر استحکام کی جانب توجہ کریں اور موجودہ حالات کا اندازہ اور عمارت تعلیم کے کمزور مقامات کا بغور معائنہ کر کے آگے قدم بڑھانے سے پہلے اصلاح نقائص کی تدابیر اختیار کریں۔ اس کو تائید غیبی سمجھنا چاہیئے کہ ایسے زمانے میں تعلیم کی باگ ڈور ہمارے نامی گرامی صدر جلسہ کے جیسے تجربہ کار ماہر تعلیم کے ہاتھ میں آئی ہے دوسرا حسن اتفاق یہ ہے کہ وہ پہلا اور اہم اجتماع جس کے بحث و مباحثہ کی سرکردگی کو آپ نے براہ مہربانی منظور فرمایا ہے ایک ایسی مجلس کا ہے جو انہی مسائل پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی ہے جن کا فیصلہ آپ ہی کی ذات پر منحصر ہے۔ مجھے اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ جناب صدر کی موجودگی ہمارے لئے باعث افتخار ہے اور ہم کو اس امر کا یقین ہے کہ ان مسائل میں جو ہماری جماعت اساتذہ سے متعلق ہیں صدر سررشتہ کی شرکت سے اگر کچھ ہوگا تو فائدہ ہی ہوگا۔

گذشتہ کانفرنسوں میں آپ انجمن کی تاریخ، مقاصد اور کام کے متعلق سن چکے ہیں اور اب اس کے بعد سال گذشتہ کی کارگزاری معتمد صاحب عمومی آپ کے روبرو پیش کریں گے۔ لہذا میں صرف چند اُن ضروری اور مقامی مسائل کے ذکر پر اکتفا کروں گا جو تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہر طرف ابتدائی جبری تعلیم کے متعلق صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے۔ اگرچہ گذشتہ دس سال کے دوران میں تحتانیہ مدارس میں پڑھنے والوں کی تعداد (۶۷۰۰۰) سے تخمیناً ڈھائی لاکھ تک پہونچ چکی ہے تاہم مدرسہ جانے کے قابل بچوں کی جملہ آبادی میں سے تقریباً بارہ فیصدی آبادی زیر تعلیم ہے۔ برٹش انڈیا میں خواندہ لوگوں کی تعداد بڑھانے کے لئے ہر صوبہ یکے بعد دیگرے جبری تعلیم کو اختیار کر رہا ہے اگر یہاں بھی جلد سے جلد اس کی ابتدا نہ کی جائے تو ہم تعلیم میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ ہماری گورنمنٹ نے بھی جبری تعلیم کے اصول کو منظور کر لیا ہے اور مجھے اس کا بھی علم ہے کہ عنقریب یہ مسئلہ عملی صورت بھی اختیار کرے گا۔ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے۔ لیکن اس مسئلے کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے یعنے جس طرز کے مدارس آج کل موجود ہیں ان میں اضافہ کرنا بے سود ہے اس اجمال کی تفصیل یوں ہوسکتی ہے کہ جبری تعلیم کو وسیع پیمانے پر رائج کرنے سے پہلے شہری اور دیہی مدارس کی حالت میں اصلاح کرنی ضروری ہے۔ خصوصاً مدارس دیہی کے متعلق میں مندرجہ ذیل ضروریات کو نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔

(۱) دیہی مدارس کے نصاب تعلیم کو دیہاتی ضروریات کے مطابق بنانا (۲) بہتر مدرسین کا انتخاب کرنا اور ان کو اس خیال سے زیادہ وسیع پیمانے پر تربیت دینا کہ وہ اُس قسم کی دیہاتی تعلیم کے کام کو بخوبی انجام دینے کے قابل بن سکیں جو پنجاب کے بعض حصوں میں انجام دیا جا رہا ہے (۳) بہتر عمارت مدرسہ کی تعمیر (۴) باغات اور مزارع کا مہیا کرنا۔ (۵) جہاں جہاں تنخواہوں میں کمی پائی جاتی ہے وہاں معتد بہ اضافہ کرنا۔

ثانوی تعلیم کے میدان میں استحکام کی زیادہ گنجائش ہے۔ ثانوی تعلیم کی نہایت

فوری ضروریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہتر عمارات اور بازی گاہوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے جب تک ان کے لئے کافی رقم نہ مہیا ہو مدارس کے بچوں کی صحت اور جسمانی حالت میں خاطر خواہ ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی۔ معائنہ طبی کی ضرورت پر انجمن پہلے ہی زور دے چکی ہے اس کا نتیجہ جلد یا بہ دیر ظاہر ہو کر رہے گا لیکن اگر معائنہ طبی بغیر بہتر عمارات اور کافی بازی گاہوں کے شروع کر دیا جائے تو اس سے بھی اُن دونوں کی ضرورت نمایاں طور پر ظاہر ہو جائے گی۔ نصاب تعلیم اور پڑھائی کے کورس میں اصلاح کرنے اور پیشوں کی تعلیم کو رواج دینے کا مسئلہ پہلے ہی سے زیر غور ہے۔ یہاں ان پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی صرف یہ بتلا دینا کافی ہے کہ کفایت شعاری کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسا طریقہ نکالا جائے کہ میٹرک اور اسکول لیونگ کے نصاب کی موجودہ دوعملی دور ہو جائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جب مذکورۂ بالا اصلاحات عمل میں لائی جائیں گی تو میٹرک کے نتائج اب تک جیسے رہے ہیں ان سے بہتر صورت میں رونما ہوں گے؟ سال بہ سال سینکڑوں لڑکے اس امتحان میں شریک ہوتے ہیں مگر کامیاب طلبہ کی تعداد ۴۰ فیصد سے آگے بڑھنے نہیں پاتی۔ ناکامیابی کے آخر وجوہ کیا ہیں؟ ان وجوہ میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ اختتام کورس کی مدت مڈل سے لے کر میٹرک تک نسبتاً اسکول لیونگ سے کم رکھی گئی ہے۔ لیکن ناکامیابوں کی اس تعداد کثیر کی اصلی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مدارس فوقانیہ عثمانیہ میں کئی مدارس ایسے ہیں جہاں کافی اور قابل اسٹاف کا فقدان ہے کوئی ترقی اسوقت تک رونما نہ ہو گی جب تک گراجویٹوں کی تعداد میں اضافہ نہ کیا جائے۔ صرف یہی وجوہ نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں۔ جس قسم کے لوگ تاریخ وجغرافیہ اور انگریزی کی تعلیم کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں بجز چند مستثنیٰ اشخاص کے سب ان مضامین کے پڑھانے کی جیسی چاہیئے ویسی اہلیت نہیں رکھتے۔ مدرسین کا بلا امتیاز انتخاب اس وقت قابل درگزر ہو سکتا ہے جبکہ لائق اشخاص کافی تعداد میں نہ مل سکتے ہوں۔ موجودہ زمانے میں ایسے مدرسین مقرر کئے جائیں جو اچھی ڈگریاں رکھتے ہوں اور دیگر امور کے

لحاظ سے بھی قابل متصور ہوں ۔ جغرافیہ پڑھانے والے مدرسین کے لئے صرف یہی باتیں کافی نہیں ہیں بلکہ جب تک یونیورسٹی جغرافیہ کی تعلیم کو داخل نصاب نہ کرے مدارس میں اس مضمون کے پڑھانے کا معیار گھٹا ہوا ہی رہے گا۔

دوسری اصلاح جس کی شدید ضرورت سمجھی جارہی ہے وہ اوقات مدارس اور تعطیلات سے متعلق ہے مسئلۂ اول الذکر یعنے موجودہ اوقات میں تبدیلی کے متعلق گذشتہ سال تحریک منظور ہو چکی ہے ۔ اثنائے گفتگو میں نواب مسعود جنگ بہادر سابق ناظم تعلیمات نے بھی اس مجوزہ تبدیلی کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار کیا تھا بہرحال یہ تحریک محکمۂ صدر میں پیش کی گئی جس کا انجمن کو یہ جواب ملا کہ جب تک اس معاملے میں اتحاد آرا نہ ہوگا تبدیلی مناسب نہیں معلوم ہوتی اس جواب سے انجمن کی حوصلہ شکنی نہیں ہوئی ہے بلکہ یہ مسئلہ پھر ایک دفعہ پیش کیا جائے گا ۔ یہاں میں مودبانہ ناظم صاحب بہادر کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کراتا ہوں کہ اس معاملے پر غور مکرر کیا جائے ۔ کئی مدارس اس تبدیلی کے متوقع ہیں اور اس کو بخوشی قبول کرلیں گے چند ہی اشخاص ایسے ہوں گے جن کو اس خصوص میں اعتراض ہوگا لیکن تعلیم و ورزش جسمانی کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے میں اُمید کرتا ہوں کہ اس نارضامندی کو نظر انداز کر دیا جائے گا ۔

مسئلۂ تعطیلات کے بارے میں پہلے یہ تجویز ہوئی تھی کہ کانفرنس میں ایک تحریک سررشتہ سے اس قسم کی درخواست کے متعلق منظور کی جائے کہ وہ ایک باقاعدہ جماعت بحیثیت نمائندہ موجودہ تعطیلات کی فہرست پر نظر ثانی اور غور کرنے کے لئے مقرر کرے جس کا کام یہ ہوگا کہ وہ نظر ثانی کرنے کے بعد اس فہرست کو بتوسط ناظم صاحب تعلیمات اس کمیٹی کے روبرو پیش کرے جو گورنمنٹ کی جانب سے اسی غرض کے لئے مقرر کی گئی تھی ۔ لیکن بعد میں جب ہم کو معلوم ہوا کہ کمیٹی مذکور نے اس سے پہلے ہی اپنا کام ختم کرکے گورنمنٹ کو نتیجہ کارروائی سے مطلع کر دیا ہے تو ہم نے تحریک مذکورۂ بالا کو بعد از وقت خیال کرکے اس معاملے کو یوں ہی چھوڑ دیا ۔ چونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہمارے فرائض کی بجاآوری پر اثر پڑتا ہے لہذا اگر میں اس کا ذکر کردوں تو

قابل معافی تصور کیا جائے گا مبادا یہاں بعض حضرات کو یہ خوف ہو کہ میں تعطیلات کی جملہ تعداد میں اضافہ کی تجویز پیش کرنے والا ہوں لہذا میں پہلے ان کے خوف کو یہ کہکر دور کرنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ میری تجویز ہے وہ تعداد تعطیلات میں کسی قسم کے اضافہ کے متعلق نہیں بلکہ محض ان کی مکرر تقسیم کے متعلق ہے۔ دیگر محکمہ جات کے ملازمین یہ خیال کرتے ہیں کہ پڑھانا بہت ہی آسان کام ہے اور اساتذہ کو بہت سی تعطیلات ملتی ہیں میں اپنا وقت ان حضرات کے اس خیال کو دور کرنے میں ضائع کرنا نہیں چاہتا میرا روئے سخن صرف ماہرین نفسیات و تعلیم کی جانب ہے یہی لوگ جانتے ہیں کہ کوئی کام سوائے درس و تدریس کی محنت شاقہ کے ایسا نہیں جو قوت اعصابی و دماغی پر سنگین اثر ڈالتا ہو۔ آپ کس طرح متدین اور فرض شناس مدرسین سے اس امر کی توقع کرتے ہیں کہ وہ دنوں اور مہینوں صرف ہفتہ میں ایک ہی دن کے وقفہ سے کام کئے چلے جائیں اور پھر بھی ان کے جوش اور سرگرمی میں فرق نہ آئے ہم کو تجربہ سے یہ امر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ جب صورت حال اس قسم کی ہو تو کیا یہ مطالبہ کچھ بیجا ہوگا کہ ہفتہ میں صرف پانچ ہی یوم کام کے رکھے جائیں اور اس میں شرط یہ ہو کہ اگر کسی ہفتہ میں کوئی تعطیل واقع ہو جائے تو وہ دن جو زائد تعطیل کا ملتا ہے حذف کر دیا جائے مزید بر ان کئی تعطیلات میں بھی جو مذہبی وجوہ پر مبنی ہیں کاٹ چھانٹ ہو سکتی ہے ان اشخاص نے جن کی مذہبی راسخ الاعتقادی پر کوئی اعتراض عائد نہیں ہو سکتا مجھ سے بالمشافہ کہا کہ ان میں بعض تعطیلات ایسی ہیں جو حذف کی جا سکتی ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو مدارس ثانویہ میں گرما کی تعطیل دو ماہ کی ہو سکتی ہے اگر یہ تعطیل زیادہ تصور کی جاتی ہے تو گرما میں ڈیڑھ ماہ اور سرما میں دس یوم کی تعطیل کا انتظام کیا جائے۔ اسی سلسلے میں آپ کی توجہ اس خصوص کی جانب بھی منعطف کرائی جاتی ہے کہ حسب عملدرآمد سابق سالانہ امتحانات موسم سرما میں منعقد کئے جائیں۔ موجودہ عملدرآمد نہ اساتذہ کے لئے سہولت بخش ہے نہ ممتحنین کو اس سے آسائش مل سکتی ہے اور نہ طلبہ ہی کے لئے خوشگوار ہے۔

چونکہ یہ کانفرنس زیادہ تر تحتانیہ اور ثانویہ مدارس کے اساتذہ سے متعلق ہے

میں یونیورسٹی کی تعلیم سے عمداً قطع نظر کرتا ہوں اور صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اگر تحتانیہ اور ثانویہ تعلیم میں زیادہ روپیہ نہ صرف کیا جائے تو خود یونیورسٹی کو طلبہ کا اچھا ذخیرہ ہاتھ نہیں آسکتا جس کی اپنے آپ کو کامیاب ثابت کرنے کے لئے اس کو سخت ضرورت ہے
میں نے اب تک آپ حضرات کے روبرو تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کیا ہے
بہر حال میں آپ کو یہ یقین نہیں دلانا چاہتا کہ طبقہ معلمین مظلوم اور لغزشوں سے بالکل پاک ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان میں ایسے افراد موجود ہیں جو دنیا کے کسی حصہ میں بھی پیشۂ تعلیم کے لئے مایۂ ناز سمجھے جائیں گے۔ یہ مستثنیٰ صورتیں ہیں۔ بالعموم مدرسین اتنا کام کر لینا کافی سمجھتے ہیں کہ گرفت سے بچے رہیں۔ جس ملک میں تعلیم عام ہے وہاں بھی یہ طرز عمل نازیبا ہے لیکن ہندوستان میں تو یہ جرم ہے۔ جب تک کہ اساتذہ اپنے آپ کو سرکار کا بندۂ دام نہ سمجھیں بلکہ یہ بھی خیال کریں کہ وہ بنی نوع انسان کی خدمت بجا لانے والی فوج کے سپاہی ہیں اور جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے مفوضہ کار تعلیمی کے علاوہ دوسری ذمہ داریاں بھی اپنے سر نہ لیں اس وقت تک اس ملک کی تعلیم کا مستقبل کبھی اُمید افزا نہیں ہو سکتا۔ با ایں ہمہ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کے راستہ سے رکاوٹیں دور کر دی جائیں اور ان کو محکمہ صدر سے اشارہ ملے تو مدرسین کی کثیر تعداد صف آرا ہو جائے گی۔ انجمن کو جناب صدر سے اسی اشارہ کی توقع ہے۔ اس یقین سے پُر کیف ہو کر ہم جناب ممدوح کا اور بھی فراخ دلی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

مترجمہ
اللہ بخش صاحب بی اے بی ٹی

رپورٹ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ

بابتہ سال مختتمہ امرداد ۳۸ف

حضرات۔

خدا کا شکر ہے کہ انجمن نے اپنی عمر کے ساڑھے چار سال پورے کر لئے اور اب ہم اس تیسری سالانہ کانفرنس میں جمع ہوئے ہیں جس کی کارروائی سابقہ دو کانفرنسوں کے مقابلے میں زیادہ مفید اور کار آمد طریقے پر انجام پا رہی ہے کیوں کہ اوایل ماہ خورداد ۳۸ف سے ہی مضامین زیر بحث میں سے پانچ اہم مضامین ایک ایک سب کمیٹی کے تفویض کئے گئے ہیں اور اس طرح ہر ایک سب کمیٹی کو مضمون متعلقہ کے ہر ایک علمی پہلو پر تفصیل سے بحث کر کے عمدہ اور مفید نتیجہ نکالنے کا کافی موقع ملا ہے۔

شاخ ہائے انجمن سال زیر رپورٹ میں انجمن ہٰذا کی شاخیں حسب سابق (۱۴) ہی رہیں۔ البتہ پرنسپل صاحب مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادرگھاٹ کی تحریک پر شاخ مذکور کو گرامر اسکول میں منتقل کیا گیا ہے کیونکہ مدرسہ چادرگھاٹ میں سر دست کوئی بڑا کمرہ ایسا نہیں جہاں انجمن کے ماہانہ جلسے سہولت سے منعقد ہو سکیں۔

ارکین انجمن انجمن ہٰذا کی رکنیت چونکہ حسب قواعد منظورہ سرکار مدرسین مدارس تحت دفتر صدر مہتممی تعلیمات مستقر بلدہ کے لئے لازمی ہے اس لئے تعداد اراکین میں کوئی کمی نہیں ہوئی مگر ساتھ ہی دوسرے اراکین کی تعداد سال زیر رپورٹ میں (۲۰) سے بڑھ کر (۳۴) ہو گئی ہے۔ جن کا تعلق دفتر صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے نہیں ہے

مرکزی انتظامی کمیٹی کے جلسے سال زیر رپورٹ میں مرکزی انتظامی کمیٹی کے (۵) جلسے منعقد ہوئے جن میں حسب قواعد انجمن ہر سہ ماہی کے لئے پہلے سے ماہانہ جلسوں کا پروگرام مرتب کرنے کے علاوہ ترتیب موازنہ و انتخاب

عہدہ داران سنہ رواں و تقرر تنقیح کنند گان حسابات انجمن اور انتظامات کانفرنس ہذا کی کارروائی ہوئی۔

کمیٹی مذکور نے کانفرنس کے انتظام کے لئے ایک کانفرنس کمیٹی بھی قایم کی جس نے بغرض سہولت اجرائی کار پروگرام سب کمیٹی۔ نمایش سب کمیٹی اور استقبالیہ کمیٹی مقرر کی یہ اس کا نتیجہ ہے کہ اس وقت کام باقاعدہ ہو رہا ہے۔

معمولی ماہانہ جلسے زمانہ زیر رپورٹ میں ہر مرکز میں ماہانہ جلسے (۶) منعقد ہوئے جہاں مضامین مندرجہ ذیل پر بحث وغیرہ ہوئی۔

(۱) کمزور طلبہ کا مسئلہ (۲) السنہ میں مضمون نویسی کی تعلیم معہ سبق نمونہ۔ (۳) تحتانیہ جماعتوں کی مدت تعلیم کو بجائے پانچ سال کے چار سال کرنے کے امکان کا سوال۔ (۴) تحتانیہ و وسطانیہ جماعتوں میں تاریخ و جغرافیہ کے نصاب میں اصلاح کی ضرورت اور اس کی نوعیت۔ (۵) مدرسہ کے اندرونی امتحانات (۶) مدارس موجودہ میں پیشوں کی تعلیم کے اجرا کا امکان اور مختلف طبقوں میں تعلیم مذکور کی نوعیت۔

ان تمام جلسوں کی کارروائیوں میں سے خاص خاص امور افسوس ہے کہ رسالہ میں شائع نہ ہو سکے کیونکہ مختلف مرکزوں سے بروقت رسالہ کے دفتر میں مواد وصول نہیں ہوا آیندہ اُمید ہے کہ بروقت رپورٹیں وصول ہونے پر مثل سابق رسالہ میں شائع ہوا کریں گی۔

طبقہ تحتانیہ کی مدت تعلیم میں تخفیف کے مندرجہ بالا مسئلے پر جو آرا، وصول ہوئی ہیں وہ ابھی مرکزی انتظامی کمیٹی کے زیر غور ہیں البتہ اصلاح نصاب تاریخ جغرافیہ کے متذکرہ صدر سوال پر بحث سے جو نتیجہ نکلا اس کا ملخص جناب گنیش چند صاحب بی اے بی۔ ٹی مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ اپنی تحریک پیش کرتے وقت بیان فرمائیں گے۔

عام جلسہ سال زیر رپورٹ میں حسب ذیل تین عام جلسے منعقد ہوئے۔

(۱) سینٹ جارجز گرامر اسکول میں بصدارت عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے (کینٹب) جلسہ عام میں جناب ڈاکٹر ہیرلڈمین صاحب مشیر زراعت سرکار عالی نے

۱۳۳۵ف (۴) امتحانات عثمانیہ میٹرک۔ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ و مڈل میں ممتحنین و مبصرین میں مدرسین کو شریک کرنے کے مسئلہ پر بھی صدر دفتر نظامت عالیہ تعلیمات نے دفاتر متعلقہ کو لکھا ہے۔

〃 (۵) امتحان مڈل کی ہر زبان زائد دوم کے نصاب کے مساوی ہونے کا مسئلہ محکمۂ صدر دفتر نظامت تعلیمات کے صیغۂ متعلقہ کے زیر غور ہے۔

۱۳۳۶ف (۱) تحریک مساوات امتحانات عثمانیہ میٹرک و ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے متعلق جامعہ عثمانیہ میں کارروائی پیش ہے اور سُنا گیا ہے کہ اس قسم کا نصاب مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر ہو چکی ہے۔

〃 (۲) تبدیل اوقات مدارس کی تحریک پر صدر سے جواب ملا ہے کہ اس تحریک کی عام تائید کی ضرورت ہے۔

〃 (۳) مدارس امدادی میں قیام پراویڈنٹ فنڈ کو بھی اجرائی امداد کی ایک شرط قرار دینے کی تحریک (خدا کا شکر) بارآور ہوئی چنانچہ صدر دفتر نظامت عالیہ تعلیمات نے مختلف علاقہ جات ہند کے قواعد متعلقہ پراویڈنٹ فنڈ کے ملاحظہ کے بعد اس بارہ میں ایک لائحہ عمل بنانے کی جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات مستقر بلدہ سے خواہش کی ہے۔

〃 (۴) عثمانیہ میٹرک اور ہائی اسکول سرٹیفکٹ کے امتحانات میں سائنس کو امتحان کے لئے لازمی مضمون قرار دینے کی تحریک پر بھی محکمہ جات متعلقہ غور کر رہے ہیں۔

انجمن کی مالی حالت انجمن ہذا کے حسابات ۱۳۳۶ف کی تنقیح جناب مولوی محمد یوسف صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم و جناب مولوی سید غلام محمود صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل نے فرمائی۔

حسابات سے ظاہر ہوا کہ ۱۳۳۶ف میں کچھ اوپر ایک ہزار روپیہ سکہ عثمانیہ چندہ وصول ہوا اور امداد رسالہ (مالہ ۳۰۰) ۔ الونس وصادر وغیرہ (مالہ ۱۵۰) ۔ اور مصارف کانفرنس و نمائش (سار)

سفر خرچ نمایندگان آل انڈیا کانفرنس۔ جملہ (الہ عہ) سکہ عثمانیہ کا صرفہ ہوا۔ اور اس طرح ختم آبان ۳۳۶ف کو بشمول (مال لعہ) سلک ۳۳۶ف جملہ مبلغ (سماعہ) سکہ عثمانیہ خزانہ انجمن میں موجود تھے اس سال مصارف میں بمقابلہ آمدنی خفیف سا اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ نمایندگاں آل انڈیا ٹیچرس کانفرنس کے سفر خرچ کی بابتہ سرکار سے امداد ابھی وصول نہیں ہوئی۔

حضرات۔ رسالہ انجمن نے اپنے حالیہ نمبر کی اشاعت کے ساتھ اپنی عمر کا تیرا سال پورا کرلیا ہے مگر اس کی مالی حالت ضرور آپ حضرات کی خاص توجہ کی محتاج ہے کیونکہ سوائے مدارس بلدہ و اطراف بلدہ اور مدارس وسطانیہ و فوقانیہ و ناظر صاحبان اضلاع کے جہاں رسالے سرکاری طور پر جاتے ہیں اراکین انجمن نے ذاتی طور پر اس کی خریداری کی طرف ابھی کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی آمدنی بشمول امداد انجمن اس کے مصارف کے لئے بمشکل کافی ہورہی ہے۔ البتہ جناب صدر مہتمم صاحبان صوبہ گلبرگہ شریف و صوبہ اورنگ آباد کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے کہ انہوں نے اپنے علاقے کے مدارس تحتانیہ کے لئے رسالہ کے اُردو حصے کی خریداری فرمائی ہے جس سے ایک حد تک رسالہ کی امداد ہوئی ہے۔ اور یہ اُردو حصہ صرف انہیں حضرات یعنے مولوی سجاد مرزا صاحب و مولوی ظہور علی صاحب کی تحریک پر اسفندار ۳۳۸ف سے علحدہ شائع کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اگر صوبہ ورنگل و صوبہ میدک کے مدارس تحتانیہ کے لئے بھی رسالہ کا حصہ اُردو جس کا سالانہ چندہ (عہ) رکھا گیا ہے خریدنے کی طرف افسران متعلقہ توجہ فرمائیں تو اس مفید تعلیمی رسالہ کی بہت کچھ مدد ہوسکتی ہے۔

حضرات۔ اب میرا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ میں اراکین انجمن کی جانب سے عالیجناب خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے اس انجمن کی سرپرستی قبول فرماکر مدرسین بلدہ کی عزت افزائی فرمائی ہے اور باوجود کثرت مشاغل اس کانفرنس کی صدارت کی زحمت گوارا فرماکر انجمن ہذا سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے

حضرات۔ اب میں اس دعا کے بعد اپنی رپورٹ کو ختم کرتا ہوں کہ

۱۳۳۵ف (۴) امتحانات عثمانیہ میٹرک۔ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ و مڈل میں ممتحنین و مبصرین میں مدرسین کو شریک کرنے کے مسئلہ پر بھی صدر دفتر نظامت عالیہ تعلیمات نے دفاتر متعلقہ کو لکھا ہے۔

" (۵) امتحان مڈل کی ہر زبان زائد دوم کے نصاب کے مساوی ہونے کا مسئلہ محکمۂ صدر دفتر نظامت تعلیمات کے صیغہ متعلقہ کے زیر غور ہے۔

۱۳۳۶ف (۱) تحریک مساوات امتحانات عثمانیہ میٹرک و ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے متعلق جامعہ عثمانیہ میں کارروائی پیش ہے اور سنا گیا ہے کہ اس قسم کا نصاب مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر ہو چکی ہے۔

" (۲) تبدیل اوقات مدارس کی تحریک پر صدر سے جواب ملا ہے کہ اس تحریک کی عام تائید کی ضرورت ہے۔

" (۳) مدارس امدادی میں قیام پراویڈنٹ فنڈ کو بھی اجرائی امداد کی ایک شرط قرار دینے کی تحریک (خدا کا شکر) بار آور ہوئی چنانچہ صدر دفتر نظامت عالیہ تعلیمات نے مختلف علاقہ جات ہند کے قواعد متعلقہ پراویڈنٹ فنڈ کے ملاحظہ کے بعد اس بارہ میں ایک لائحہ عمل بنانے کی جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات مستقر بلدہ سے خواہش کی ہے۔

" (۴) عثمانیہ میٹرک اور ہائی اسکول سرٹیفکٹ کے امتحانات میں سائنس کو امتحان کے لئے لازمی مضمون قرار دینے کی تحریک پر بھی محکمہ جات متعلقہ غور کر رہے ہیں۔

انجمن کی مالی حالت

انجمن ہذا کے حسابات ۱۳۳۷ف کی تنقیح جناب مولوی محمد یوسف صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم و جناب مولوی سید غلام محمود صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل نے فرمائی۔

حسابات سے ظاہر ہوا کہ ۱۳۳۷ف میں کچھ اوپر ایک ہزار روپیہ سکہ عثمانیہ چندہ وصول ہوا اور امداد رسالہ۔ الونس وصادر وغیرہ۔ اور مصارف کانفرنس و نمائش
(مالہ ۵) (مالہ ۵۹) (سالہ)

سفر خرچ نمایندگان آل انڈیا کانفرنس۔ جملہ (الـ ۱۳ ؎) سکہ عثمانیہ کا صرفہ ہوا۔ اور اس طرح ختم آبان ۳۷ ف ۱۳۳۶ ف کو بشمول سلک (مالیہ) جملہ مبلغ (۱۳ ؎) سکہ عثمانیہ خزانہ انجمن میں موجود تھے اس سال مصارف میں بمقابلہ آمدنی خفیف سا اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ نمایندگان آل انڈیا ٹیچرس کانفرنس کے سفر خرچ کی بابتہ سرکار سے امداد ابھی وصول نہیں ہوئی۔

حضرات۔ رسالہ انجمن نے اپنے حالیہ نمبر کی اشاعت کے ساتھ اپنی عمر کا تیسرا سال پورا کر لیا ہے مگر اس کی مالی حالت ضرور آپ حضرات کی خاص توجہ کی محتاج ہے کیونکہ سوائے مدارس بلدہ و اطراف بلدہ اور مدارس وسطانیہ و فوقانیہ و ناظم صاحبان اضلاع کے جہاں رسالے سرکاری طور پر جاتے ہیں ارا کین انجمن نے ذاتی طور پر اس کی خریداری کی طرف ابھی کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی آمدنی بشمول امداد انجمن اس کے مصارف کے لئے بمشکل کافی ہو رہی ہے۔ البتہ جناب صدر مہتمم صاحبان صوبہ گلبرگہ شریف و صوبہ اورنگ آباد کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے کہ انہوں نے اپنے علاقے کے مدارس تحتانیہ کے لئے رسالہ کے اردو حصے کی خریداری فرمائی ہے جس سے ایک حد تک رسالہ کی امداد ہوئی ہے۔ اور یہ اردو حصہ صرف انہیں حضرات یعنی مولوی سجاد مرزا صاحب و مولوی ظہور علی صاحب کی تحریک پر اسفندار ۳۸ ف سے علحدہ شائع کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اگر صوبہ ورنگل و صوبہ میدک کے مدارس تحتانیہ کے لئے بھی رسالہ کا حصہ اردو جس کا سالانہ چندہ (۱۲ ؎) رکھا گیا ہے خریدنے کی طرف افسران متعلقہ توجہ فرمائیں تو اس مفید تعلیمی رسالہ کی بہت کچھ مدد ہو سکتی ہے۔

حضرات۔ اب میرا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ میں ارا کین انجمن کی جانب سے عالیجناب خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے اس انجمن کی سرپرستی قبول فرما کر مدرسین بلدہ کی عزت افزائی فرمائی ہے اور باوجود کثرت مشاغل اس کانفرنس کی صدارت کی زحمت گوارا فرما کر انجمن ہذا سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے

حضرات۔ اب میں اس دعا کے بعد اپنی رپورٹ کو ختم کرتا ہوں کہ

حضور بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی کا سایہ ہمارے سر پر مدت مدید تک قائم رہے اور یہ انجمن ایک عرصہ دراز تک ملک کی مفید خدمات تعلیمی انجام دیتی رہے۔

سید محمد شریف مشہدی معتمد عمومی

خطبۂ صدارت

عالیجناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔ اے (رینگلر) ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

میں انجمن اساتذہ کا بیحد شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھ سے اپنے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے خواہش ظاہر کی۔ اس اہم کام میں شریک ہونے سے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ سالانہ روداد جو ہم نے سُنی اُس سے انجمن کا بہت کچھ ترقی کرنا ظاہر ہوتا ہے۔ انجمن کے تمام عہدہ دار اور عُمّال اس کامیابی پر ہمارے دلی مُبارکباد کے مستحق ہیں۔

انجمن اپنی سرگرمیوں کے عملی پہلو کو ترقی دے۔

اس کانفرنس کا لائحہ عمل ہمیں اس سے مطمئن کر دیتا ہے کہ انجمن نے عملی طور پر کام شروع کر دیا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ انجمن کی سرگرمیاں جو تعلیمی طریقوں کی اصلاح کی غرض سے عمل میں لائی گئی ہیں وہ بالعموم اساتذہ کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ میں اس بات سے خوش ہوں کہ انجمن شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ مختلف مضامین خصوصاً فنی تعلیم اور جسمانی تربیت کے لئے ذیلی کمیٹیوں کا تقرر ظاہر کرتا ہے کہ انجمن ملکی ضروریات سے باخبر ہے۔ یہ امر میرے لئے حقیقی مسرت کا باعث ہے کہ انجمن پُرخلوص طریقہ کے ساتھ حقیقی معنوں میں کام کر رہی ہے اور "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق نہیں ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ انجمن کی یہ سرگرمیاں عملی طریقہ کے ساتھ جاری رہیں گی اور انہیں آئندہ اور مستعدی کے ساتھ نمایاں کیا جائے گا۔

حیدرآباد اداے فریضہ کا طالب ہے

حیدرآباد ٹیچرز اور انجمن اساتذہ دونوں بہت بڑے نام ہیں۔ بڑے نام کے ساتھ ہمیشہ بڑی بڑی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں

اور اُن سے بہت بڑی توقعات بھی وابستہ ہوتی ہیں؛ اس لیے ہمیں فطرۃً مہتم بالشان کام کی توقع رکھنی چاہیئے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حیدرآباد کے اساتذہ سے کس قسم کی توقع وابستہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس کا معقول جواب یہی ہے کہ حیدرآباد کے اساتذہ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پڑھائیں گے۔ یہ بالکل درست ہے مگر تعلیم و تدریس ایک وسیع مضمون ہے اور اُس کے نظریئے بھی مختلف ہیں جس کا جواب میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دینا چاہتا ہوں ساتھ ہی وہ تمام توقعات جو ان بڑے ناموں کے باعث مجھ میں پیدا ہو گئے ہیں وہ تمام کے تمام میرے پیش نظر ہیں۔ میرا جواب نہایت آسان ہے وہ یہ ہے کہ حیدرآباد متوقع ہے کہ ہر استاد اپنا فریضہ ادا کرے آپ کو یاد ہو گا کہ ایسے الفاظ دو مختلف قسم کے تاریخی موقعوں پر نفسیاتی لمحات میں استعمال کیئے جا چکے ہیں۔ لیکن، یہ الفاظ ایسے سادہ اور دل کو اپنی طرف مائل کرنے والے ہیں کہ انہیں ہر موقع پر، جہاں بہترین انسانی جد و جہد کی ضرورت ہو، استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم و تدریس اہم ترین کام ہے

دنیا کے کسی کام میں، اگر بہترین انسانی کوشش کی ضرورت ہے تو وہ تعلیم و تدریس ہے۔ کوئی قوم، جتنی زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ہو گی، اُسی قدر زیادہ توجہ تعلیم اور معلم پر کی جائے گی حقیقت یہ ہے کہ جس نوعیت کی توجہ جس قوم کی جانب سے تعلیم پر دی جائے گی اُسی سے صحیح اندازہ اس کی ترقی کا ہو گا اور اُسی سے اُس قوم کی جگہ اقوام عالم میں متعین ہو گی۔ اس لئے تعلیم و تدریس کا کام بنی نوع انسان کے لئے اہم ہے۔

کیا ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کیا اور اس کے نتائج کیا ہیں؟

یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ کسی بڑے کام میں اپنے فریضہ کی ادا بہت مشکل ہے، انسانی جد و جہد کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ اسی کے نتائج سے کیا جاتا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے، اگر میں آپ کی تعلیم کے نتائج پیش کروں اور آپ ہی سے فیصلہ کی خواہش کروں کہ ہمیں ادائے فرائض

میں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی! میں عیب جوئی کے خیال سے آپ کے کام کی تنقیح نہیں کر رہا ہوں مگر ہم مدرسین کو چاہیئے کہ اپنے معائب کو خوشی کے ساتھ سنیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ میں بھی تو آپ ہی میں سے ہوں مجھے آپ اس امر کی اجازت دیں گے کہ میں لمحہ بھر کے لئے اپنی تعلیم کے نتائج پوچھوں ہم اپنی درس گاہوں سے ایسے نوجوانوں کو دنیا میں بھیجتے ہیں جو مختلف تعلیمی صفات سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان نوجوانوں کا تعلیم کے متعلق کیا زاویہ نگاہ ہے؟ اُن کے اولیا کا تعلیم دلانے سے کیا مقصد ہے؟ عام طور پر تعلیم کے متعلق پبلک کے کیا خیالات ہیں؟ ہم سب جانتے ہیں کہ تعلیم کے متعلق محض ایک خیال ہر ایک کے دل میں جاری اور ساری ہے اور تقریباً تمام کا ایک ہی مطمح نظر ہے وہ یہ کہ کوئی جگہ علمی پیشوں یا فوجی جائدادوں میں عام اس سے کہ خانگی ہو یا سرکاری، حاصل کی جائے۔ یہ ہماری تعلیم کا اول و آخر ہے۔

ہماری تعلیم کی اقتصادی اہمیت

اقتصادی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہمیں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی؟ ایک متوسط ذہن کے لڑکے کو میٹرک کامیاب کرنے میں گیارہ سال لگتے ہیں۔ اس طویل المدۃ تربیت کے بعد وہ کس قدر روزی کما سکتا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اگر وہ خوش قسمت ہے (سہ سے) کی اہل کاری حاصل کر سکتا ہے جس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ گیارہ سالہ تربیت کے بعد اس قابل ہوا کہ یومیہ ایک روپیہ کما سکے اور بیس سالہ ملازمت یعنے ۳۱ سال کی عمر اور تجربہ کے بعد وہ روزانہ دو روپیہ کما سکے گا آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس قدر ایک معمولی مزدور تھوڑے سے تجربہ کے بعد کما سکتا ہے۔ ہماری درس گاہوں کی پیداوار کی یہ اقتصادی قدر و قیمت ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں ایک طیلسانی بھی (عہ) ماہوار پر دستیاب ہوسکتا ہے۔ بہر حال اقتصادی نقطہ نظر سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم کامیاب رہے۔

جسمانی حیثیت سے ہماری تعلیم کے نتائج۔

جسمانی نقطہ نظر سے بھی ہماری کامیابی کچھ زیادہ نہیں رہی کیا ہم جسمانی تربیت پر کافی توجہ دے رہے ہیں؟

ہماری تمام تر توجہ درسی کتب پر صرف نہیں کی جارہی ہے اور طلبہ کے جسم کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا ہے؟ عام طور پر مدارس میں جسمانی تربیت کا انتظام برائے نام رکھا گیا ہے۔ اور اس کو اس قدر اہمیت نہیں دی جارہی ہے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ تاوقتیکہ بچہ قدرت کی طرف سے اچھے قویٰ لے کر نہ آئے اُس کو جسمانی تربیت سے جس کا انتظام مدارس میں کیا گیا ہے، متمتع ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس طرح جسمانی نشوونما میں ہم اپنے فرض کے ادا سے تغافل برت رہے ہیں۔

سیرت سازی سے غفلت

ہمارے فرض کا ایک اور حصہ جو اس سے بھی اہم ہے اور جس کو عموماً مدارس میں نظر انداز کیا جارہا ہے، سیرت سازی ہے۔ معدودے چند مدارس ایسے بھی ہیں جہاں اس حیثیت سے بھی کوشش کی جارہی ہے اور اس مقصد کی تحت مختلف مشاغل کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ سیرت سازی کے لئے ضروری تربیت دی جاسکے۔ مگر اکثر و بیشتر مدارس میں تعلیم کے اس اہم شعبہ پر بہت کم توجہ کی جارہی ہے۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مجبوری یا بے بسی۔

کئی تعلیم یافتہ نوجوان تقریباً روزانہ میرے پاس مدرسی یا اہل کاری کی خدمت کے لئے آتے رہتے ہیں۔ اکثر مجھے یہ کہہ کر انہیں مایوس لوٹانا پڑتا ہے کہ کوئی جائداد خالی نہیں ہے۔ میں ان کی اس مایوسی پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے پیشوں کا مشورہ دیتا ہوں تو وہ بجز مدرسی یا اہل کاری کے کسی اور پیشہ کو اختیار کرنے میں اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہیں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی مگر یہ واقعہ ہے کہ بہتیرے طیلسانی ایسے بھی ہیں جو سالہا سال سے بحیثیت مدرس یا اہل کار تقرر کے منتظر ہیں مگر اس پر بھی وہ کوئی اور کام اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ آخر ہمارے نوجوان اس قدر مجبور اور بے بس کیوں ہیں؟ بعض اشخاص ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر حرف دھرتے ہیں مگر یہ درست نہیں ہے؛ ہمارے طریقہ تعلیم میں کوئی ایسی خامی نہیں ہے۔ اسی طریق تعلیم کے ذریعہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بہترین نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہمارے مدرس اپنے

فرائض انجام دیں۔

ہمارے لوگوں میں ملازمت کی طرف میلان

تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مجبوری کے مختلف اسباب ہیں لیکن مناسب اور موزون تربیت سے بہت کچھ اصلاح ہوسکتی ہے۔ میں اپنے خیالات اس حد تک محدود رکھوں گا کہ اساتذہ اس کے اندفاع میں کیا حصہ لے سکتے ہیں بہتر طریق یہ ہے کہ پہلے ہم یہ معلوم کرلیں کہ ہماری راہ میں کیا مشکلات ہیں، بعض اشخاص جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کی پست ہمتی موجودہ طریقہ تعلیم سے ہے۔ ہمیں جاننا چاہیئے کہ اس معاملہ میں ہماری ذہنیت بہ نسبت کسی اور چیز کے زیادہ موردِ الزام ہے۔ یہ امر حیرت انگیز مگر واقعہ ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی کمسن بچہ پہلے پہل مدرسہ جاتا ہے تو اُس کے والدین اُسی روز سے اُس کی نوکری اور عہدے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں بچے کے خیالات بھی اسی ڈھرہ پر نشو و نما پاتے ہیں۔ ایسی ذہنیت کا وجود تہذیب یافتہ ممالک میں نہیں ہے۔ ہمارے ملکی حالات بھی اس افسوسناک ذہنیت کی تشکیل میں ایک حد تک ممد ہوئے۔ اس ملک کے تعلیم یافتہ اور شائستہ طبقات کے لوگ بھی سرکاری عہدے یا کسی نہ کسی ادبی کام کرنے کی عام طور پر کوششیں کرتے ہیں ایسے افراد بطور خود ایک طبقہ بنے ہوئے ہیں اور وہ علمی پیشہ کے سوائے اور کوئی پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ یہ تشفی بخش حالت نہیں ہے۔ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس قسم کی ذہنیت کو بدلنا چاہیئے اور لکیر کے فقیر نہ بنے رہنا چاہیئے۔

کامیابیٔ امتحان اور حصولِ اسناد کا شوق

دوسری خامی ہماری ذہنیت کی یہ ہے کہ ہم سیرت سازی کے مقابلہ میں امتحانات کی کامیابی اور حصولِ اسناد وغیرہ کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ حقیقی تعلیم سے مراد جسمانی، دماغی اور سیرت کی مکمل تربیت ہے۔ لیکن ہماری ذہنیت اس درجہ ناقص ہے کہ جو شخص کوئی امتحان پاس کرلے اُسے تعلیم یافتہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی علمی اسناد سے بلاشبہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے خاص معیار کی دماغی تربیت حاصل کی ہے؛ لیکن زندگی کی حقیقی کشمکش میں

اُس کے تمام قویٰ کی آزمائش ہوئی ہے اُس کے کام کرنے کی قابلیت، اپنے
فرائض سے شغف۔ ماتحتیں، برابر والوں اور افسروں سے برتاؤ، اُس کا تدین،
راست بازی، صاف گوئی، وفاداری اور اشتراکِ عمل، نیز دوسروں کا پاس و لحاظ
غرض کہ اُس کے تمام جسمانی اور دماغی استعداد اور وہ قوت جو انسان اور معاملات سے
سابقہ پڑنے پر صداقت و انصاف کے ارفع و اعلیٰ اصُول سے منحرف نہ ہونے دے
معرضِ امتحان میں ہیں۔ جیسی کچھ بھی ذہنی تربیت مدارس میں دی جا رہی ہے اس سے
یہ تمام چیزیں حاصل نہیں ہو رہی ہیں۔ یہ تربیت اپنی حد تک اچھی اور مفید ہے مگر
اُس کا جو معیار ہونا چاہیئے وہ ابھی نہیں ہے اور علی العموم غلط اصول پر ہے کیونکہ
اکثر رٹنا اور حفظ کر لینا مباح سمجھا گیا ہے حقیقی ذہنی تربیت کو رواج دینا چاہیئے
اس کے ساتھ ہی جسم اور سیرت کی تعمیر و تربیت پر ممکنہ فکر اور توجہ کرنے کی ضرورت ہے

نوجوانوں کی ناقص ذہنیت کے ساتھ ساتھ اُن کا اہلیت اور عملی تربیت سے عاری ہونا

یہ اور بیان کیا گیا ہے کہ تقریباً تمام مدرسہ
جانے والے لڑکے تعلیم کے زمانے میں
اپنے آئندہ عہدے کا خیال رکھتے ہیں والدین بھی منتظر رہتے ہیں کہ وہ کوئی امتحان
پاس کرے یا ڈگری لے۔ پھر باپ بیٹے دونوں مل کر تلاشِ ملازمت کے تھکا دینے
والے کام، نہایت استقلال کے ساتھ درخواستیں بھیج بھیج کر اور ملاقاتوں پر ملاقاتیں
عہدہ داران متعلقہ سے کر کے، شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی دلی مقصد
بر آئے لیکن ایسا نوجوان جس نے محض امتحان پاس کر لیا ہو اور جس کے قویٰ پوری
طرح تربیت اور ترقی یافتہ نہ ہوں زندگی میں کامیاب بھی نہیں رہتا ہے۔ اس کو ایک
طرح کی ناقص ذہنی تربیت ملی ہے اور اُس کی تربیت کا عملی پہلو ادھورا رہ گیا ہے
لہذا اس کا دماغ خیالات پریشان کا آماج گاہ بنا رہتا ہے جو دماغی سوءِ ہضمی کا باعث
ہے۔ ایسا نوجوان ناواجبی خودرائی میں مبتلا اور عموماً ذکی الحس ہوتا ہے۔ اِس لئے
اُس کو مصاحبت کر لے چلنا دشوار ہے۔ ناقص تربیت کے باعث وہ خود کو اپنے
ساتھیوں سے برتر سمجھتا اور ترقی کی فکر میں لگا رہتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ اُس میں

اشتراک عمل کی کمی ہوتی ہے اور وہ اور اشخاص کے ساتھ گھل مل کر نباہ نہیں کرسکتا یہ سب جانتے ہیں کہ زندگی کے تمام کاروبار انسانی اشتراک عمل اور یکجہتی پر مشتمل ہیں اور ہمیں متفقہ طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ بخلاف اس کے یہ نوجوان تھوڑی بہت ذہنی تربیت اور غیر تربیت یافتہ استعداد کے باعث موزونیت کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتا۔ اور ہمیشہ پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا علاج ہوسکتا ہے اگر ادبی اور نظری تعلیم کے وقت ہم ان چیزوں کو پیش نظر رکھیں اور رٹ لینے کے عیوب ظاہر کرتے ہوئے حقیقی ذہنی اور عملی تربیت کو ملحوظ رکھیں۔ اگرچہ یہ کام تکلیف دہ اور تھکا دینے والا ضرور ہے مگر جو کچھ بھی ہو ہمیں صحیح معنوں میں آدمی پیدا کرنے ہیں نہ کہ منشی یا شیخ چلی کے خواب دیکھنے والے جن کے لئے اس دارالعمل میں کوئی جگہ نہیں۔

دست کاری کی جانب ہماری یاس انگیز روش میں آپ کی توجہ اپنی ذہنیت کے ایک اہم نقص کی جانب مبذول کراتا ہوں۔ یہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ دست کاری کو ذلت سمجھتا ہے۔ ہمارے رسم و رواج اس غلط ذہنیت کی تشکیل کا باعث ہوئے ہیں۔ تمام کام شریفانہ ہیں اور کوئی کام ذلیل نہیں ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مدارس مفید اشخاص پیدا کریں تو اس ذہنیت کی تبدیلی بھی ہو جانی چاہیئے۔

تعلیم میں سرگرمی کی ضرورت اساتذہ حیدرآباد! اب آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے خطبہ کے ابتدائی حصہ میں ناصحانہ انداز میں ایسے الفاظ استعمال کئے جو بہادر سپاہیوں کے جوش و جذبہ کو مشتعل کرنے کے لئے لڑائی سے پیشتر استعمال کئے جاتے ہیں۔ میرے بہادر اساتذہ کی جماعت! آپ کو بھی جہالت اور قدیم توہمات کے خلاف جنگ عظیم کرنی ہے۔ یہ کشمکش بہت ہی سخت ہے اور ایک مدت تک رہے گی۔ اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ آپ کو بھی اس جہاد عظیم کے لئے کمر ہمت چست باندھ لینی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ فتح آخر میں آپ ہی کو نصیب ہوگی بشرطیکہ آپ اپنا کام والہانہ جذبے اور صداقت کے ساتھ جو اس مقصد عظیم کے لئے سزاوار ہے انجام دیں۔

حقیقت میں یہ راہ کٹھن ہے۔ بلا سخت جد و جہد اور جہادِ عظیم کے ہم یہ "منشی سازی" کے طریقۂ عمل کو انسان سازی سے بدل نہیں سکتے۔ سب سے پہلی اہم شرط خود آپ کا جوش ہے اگر ہم بددلی کے ساتھ اصلاح کا کام شروع کریں تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس زمانہ میں روزانہ استعمال کی معمولی سے معمولی چیز بنانا ہو تو بڑی سخت محنت کی ضرورت ہے لہذا یہ ایک معقول بات ہے کہ انسان سازی میں خاص مساعی درکار ہیں کیونکہ انسان خداوند تعالیٰ کی اشرف و اعلیٰ مخلوق ہے۔ اساتذہ صاحبان آپ انسان کے بنانے والے ہیں اور آپ کے بنائے ہوئے انسان دنیا کو سنواریں گے۔ کوئی مدرس کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ سرگرمی کے ساتھ اپنے کام کو شروع نہ کرے اور اس انسان سازی کے مشکل کام میں اپنے تمام اعضاء اور جوارح کی پوری قوت نہ لگا دے۔ مدرس کا جوش اثر آفرین ہے جو بڑے فائدہ کی بات ہے۔ اس جذبہ سے آدھا کام ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے آدھے کے لئے تحریک، نگرانی، استقلال اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے۔

تعلیم زندگی کی راہ میں معاون ہو

کیا میں وہ طریقہ کار بتا سکتا ہوں جس کے ذریعہ ہمارے نوجوانوں کی بے بسی کا علاج ہو سکتا ہے۔ جس طرح معدہ قیامِ صحت کے لئے ضروری چیز ہے اسی طرح کسی ملک کے اقتصادی حالات اُس کی خوش حالی کا یقین کرنے میں حصّہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی متوسط درجہ کی ذہنیت کا لڑکا ضروری تربیت کے بعد کوئی پیشہ اختیار کرتا ہے تو دو اہم عناصر یعنے اس کے جسمانی قویٰ اور اُس کی سیرت اُس کی کامیابی میں مدد دیتے ہیں اس لئے ہمارے نوجوانوں کی بے بسی دور کرنے اور انھیں مُفید اور خوش حال قوم بنانے کی خاطر ہمیں چاہیئے کہ تعلیم کے وقت ملک کی اقتصادی اور دیگر حالاتِ زندگی کو ملحوظ رکھیں اسی خیال کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ جو تعلیم ہم دے رہے ہیں وہ حالاتِ زندگی کے بالکل مغائر نہ ہو بلکہ اُن کے دوش بدوش ہو۔ ہمیں عملی طور پر کام کرنے والے آدمی تیار کرنے کی ضرورت ہے جو زندگی کے جُملہ کاروبار میں کارآمد ہوں نہ کہ ایسے جو نرے قلم کش یا چرب زبان یا شیخ چلی کی طرح خواب دیکھنے والے ہوں ایسے لوگ تو اپنی اور دوسروں کی زندگی کو بھی تلخ بنا دیں گے۔

ہر طالب علم کے لئے انفرادی طور پر تعلیم کے عملی پہلو کو پیش نظر رکھنا پھر اُسے زندگی کے
کسی مُعین کام کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم مخلصانہ
مساعی اور سرپرستوں کے اشتراک عمل کے ذریعہ اس کو انجام دیں۔

پہلے ہم اپنی ذہنیت کو بدل ڈالیں
پھر طلبہ کی ذہنیت بدلیں۔

اگر تعلیم سے انسان محض ایک نوعیت کے کام
یعنے دفتری یا ادبی کے قابل ہو تو ایسی تعلیم ناقص
ہو گی تعلیم یافتہ شخص کو باقاعدہ تربیت اور موزوں
مواقع ملنے کے بعد کسی قسم کا کام خواہ کیسے ہی حالات پیش آئیں کامیابی کے ساتھ انجام
دینے کی ضرورت ہے۔ وہ ایسا اُسی وقت کر سکے گا جب کہ اُس کے قویٰ کی تربیت اور
نشو و نما باقاعدہ طور پر ہوئی ہو۔

اگر طلبہ کے قویٰ کی ترقی اور سیرت سازی ہمارا نصب العین رہے اور اُن میں
ہم عملی کام سے لگاؤ بھی پیدا کریں تو وہ اپنی بے بسی اس درجہ محسوس نہ کریں گے جیسا کہ
اب محسوس کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے وہ اپنے مذاق کے مطابق پیشہ کا انتخاب کریں
اس کے لئے تو ہم مدرسین کو اپنی ذہنیت اور زاویہ نظر کو بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم
اپنی تعلیم اور اس کے ساتھ طلبہ کی ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا کر سکیں۔ آپ میں سے ہر ایک
اس بحث پر پوری طرح غور و خوض کرے اور اپنے دوستوں اور عہدہ داروں سے گفتگو
کرے جب وہ پوری طرح ہماری ذہنیت کے استقام کا قائل ہو جائے تو اس کی ساری
فطرت میں انقلاب ہو گا۔ اگر وہ پُرجوش مُعلم ہے تو اس کے دل میں سینکڑوں نئے خیالات
جماعت میں یا جماعت کے باہر پیدا ہوں گے اور وہ سینکڑوں طریقے حصُول مقصد کے لئے
اختراع کرے گا۔ بالفاظ دیگر اس کا یہ مفہوم ہے کہ ہم محض کامیابی امتحان کی خاطر درسی کتب
ہی کی تعلیم نہ دیں بلکہ اُن کے جسم، دماغ اور سیرت کی تربیت کریں اور عملی کام سے ذوق پیدا
کرتے ہوئے انھیں انسان بنائیں۔ ہمارے مدارس میں ہر بات کا انتظام پہلے ہی سے ہے
اور اگر نہیں ہے تو کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ جیسے جیسے موقعے ملیں ہم ان سے فائدہ
اُٹھائیں۔ ہمارے مقصد کو کبھی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اگر کوئی اثر پڑ سکتا ہے تو وہ ہماری

قوت تحریک اور جوش و جذبہ کی کمی اور عدم ثبات کوشش کے باعث ہوگا۔

دوسری مشکلات ہماری راہ میں اور مشکلات بھی ہیں جن کا بڑا سبب یہ ہے کہ تخیل اور جذبات نے ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ لیکن زندگی کی تلخ حقیقتیں ہمارے اپنے خلوص کے ساتھ مل کر ان کمزوریوں کے دور کرنے اور غلط ذہنیت کے بدلنے میں مدد دیں گی۔

جسمانی ورزش اور سیرت سازی کے متعلق مشورے میں پھر اس مبحث کی جانب رجوع ہوتا ہوں کہ تربیت جسمانی اور سیرت سازی حقیقتہً ہندوستان کی دو اہم ترین ضرورتیں ہیں اور حقیقت میں دونوں ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے موضوعات ہیں۔ میں بار بار اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اگر آپ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ مقررہ درسی کتب کی تعلیم دے کر اور امتحان پاس کرا کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے تو آپ بالکل غلطی پر ہیں یہ تو فقط آپ کے فرائض کا ایک جز ہے اگر آپ نے اپنے طلبہ کی جسمانی ورزش صرف ڈرل ماسٹروں پر چھوڑ دی تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ ادائے فرائض سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ ہر مدرسہ کے مدرسین کو متفقہ طور پر تفریحوں، کھیلوں اور کشافی کے انتظامات میں حصہ لینے کی ضرورت ہے اور دور موجودہ کے طریقوں کو رائج کرنا بھی لازمی اور ضروری ہے بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے تاوقتیکہ حکومت یا سررشتہ بازی گاہ یا سامان ورزش کا انتظام نہ کرے آپ کو یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ مدرسہ میں آپ حکومت اور سررشتہ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ آپ کے مقصد کو محض آپ کی قوت اختراع کی کمی سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر کسی مدرسہ کے اساتذہ حقیقی طور پر کوشش کریں تو وہ تمام موانعات پر غالب آ سکتے ہیں۔ سررشتہ تو ہمیشہ اُن کی کامیابی کے لئے رہبری اور امداد کو تیار ہے۔

میں اس کا متمنی ہوں کہ ورزش جسمانی پر پہلے کی نسبت کرتے اب سے کہیں زیادہ توجہ کی جائے۔ کھیل، ورزش اور کشافی کی تنظیم سے نہ صرف آپ کے طلبہ کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا بلکہ سیرت سازی میں بھی بڑی مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ ہر مدرسہ میں جتنے اور

مشاغل کا انتظام ہو سکتا ہے کیا جائے تاکہ طلبہ میں عملیت کا عنصر ترقی پائے اور ان کے کردار کی بھی تربیت ہو۔

کھیل کی روح کھیل اور ورزش کے رواج دینے کی بحث کے ضمن میں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر ان سے اصل روح کے پیدا کرنے کا کام نہ لیا گیا تو جو فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں وہ بہت ہی محدود ہوں گے۔ کیونکہ کھیل کی روح کے یہ معنی ہیں کہ بازی گاہ پر شریفانہ روغن رکھی جائے۔ کھیل اور ورزش میں بد طینتی کا اظہار مدرسے کے لئے بدنما دھبہ ہے اور اس سے یہی ظاہر ہوگا کہ سیرت سازی کے معاملہ میں بجائے فائدہ کے زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔

ضبط اور نمونے کا اثر طلبہ کے اخلاق پر دو چیزوں کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے: یہ مدرسہ کا ضبط اور مدرسین کا نمونہ نیک ہے۔ اگر ضبط اچھا ہے تو طلبہ بھی شائستہ اور قانون پسند ہوں گے اور ضبط نفس کے علاوہ اور بھی اچھی عادتیں ان میں پیدا ہوں گی بخلاف اس کے خرابی ضبط مخفی زہر کی طرح کام کرتی اور طلبہ کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح مدرسین کے نمونۂ نیک کا گہرا اثر طلبہ پر پڑتا ہے۔ یہ سب کو بخوبی معلوم ہے کہ نمونۂ نیک پند و موعظت سے کہیں بہتر ہے۔ لہذا کوئی معلم پڑھائے کچھ اور نمونہ کچھ اور قائم کرے تو وہ نہ صرف طلبہ کی نظر میں مضحکہ خیز ہوگا بلکہ اس سے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچے گا۔ آپ یہ ہمیشہ دیکھیں گے کہ استاد کی پاک و مفید، سرگرم و مخلصانہ زندگی کا نمونہ طلبہ کی سیرت سازی کے لئے ازبس مفید ہے۔

صنعتی تعلیم کی ترویج کی ضرورت اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ ہمارے طلبہ میں عملی تعلیم کی طرف میلان پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ دست کاری اکثر معیوب سمجھی جاتی ہے۔ اگر مناسب و موزون دست کاری یا فنی تعلیم ہمارے مدارس میں رائج کی جائے تو دو فائدوں سے خالی نہیں پہلے یہ کہ طلبہ میں عملی میلان پیدا کیا جا سکے گا دوسرے وہ تمام غلط خیالات کہ دست کاری معیوب ہے دل سے محو ہو جائیں گے۔ اس کام میں بھی جدت، سرگرمی اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے

اس غرض کے لئے اگر کسی مدرسہ میں کوشش کی جائے تو محکمہ اس کو نظر استحسان سے دیکھے گا اور مقامی حالات کی مناسبت سے دست کاری اور پیشہ ورانہ تعلیم کے رواج دینے میں ہمیشہ مدد اور رہبری کرے گا۔ یہ امر طمانیت بخش ہے کہ بعض اساتذہ نے دست کاری اور فنی تعلیم کا انتظام کیا ہے یہ ملک کے پیشوا ہیں اور میں انھیں اس پیش بینی اور مستعدی پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ کو اس کا علم ہے کہ ہندوستان کی فضا سُرعت کے ساتھ بدل رہی ہے اور عوام کو زیادہ باعمل بنانے کی فکریں کی جا رہی ہیں تاکہ وہ زندگی کی کشمکش کے لئے بہتر طریقہ پر تیار ہو جائیں، ہمیں چاہیئے کہ اس ریاست کو ہم پیچھے نہ رہنے دیں۔ یہی وقت ہے کہ اس کام کی ابتدا کی جائے اور آپ ہی کے ہاتھوں میں یہ کام دیا گیا ہے۔ آپ کی مشکلات سخت ہیں مگر ان پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا بھی چاہیئے۔ پہلے آپ اپنی ذہنیت بدلیں پھر طلبہ کی ذہنیت بدلی جائے اور اُن کے ذریعہ بتدریج عوام کی ذہنیتیں بھی بدلی جائیں۔ اہل کاری کی جائدادیں اتنی نہیں ہیں کہ اُن کے لئے کافی ہو سکیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ خدا کا ملک بھی تنگ نہیں ہے۔

تعلیم میں عملیت پیدا کیجائے

محض دست کاری یا فنی تعلیم ہی سے عملیت کا ذوق پیدا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ صدہا موضوعات دوران تعلیم میں ایسے ملیں گے کہ جن کے ذریعہ طلبہ کو عملیت کی تعلیم موزوں طریق پر دی جا سکتی ہے۔ اساتذہ صاحبان اس معاملہ میں کوشش کریں۔ انجمن اساتذہ اس کام کو اپنے شرکاء کے فائدے کے لئے کر سکتی ہے۔ ایک ذیلی کمیٹی مقرر کرنی چاہیے جس کا یہ کام ہو کہ تعلیم میں عملی پہلو پیدا کرنے کے طریقوں کو واضح کرے۔

متوقع نتائج

اگر ہم اپنی مساعی میں کامیاب رہیں تو ہم ایسے اعلیٰ ذہنیت کے نوجوان پیدا کر سکیں گے جو دماغی اور جسمانی حیثیت سے تربیت یافتہ، خوش کردار، صداقت پرست اور صاف گو ہوں گے، نہ صرف اس قدر ہی بلکہ رواداری، اتحاد اور وفاداری کے جذبے سے سرشار ہوں گے، اور کسی مفید و دیانت دارانہ کام کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے یہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں مثلاً: سائنس و اعلیٰ تحقیقات، سرکاری ملازمت و تجارت،

زراعت و حرفت وغیرہ میں کامیاب رہیں گے اور ریاست کو خوش حال اور مالا مال کر دیں گے
فوراً شروع کر دو سال تعلیمی شروع ہو چکا ہے اور موسم بھی بدل گیا تعطیل گرما میں آپ
لوگ آرام لے کر تازہ دم آئے ہیں! اس لئے یہ وقت بہت ہی مناسب ہے کہ
بیان کئے ہوئے طریقہ پر کام شروع ہو جائے۔ میں سال رواں میں دیکھوں گا کہ مختلف
سرگرمیوں کے انتظام میں ہر مدرسہ نے کتنی ترقی کی ہے؟ میں اس سال معائنہ مدارس
کے لئے نکلوں گا تو ہر مدرسہ کو اپنی ترقی کی تفصیل بتانی ہو گی۔ میں ریاست کے مدارس
کو حقیقی معنوں میں مدارس دیکھنا چاہتا ہوں جہاں حقیقی تعلیم ہو اور وہ ایسے کارخانے
نہ بنے رہیں جہاں سستے محرر اور نرے شیخ چلی پیدا کئے جاتے ہوں۔
استحکام کا اوّلین دور آپ سب جانتے ہیں کہ اس محکمہ کی توسیع کا دور ختم ہو چکا اور
اب استحکام کا پہلا دور شروع ہوا ہے۔ جو عزت اور ناموری حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ استحکام
اور ترقی کے میدان میں میرے مشورے کے مطابق خصوصی امتیاز حاصل کریں توسیع
کا دور اس وقت شروع ہو گا جب ہم اپنی موجودہ حالت کو مستحکم کر لیں اور سرمایہ بھی وافر
ہو۔ اب بھی جہاں جہاں اور جب کبھی گنجائش نکلے کسی قدر توسیع ہو سکتی ہے لیکن توسیع
اور استحکام کے وقت جو اصلاح کی راہیں میں نے بیان کی ہیں وہ ہمیشہ ملحوظ خاطر رہیں
یہ بھی یاد رہے کہ مدارس میں ادبی تعلیم کا معیار نہ صرف برقرار رہے؛ بلکہ جہاں تک
ہو سکے اُسے بلند کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ طلبہ کی جسمانی اور دماغی تربیت کے لئے
مختلف سرگرمیوں اور مشاغل کی جو تنظیم ہو گی وہ بمصداق "العقل السلیم فی الجسم السلیم"
ہو گی اس طرح ہم نہ صرف طلبہ کی قابلیت کار کو بڑھا سکیں گے بلکہ ان کی فہم و ادراک
میں بھی اضافہ ہو گا۔ جو طلبہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے جائیں وہ ہر حیثیت سے طفولیت
کا بہترین نمونہ ہوں تاکہ ہماری جامعہ کے طیلسانی دنیا کے ہر شعبہ زندگی میں اپنا جواب
نہ رکھیں۔
جامعہ عثمانیہ اور اُس کا ذریعہ تعلیم جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ہمارا کام بہت ہی آسان ہو گیا ہے
ہندوستان کی موجودہ جامعات میں ہماری جامعہ سے

زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ جامعہ عثمانیہ میں بہ نسبت کسی اور ہندوستانی جامعہ کے کم مصارف اور محنت میں بہتر ذہنی تربیت حاصل ہو رہی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ ذریعہ تعلیم ہندوستان کی عالمگیر زبان یعنی اُردو ہے۔ وہ ہندوستان ہی کی عام زبان نہیں ہے بلکہ وہ بنی نوع انسان کی خدمت ساحل ہندوستان سے آگے بھی انجام دیتی ہے۔ تقریری اُردو بالکل ہندی ہی ہے نہ صرف مشرقی ممالک میں کام آتی ہے بلکہ دنیا کے اور حصص میں بھی کارآمد ہے جو برطانوی تعلقات کے باعث ہندوستان کی دسترس میں ہیں۔ یہ کوئی حیرت میں ڈالنے والی بات نہیں ہے اس لئے کہ اُردو نے یہ فوائد قدرتی طریقہ پر حاصل کئے ہیں۔ یہ زبان ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی اور دونوں کے سائہ عاطفت میں پلی۔ جب انگریز آئے تو اُس کی ترقی جاری رہی کیونکہ اُردو ہندوستان کے اکثر حصص میں تبادلہ خیالات کا بہت آسان اور قدرتی ذریعہ تھی۔

برطانیوں کی آمد سے اُردو کی افادت بہت بڑھ گئی کیونکہ ہندی برطانوی مشترکہ سہامت کے باعث اُردو، انگریزی کے دوش بدوش رہی اور ہندوستان کے ساحل کے باہر نکل گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کرہ ارض کے صدہا مقامات پر اُردو بولی اور سنی جاتی ہے۔ اُردو کی بڑی خدمات جو اُس نے بنی آدم کے لئے انجام دی ہیں وہ نتیجہ ہیں تین بڑی نسلوں یعنے ہندو، مسلمان اور انگریز کے اتحاد کا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حیرت انگیز زبان کا یہ عطیہ خداوندی ہے۔ اُردو کی ابتداء دکن اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رواداری اور اخوت کی فضا میں ہوئی۔ اس کی جاذبیت اور ہمہ گیری بھی اُسی کے ساتھ پیدا ہوئی۔ اس کی یہ قوتیں قائم ہی نہیں رہیں بلکہ قریبی تعلقات کی فضا میں جس میں وہ بلکر بڑی ہوئی، اور بھی بڑھ گئیں۔ اُردو کے استحکام اور کامیابی کا ایک راز ہے۔ یہ قدرتی عطیہ، اُردو کی پیدائش اور نشوونما کے عجیب و غریب حالات میں اس کو ملا؛ لہذا اُردو کا مستقبل شاندار ہے۔ ایسی زبان جب ذریعہ تعلیم ہے تو جامعہ عثمانیہ کا مستقبل بھی عظیم الشان ہے بشرطیکہ آپ اپنے طلبہ کو یونیورسٹی میں بھیجنے کے قبل ہر حیثیت سے

پوری پوری تربیت دے لیں۔

انگریزی کی اہمیت اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیتے ہوئے آپ لوگ انگریزی کی اہمیت کو نہ بھلا ڈالیں جس کے ہم مرہون منت ہیں۔ اسی زبان نے ہم پر علوم جدیدہ کے دروازے کھول رکھے ہیں اور بعض اغراض کے لئے تو یہ ساری مہذب دنیا کی زبان ہے۔ چونکہ جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے اس لئے اور بھی ضروری ہوا کہ انگریزی کی جانب زیادہ توجہ کی جائے تاکہ اس اہم زبان کے ادبی معلومات کا معیار اسی طرح قائم رہے مجھے جامعہ عثمانیہ کی طرف سے اور دوسرے ذرائع سے شکایتیں وصول ہوئی ہیں کہ جو لڑکے ہمارے مدارس سے کامیاب ہوکر نکلتے ہیں وہ انگریزی میں مقررہ معیار تک نہیں پہنچتے ہیں لہذا ہمارے استحکام کے نظام العمل میں شدومد کے ساتھ کام لیا جائے۔

حضرت اقدس و اعلیٰ کا شکریہ اساتذہ صاحبان حیدرآباد! مجھے آپ کو یاد دلانا چاہیئے کہ بیس سال قبل حیدرآباد میں علمی گرم بازاری کا دسواں حصہ بھی نہ تھا جتنا کہ اب ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ ترقی آخر کیسے ہوئی؟ یہ حضور اقدس و اعلیٰ کی معارف پروری اور فیاضانہ دلچسپی کا نتیجہ ہے جو حضرت اقدس کو اپنی رعایا سے ہے۔ حضور والا کی فیاضی اور دُور اندیشی نے وہ حیرت انگیز معجزہ چند سال میں کر دکھایا جو نصف صدی میں بھی نہ ہوتا۔ ہم سب ذات والاصفات کے سپاس گزار ہیں کہ ایسی عظیم الشان درس گاہوں سے اس قلیل مدت میں مستفید ہونے کا موقع عطا فرمایا۔

مترجمہ

عبدالنور صدیقی

کمیٹی تعلیم پیشہ ورانہ

اس کمیٹی کا انتخاب انجمن اساتذہ حیدرآباد کی مرکزی انتظامی کمیٹی کی طرف سے اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ وہ مدارس سرکاری میں پیشہ ورانہ تعلیم کے رائج کرنے اور فروغ دینے کے لئے کوئی صورت نکالے اور مناسب تجاویز پیش کرے۔

عنوانات زیر بحث کمیٹی کے مندرجہ ذیل عنوانات زیر بحث تھے:۔

(۱) پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورت۔ (۲) مدارس کے نصاب میں پیشہ ورانہ تعلیم کی حیثیت
(۳) پیشہ ورانہ تعلیم کے اقسام۔ (۴) معلمین کی ٹریننگ کا انتظام۔
(۵) عوام کو پیشہ ورانہ تعلیم کی ترغیب دینا۔

ارکان کمیٹی مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی:۔

(۱) عالیجناب مولوی سید محمد حسین صاحب بی اے (کینٹب) نائب ناظم تعلیمات سرکار عالی (صدر مجلس)
(۲) جناب " محمد سلطان صاحب (معتمد)
(۳) " " باقر محی الدین صاحب
(۴) مسٹر کے پی شاشتری (۵) مسٹر جی۔ بی۔ گارڈن۔
(۶) مولوی سید صدرالدین صاحب (۷) مولوی غلام دستگیر صاحب
(۸) " شرف الدین " (۹) مسٹر سدہ بواکر۔
(۱۰) " سید مشتاق احمد صاحب (۱۱) " بالریڈی۔
(۱۲) " سید تجمل حسین صاحب۔ (۱۳) مسٹر ریورنڈ ایس۔ ڈینیل۔
(۱۴) مسٹر حامد علی (۱۵) مولوی محمد ناصر حسین صاحب۔
(۱۶) اے سیوا شنکرم۔ آئرصاحب

تواریخ انعقاد اجلاس کمیٹی کمیٹی کے تین اجلاس ہوئے۔ پہلا ۲۶ ماہ اپریل ۱۹۲۹ء کو دوسرا ۲۵ ماہ جون ۱۹۲۹ء کو اور تیسرا ۲۷ ماہ جون ۱۹۲۹ء کو منعقد ہوا۔ تینوں مرتبہ اکثر اراکین نے

شرکت کی۔

کمیٹی کا دستور العمل کمیٹی کے پہلے اجلاس میں یہ طے پایا کہ ایک سب کمیٹی مقرر کی جائے اور جملہ اراکین سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی انفرادی تجاویز تحریر فرما کر سب کمیٹی کے سامنے پیش کریں۔ اور سب کمیٹی سے درخواست کی گئی کہ ان گوناگوں تجاویز پر اچھی طرح غور وفکر کرنے کے بعد اپنی آخری روئیداد جنرل کمیٹی کے روبرو پیش کرے۔ ان جملہ امور کے طے پانے کے بعد سب کمیٹی کی رپورٹ کے ہر ایک عنوان پر آخری دو جلسوں میں خوب مباحثہ ہوا اور رپورٹ میں کہیں کہیں کچھ رد و بدل اور اضافہ ہوا۔ اب یہ رپورٹ مکمل صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔

پیشہ ورانہ تعلیم کی تعریف یہ کہا جاتا ہے کہ ہر قسم کی تعلیم پیشہ ورانہ ہے۔ پروفیسر آڈمس اپنی کتاب (نظریۂ تعلیم کا ارتقاء) (Evolution of Educational Theory) میں لکھتا ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جن کے لئے پیشہ ورانہ تعلیم کا نام لینا ہی کفر ہے۔ لیکن اگر ہم معاملہ کی تہ کو پہونچیں تو پھر اس صفت میں سوائے لفظوں کی تکرار کے اور کچھ نظر نہیں آتا در اصل ہر قسم کی تعلیم پیشہ ورانہ ہے۔ کتابی تعلیم کے بڑے سے بڑے حامی کو بھی تکراری پہلو اختیار کرنا پڑے گا۔

اس کی کوششوں کا کوئی نصب العین ہوگا...... اس کا شاگرد چونکہ نہ تو خدا ہی ہے نہ وحشی جانور اس وجہ سے اس کا تنہا رہنا ناممکن ہے۔ اس کو کسی نہ کسی طریقہ سے مدنی بنانا لازمی ہے ہم کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرتے ہیں"۔ ممکن ہے کہ ہر قسم کی تعلیم پیشہ ورانہ ہو۔ لیکن اصطلاح میں پیشہ ورانہ تعلیم سے ایک خاص قسم کی تعلیم مراد ہوتی ہے جو اگرچہ عام تعلیم کا ایک جزو ہوتی ہے تاہم ایک متعلم کو ایک خاص نہج پہ لے جاتی ہے اور اس لئے اس کو زندگی میں کسی خاص پیشہ کے اختیار کرنے کے لئے تیار کرتی ہے۔ ہر ایک قسم کی تعلیم جو لڑکے یا لڑکی کو دنیا میں کسی قسم کے کاروبار کرنے کے قابل بنائے پیشہ ورانہ تعلیم کہی جا سکتی ہے اور اس کا عام تعلیم سے تعلق نہیں ہے جس سے بچے کی دماغی نشو ونما ہوتی ہے اور نہ اس لڑکے یا لڑکی کو ان پیشوں سے تعلق ہوتا ہے جو وہ اپنی آئندہ زندگی

میں اختیار کرنے والے ہیں۔

پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورت بہت عرصہ سے پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورت عوام کو اور محکمہ تعلیمات کو محسوس ہو رہی ہے مدارس میں پیشہ ورانہ تعلیم کو مروج کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کے نوجوانوں کو تجارت صنعت و حرفت اور زراعتی کاروبار کی طرف رغبت دلائی جائے۔ ہماری رائے میں تعلیم یافتہ طبقہ کے دفتری اور فنی کاروبار کی طرف میلان طبع کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ ادبی تعلیم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ کچھ اس قسم کی عملی تدابیر اختیار کی جائیں کہ ہمارے مدارس میں ایسے مضامین جن سے طلبہ میں مختلف پیشوں کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف رغبت ہو رائج کئے جائیں تاکہ وہ اپنی عقل اور دست و بازو کی بدولت روزی کما سکیں۔

پیشہ ورانہ تعلیم کس طرح مروج ہو سکتی ہے اس مسئلہ کا بہترین عل یہ ہے کہ تیرہ سال کی عمر تک جبری تعلیم کا قانون بنا دیا جائے اس کے اختتام پر ایک عام امتحان لیا جائے۔ جس کے نتائج کے لحاظ سے طلبہ کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جائے جو بہترین ہوں ان کو عام ثانوی مدارس میں بھیجا جائے اور باقی ماندہ طلبہ کو مرکزی پری ووکیشنل اسکول میں اس طرح ان لڑکوں پر جو مدارس ثانویہ میں بھیجے گئے ہیں یونیورسٹی کا دروازہ کھل جائے گا اور وہ طلبہ جو پری ووکیشنل اسکول میں داخل ہوئے ہیں فنی اور زراعتی اسکولوں میں بھی داخل ہو سکیں گے گو یہ تجویز اپنی نوعیت میں لاجواب ہے لیکن اس کو عملی جامہ پہنانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ پرائمری تعلیم جبری ہو جائے اور مختلف قسم کے مدارس علیحدہ علیحدہ قائم کرنے کے لئے زر خطیر موجود ہو۔

چونکہ مسئلہ نہایت اہم ہے اور ہم تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود کے مصداق اس خیالی تجویز کے عملی جامہ پہننے تک نہیں ٹھیر سکتے اس لئے مندرجہ ذیل تجاویز موجودہ حالات کے اعتبار سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) ہم سفارش کرتے ہیں کہ ابتداً چند فائدہ مند پیشوں کی تعلیم خاص خاص شہری اور دیہاتی مدارس میں رائج کی جائے۔

(۲) اگر پیشہ ورانہ مضامین دیگر اختیاری مضامین کی فہرست میں شریک کردئے جائیں گے تو خوف ہے کہ لڑکے ان مضامین کو نہ لیں گے اور ہمارا مقصد کبھی پورا نہ ہوگا اس لئے ہم اس امر کی پرزور تائید کرتے ہیں کہ پیشہ ورانہ مضامین جہاں کہیں بھی رائج ہوں لازمی قرار دئے جائیں اور خاص خاص حالتوں میں طلبہ ان سے مستثنیٰ کئے جائیں مختلف مدارج کے مدارس میں مختلف قسم کے پیشوں کی تعلیم ہو۔

مدارس تحتانیہ ہماری رائے میں مدارس تحتانیہ میں یا مدارس فوقانیہ و وسطانیہ کے طبقہ تحتانیہ میں فنی یا زراعتی عملی تعلیم دینے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ اگر عام تعلیم اس طریقہ سے دی جائے کہ بچوں کو پیشوں کی طرف میلان پیدا ہو تو یہ کافی ہے۔

اس طبقہ میں اس غرض کی تکمیل کے لئے ہم ذیل کے مضامین پیش کرتے ہیں:۔

(۱) دست کاری (۲) ڈرائنگ (۳) نیچر اسٹڈی (۴) باغبانی۔

دست کاری دست کاری کی تعلیم کا مقصد نجار، لوہار، سنار، وغیرہ پیدا کرنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اُس کا مقصد بچے کے ہاتھوں اور آنکھوں کی ایسی تربیت کرنا ہو کہ اُس کو وہ کسی ہنر یا پیشہ کے سیکھنے میں سہولت ہو۔ دست کاری کی بدولت وہ لاپروائی اور نفرت جو لوگوں کو دست کاری سے ہوگئی ہے جاتی رہے گی اور آئندہ زندگی میں ان پیشوں کے اختیار کرنے کے لئے بچوں کا رجحان معلوم ہوسکے گا۔ طبقہ تحتانیہ میں تعلیم دست کاری صرف ایسے مشاغل تک محدود رہنی چاہیئے جیسا کہ مٹی کے کھلونے، ریت کے کھیل، کاغذ کاٹنا اور موڑنا۔

طبقہ تحتانیہ میں اس بات کی کامل آزادی دی جائے کہ وہ دست کاری کے وقت اپنی جدت و قوت اختراع اور تخیل کو پوری طرح استعمال کریں دست کاری کی تعلیم طبقہ فوقانیہ اور وسطانیہ میں بھی ہوسکتی ہے۔

ڈرائنگ یہاں اُن قواعد کو جو مدارس میں تعلیم ڈرائنگ سے حاصل ہوتے ہیں بیان کرنا بالکل بے ضرورت معلوم ہوتا ہے۔ پس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس سے نہ صرف دماغی نشو و نما ہوتی ہے بلکہ یہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی ممد و معاون ہے۔

نیچر اسٹڈی | نیچر اسٹڈی کا اہم مقصد بچے کو اس کے ماحول سے گہری دلچسپی پیدا کرانا اور اس میں غور فکر اور عمیق مشاہدہ کی عادت ڈالنا ہے۔ یہ باتیں چند جاندار اور بے جان چیزوں کے ابتدائی مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ دست کاری ڈرائنگ اور نیچر اسٹڈی نصاب میں پہلے ہی سے شریک ہیں چونکہ یہ مضامین سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم میں مدد دیتے ہیں اس وجہ سے ہمیں امید ہے کہ محکمۂ تعلیمات اس امر کی ہر ممکنہ کوشش کرے گا کہ اچھے مدرسین فراہم کئے جائیں تاکہ ان مضامین کی خاطر خواہ تعلیم ہو سکے۔

دستکاری ڈرائنگ اور نیچر اسٹڈی کی تعلیم کے لئے تعداد ساعات۔ | ہم سفارش کرتے ہیں کہ مدارس تحتانیہ میں اور مدارس فوقانیہ اور وسطانیہ کے تحتانیہ طبقہ میں دست کاری ڈرائنگ اور نیچر اسٹڈی کی تعلیم کے لئے حسب ذیل ساعات مقرر کئے جائیں۔

دست کاری	چار ساعت	فی ہفتہ
ڈرائنگ	چھ "	" "
نیچر اسٹڈی	تین "	" "

مدارس وسطانیہ | ہم سفارش کرتے ہیں کہ تعلیم پیشہ ورانہ ایک خاص معاشی نقطۂ نظر سے مدارس وسطانیہ میں رائج کی جائے۔ اس رپورٹ کے ضمیمہ نمبر (۱) میں جو فہرست درج ہے ان صنعتوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ حسابی کاروبار بھی حتی الامکان سکھایا جائے۔ مدارس دیہی میں زراعت اور باغبانی کو بھی رواج دیا جائے۔ شہروں میں بھی جہاں حالات مساعدت کریں پیشہ زراعت کی تعلیم ہو سکتی ہے۔

تعداد ساعات درس برائے تعلیم پیشہ ورانہ۔ | طبقۂ وسطانیہ میں تعلیم پیشہ ورانہ کے لئے ہماری رائے میں کم از کم آٹھ ساعات فی ہفتہ مقرر ہونے چاہئیں۔ اس وقت کی گنجائش نکالنے کے لئے دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ دیگر مضامین کے اوقات میں کمی کی جائے دوسری یہ کہ پیشہ ورانہ تعلیم اوقات مدرسہ کے علاوہ ہو۔

مدارس فوقانیہ | مدارس فوقانیہ میں ایسے پیشہ ورانہ مضامین جن سے سائنس اور فنون کا بھی تعلق ہو مثلاً نجاری، چوکھٹے بنانا، فرنس ورک، نمونے بنانا، ڈھالنا وغیرہ مقامی حالات کے مطابق سکھانے چاہئیں۔ تعلیم تجارت جو ایچ ایس۔ ایل سی کے امتحان کی ایک اختیاری مضمون ہے۔ اس کو عثمانیہ یونیورسٹی کے میٹرکیولیشن امتحان کا بھی اختیاری مضمون قرار دیا جائے۔ تعلیم زراعت دیہی اور شہری دونوں قسم کے مدارس میں جہاں بھی سہولت موجود ہو جاری کی جا سکتی ہے۔

اوقات تعلیم پیشہ ورانہ | چونکہ مدرسہ فوقانیہ کے متعلم کو بہت سے مضامین پڑھنے پڑتے ہیں۔ اس لئے ہماری رائے میں تین گھنٹے فی ہفتہ پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے کافی ہونگے لیکن اساتذہ اگر چاہیں تو زائد کام اوقات مدرسہ کے بعد طلبہ سے لے سکتے ہیں۔

تعلیم زراعت | ممالک محروسہ سرکار عالی میں سب سے بڑا ذریعہ آمدنی زراعت ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ یہاں کے باشندے تقریباً (۸۵) فیصدی زراعت پیشہ ہیں۔ اس لئے ہم اس امر کی پرزور سفارش کرتے ہیں کہ مدارس دیہی میں تعلیم زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔

دیہی مدارس تحتانیہ | مدارس تحتانیہ اور مدارس فوقانیہ و وسطانیہ کے طبقہ تحتانیہ میں اس بات کی ہرگز کوشش نہ کی جائے کہ بچوں کو زراعت اور باغبانی کی پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے۔ وہ مضامین جو مدارس تحتانیہ کے لئے تجویز کئے گئے ہیں دیہی مدارس تحتانیہ میں بھی بخوبی کار آمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں باغبانی پر زیادہ زور دیا جائے۔

باغبانی | صحیح مضمون میں باغبانی نیچر اسٹڈی کا ایک جزو ہے۔ اس کی تعلیم کسب فن کی غرض سے نہ دی جائے اصل میں یہ ایک ایسی دست کاری ہے جو ہاتھ میں پھرتی اور سلیقہ پیدا کرتی ہے۔ اور دماغ کو صیقل کر کے قوت مشاہدہ کو ترقی دیتی ہے اور صبر و استقلال کی خوبیاں اور پہچاننے کی عادت ڈالتی ہے۔ یہ بچوں کو محنتی بناتی ہے۔ ان میں زمین کی محبت پیدا کرتی ہے اور زرعی کاروبار سے جو نفرت ان کے دلوں میں ہے اس کو دور کرتی ہے۔

دیہی مدارس وسطانیہ وفوقانیہ ہماری رائے میں دیہی مدارس وسطانیہ وفوقانیہ میں جہاں تک ممکن ہو زراعت اور باغبانی کی عملی تعلیم بطور پیشہ دی جائے۔ مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ میں تعلیم زراعت تعلیمی نقطۂ نظر سے اس وجہ سے فائدہ مند ہے کہ اس میں دست کاری کے ساتھ ساتھ دماغی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ اور یہ لڑکوں کی توجہ زراعت کی طرف لگاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مدارس ثانویہ میں تعلیم زراعت اور باغبانی کے لئے زمین حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ زمین کے بغیر اس مضمون کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ آراضیات حاصل کرنے کے لئے محکمۂ تعلیمات کو محکمۂ مال کی امداد اور تعاون کی ضرورت ہوگی۔

قطعات زمین ہماری رائے میں ایسی آراضیات کا جن میں آبپاشی کا اچھا انتظام ہے ہر ایک قطعۂ زمین کم از کم پانچ ایکڑ ہو۔ پنجاب میں ایک مدرسہ ثانوی کے لئے اس طرح کے قطعات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اگر اس قدر زمین فراہم کرنی ممکن نہ ہو تو کم از کم تین ایکڑ زمین فی مدرسہ حاصل کی جائے۔

اوقات تعلیم پیشہ ورانہ ہمیں خوف ہے کہ جتنے گھنٹے دست کاری کی تعلیم کے لئے تجویز کئے گئے ہیں اُتنے ہی تعلیم زراعت اور باغبانی کے لئے کافی نہ ہوں گے۔ طلبہ کو اوقات مدرسہ کے علاوہ صبح یا شام زائد وقت صرف کرنا پڑے گا۔ ہم دست کاری زراعت یا باغبانی کا تفصیلی نصاب بنانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ کام ہم ماہرین کی کمیٹی پر چھوڑتے ہیں۔

پیشہ ورانہ اور زرعی مدارس اور کالج۔ سرکاری مدارس میں تعلیم پیشہ ورانہ کے رائج کرنے کی وجہ سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں صنعتی اور زرعی اسکول اور کالج قائم کرنا ضروری ہوگا۔ تاکہ وہ طلبہ جن کا رجحان خاص طور پر اس طرف ہو مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی اعلیٰ تعلیم کو کسی صنعتی یا زرعی اسکول میں جاری رکھیں اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ:-

(الف) ہر ایک مستقر صوبہ میں کم از کم ایک صنعتی اور ایک زراعتی مدرسہ فوقانیہ

کھولا جائے اور اس میں ایک دار الاقامہ بھی ہو۔

(ب) بلدہ میں ایک صنعتی اور ایک زرعی کالج قائم کیا جائے۔

تعلیم مدرسین ہمارے مدارس میں پیشہ ورانہ تعلیم کے اسکیم کے ساتھ ہی ٹرینڈ مدرسین کی دستیابی کا مسئلہ ایک بڑی مشکل پیدا کر دے گا۔ فی الحال ہمارے یہاں ایسے مدرسین کمیاب ہیں جو پیشہ ورانہ تعلیم کے مختلف مضامین اور شعبوں کی تعلیم۔ اگر فوراً ہی ایسی تعلیم نصاب موجودہ میں داخل کر دی جائے تو دے سکیں۔ جاہل اور ان پڑھ کاریگروں سے (جو فی زمانہ نہایت آسانی سے مقرر کئے جا سکتے ہیں) ہماری درسگاہوں میں کام لینا مستقبل کی خرابیوں کا پیش خیمہ ہوگا اور اس وقت ہمیں اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

حقیقت میں ایسے مدرسین منتخب و مقرر کئے جائیں جنھوں نے کسی مسلّمہ درسگاہ میں تعلیم پائی ہو اور جنھیں اپنے ملک کی خدمت کرنے کا دلی شوق و ذوق ہو۔ مگر فی الحال ایسے مدرسین عنقا ہیں۔ اگر سرکار بنظر التفات ہمارے مذکورۂ ذیل تجاویز کو قبول فرمائے تو ہمیں اُمید ہے کہ بہت قلیل مدت میں ایسے تعلیم یافتہ مدرسین کی کافی تعداد بہدست ہو جائے گی۔

تجاویز (۱) نارمل کالج بلدہ و دیگر نارمل اسکولس ممالک محروسہ میں مدرسین کے لئے کسی نہ کسی کارآمد صنعت و پیشہ کی تعلیم کا انتظام فرمایا جائے۔

(۲) کچھ مدرسین کا انتخاب فرما کر انھیں کسی زرعی یا فنّی درسگاہ ہندوستان میں وظیفہ عطا فرما کر بغرض ٹریننگ بھیجا جائے۔

(۳) مدرسین کی مالی حالت میں اضافہ فرمایا جائے۔ تاکہ انہیں اپنے فرائض کے انجام دینے میں اطمینان قلب نصیب ہو سکے۔

پیشہ ورانہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مستقبل۔ یہاں ہم ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اُمیدوں اور اشغال کے متعلق اظہار خیال کرنا اپنا فرض تصور کرتے ہیں جو ان درسگاہوں سے بعد تکمیل نصاب پیشہ ورانہ کامیاب ہو کر نکلیں گے۔ ہمارے خیال میں اگر سرکار ان لوگوں کے لئے مختلف محکمہ جات مثلاً مال۔ زراعت۔ جنگلات۔ آرائش۔ برق۔ انجمن ہائے اتحادی اور صنعت و حرفت میں موزوں جائدادوں کا انتظام فرمائے تو نہایت مناسب ہوگا ایسے

لوگ جو بعد فراغت امتحان اگر پیشہ زراعت کو جاری رکھنا چاہتے ہوں تو انہیں پڑاؤ بنجر زمینات پٹہ وغیرہ پر دے جائیں اور انجمن ہائے اتحادی سے انہیں قرضہ مقررہ شرح سود سے کم پر عطا فرمایا جائے تاکہ ہل، بیج، مویشی وغیرہ کے خریدنے میں انہیں کافی سہولت میسر آسکے۔ ملک کے صاحب ثروت سرمایہ مشترکہ کے اصول پر فیکٹری اور کارخانے کھولیں اور ایسی تعلیم پائے ہوئے نوجوانوں کو اپنے یہاں متعین کریں۔

متفرق تجاویز:

تعلیم سائنس | مدارس میں پیشہ ورانہ تعلیم کے قیام کی سفارش کرنے اور اپنے خیالات کے اظہار کرنے سے ہمیں محض نااہل اور ان پڑھ دست کاروں کی تعداد ملک میں بڑھا دینا متصور نہیں ہے۔ بلکہ ہم ایسے دستکار پیش کرنے کی توقع کرتے ہیں جو قواعد سائنس اور زمانہ موجودہ کے علمی اور تجرباتی اصولوں کے موافق اپنے پیشوں میں جدت دکھانے اور ان کو ترقی کے اعلیٰ زینہ پر پہونچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سائنس کو ہمارے مدارس کے نصاب میں شریک کرکے اس کو خاص اہمیت دی جائے اور اس کو فرسٹ فارم ہی سے لازمی مضمون قرار دیا جائے تعلیم بالکل عملی اور خوش گوار ہو۔ فوقانی جماعتوں میں اس کی تعلیم پر خاص توجہ فرمائی جائے اور امتحانات اسکول ل[illegible] اور عثمانیہ میٹرک میں بطور ایک لازمی مضمون کے اس کو داخل فرما دیا جائے۔

صنعت وحرفت | کوئی ملک اس وقت تک ہرگز حقیقی ترقی نہیں کرسکتا جب تک اس ملک کی دست کاری میں فروغ نہ ہو۔ ہمارے ملک کی وہ دست کاریاں جواب ماندہ پڑتے پڑتے قریب قریب مردہ ہو رہی ہیں محض محکمہ تعلیمات کی جد و جہد سے اس وقت تک فروغ نہیں پاسکتیں جب تک محکمہ صنعت وحرفت ہمارے مدارس کے لئے کارآمد پیشوں اور حرفتوں کی ایک منضبط فہرست تیار کرکے ہمارا ہاتھ نہ بٹائے اور پیشہ ورانہ تعلیم کو مدارس میں رائج کرنے سے جو ہمارا مدعا ہے یعنی نوجوانوں کو دفتری ملازمتوں سے باز رکھنا وہ کبھی پورا نہیں ہوسکے گا۔

نسوانی پیشہ وری تعلیم | مدارس تحتانیہ کی لڑکیوں کو تقریب ویسی ہی تعلیم دی جا سکتی ہے جیسی کہ لڑکوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ مدارس وسطانیہ و فوقانیہ میں ان مضامین کی بھی تعلیم دی جائے جن کی بدولت لڑکیوں کو آئندہ زندگی میں سلیقہ شعار بی بیاں اور کار آمد مائیں بننے کا موقع مل سکے۔

لڑکیوں کیلئے مذکورۂ ذیل اشغال و مضامین بطور مثال کے پیش کئے جاتے ہیں۔ (۱) سوزن کاری (۲) پکوان (۳) امور خانہ داری (۴) چرخہ کاتنا (۵) کپڑے بننا (۶) کشیدہ و کارچوب نکالنا (۷) کپڑوں کی دھلائی و رنگریزی وغیرہ۔

عوام الناس کو پیشہ ورانہ تعلیم میں دلچسپی لینے کے قابل کیونکر بنایا جائے | ہمیں توقع ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم کے مدارس میں جاری کر دینے سے عوام الناس کو ضرور مسرت ہوگی اور وہ یقیناً ایسی تعلیم کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ لیکن فوری کامیابی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک مدرسین اور والدین میں اتحاد عمل نہ ہو لہذا مذکورہ بالا تجاویز کی تکمیل کے لئے ہم ذیل میں چند طریقے پیش کرتے ہیں:-

(۱) مدارس میں والدین کو مجتمع کیا جائے اور پیشہ ورانہ تعلیم کے فوائد سے انہیں آگاہ کیا جائے۔

(۲) سالانہ تقسیم انعامات کے موقع پر نمائش کا بھی انتظام کیا جائے اور بچوں کی دستکاری کے نمونے مشاہدہ کے لئے رکھے جائیں۔

(۳) اخبارات اور رسالوں میں پیشہ ورانہ تعلیم کے متعلق مضامین دیئے جائیں اور بلدہ و اضلاع میں کتب خانے کھول کر ان اخبارات اور رسالوں کی فراہمی کا انتظام کیا جائے۔

(۴) طلسمی فانوس کے ذریعہ پیشہ ورانہ لکچروں کی وضاحت کی جائے۔

(۵) جہاں جہاں ممکنہ صورت نظر آئے صنعتی عجائب خانے کھولے جائیں۔ ان عجائب خانوں میں غیر ممالک خصوصاً مشرقی صنعت کے بھی نمونے رکھے جائیں۔ ہمیں

متوقع ہے کہ ایسے عجائب خانے نہایت مفید وکارآمد ہوں گے۔ لہذا حتی الامکان انہیں خوب سجایا جائے۔ یہ عجائب خانے تجارتی نقطہ نظر سے بھی مفید ثابت ہوں گے کیوں کہ ان کے ذریعہ سے ان تمام لوگوں کے لئے جو بغرض تجارت وارد حیدرآباد ہوں گے نہایت مفید معلومات بہم پہونچیں گے۔

ضمیمہ

فہرست مضامین

مترجمہ:۔ تجمل حسین صاحب بی۔اے۔ علیگ
صدر مدرس مدرسہ سلطانیہ شاہ گنج

رپورٹ سب کمیٹی تعلیم ریاضی

نصاب اور درسی کُتب | سررشتہ نے جو نصاب مقرر کیا ہے اس کے لحاظ سے جماعت اوّل کے لڑکوں کو ایک لاکھ تک اعداد نویسی سکھائی جانی چاہیئے لیکن اتنے بڑے عدد کا تصور کم سن طلبہ کے ذہن نشین ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس لئے ان کے نصاب میں ایک ہزار تک کی گنتی رکھی جائے تو مناسب ہے۔

جماعت صغیر میں جمع کا قاعدہ سکھاتے وقت حاصل لانے کا طریقہ ترک کرنا چاہیئے اس جماعت میں جمع کا قاعدہ ٹھوس اشیاء کی مدد سے بتایا جائے البتہ پہلی جماعت میں حاصل کے اصول کی ابتدا کی جاسکتی ہے۔ دوم جماعت کے طلبہ کو پہاڑے (ضربی پیمانہ) سکھاتے وقت اساتذہ صاحبان کو چاہیئے کہ وہ اس اصول کو مدنظر رکھیں کہ ضرب دراصل کسی چیز کو بار بار جمع کرنا ہے جہاں تک ممکن ہو ان کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ طلبہ یہ پیمانے خود تیار کریں معلوم سے نامعلوم کی طرف رہبری کرنے کا اصول کام میں لانا چاہیئے۔ پہاڑوں کے یاد کرانے کی حسب ذیل ترتیب زیادہ معقول و مفید ہوگی۔

۲، ۱۰، ۵ - ۴، ۸ - ۳، ۶، ۹ - ۷ -

چونکہ درجہ چہارم کے مقررہ نصاب کی تکمیل ایک سال میں محال ہے اس لئے اس میں تخفیف ضروری ہے سود مفرد کا قاعدہ اس جماعت کے نصاب سے خارج ہونا چاہیئے مسطحات میں مستطیل و مربع کے رقبوں پر صرف عملی سوالات کرائے جائیں اور وہ بھی عملی طریقے پر (جہاں تک ممکن ہو) اور اسی موضوع پر مشکل اور پیچیدہ سوالات سے اجتناب کیا جائے۔

تلنگی جاننے والے طلبہ کے مفاد کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ سررشتہ کی طرف سے موزون تلنگی حسابی سلسلے تیار کروائے جائیں جن میں مقامی سکوں اور اوزان کا استعمال درج ہو۔

اکثر مدارس میں الجبرا کی ابتدا سکنڈ فارم ہی سے ہوتی ہے اس لئے اس مضمون کو اس جماعت کے نصاب میں شریک کیا جائے۔

علم ہندسہ کی ابتدا کے وقت مدرسین کو چاہیئے کہ وہ بچوں کو ابتدائی تعریفات جو اکثر ہر کتاب کے ابتدائی صفحات پر ہوتی ہیں یاد کرنے پر مجبور نہ کریں۔ کافی عملی کام کی مدد سے ریاضی کے اصول ٹھیک اور صحیح طور پر ذہن نشین ہو جانے کے بعد تعریفات کا استعمال بجا ہوگا۔

مختلف جماعتوں کے مدرسین کے کام میں باہمی تعلق۔ مناسب ہے کہ ہر اُستاد اسی کام کی مقدار کا جو وہ کسی جماعت میں ایک سال کے اندر ختم کرنے والا ہے صحیح صحیح اندازہ رکھتا ہو (ابتدائی جماعتوں میں خصوصاً) جو اصول کہ کسی ایک جماعت میں کسی خاص قاعدہ سے بتایا گیا ہے ضروری ہے کہ وہی قاعدہ اوپر کی جماعتوں میں بھی استعمال کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ طلبہ کے دماغوں میں اس خاص اصول کے متعلق انتشار پیدا ہو جائے گا، ایک اصول کی تفہیم کے مختلف طریقے اختیار کرنے سے اکثر نقصان ہوتا ہے، اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے صدر مدرس کو چاہیئے کہ اپنے مدرسہ کے مدرسین ریاضی کی ایک کمیٹی کا انعقاد کرکے اس میں مختلف جماعتوں کے نصاب پر گفتگو کر لی جائے اور ہر مدرس کے ذمہ مناسب کام تفویض کیا جائے اور اس کمیٹی میں یہ بھی تصفیہ کر لیا جائے کہ کون کون سے قاعدے خاص خاص جماعتوں میں کن طریقوں سے سکھائے جائیں گے۔ صدر مدرس صاحب کو چاہیئے کہ اسی کمیٹی میں جن اُمور کے متعلق جو کچھ بھی تصفیہ ہوا ہے اس کی پوری پوری پابندی کرانے پر مدرسین کو مجبور کرے۔

ریاضی کے مختلف شعبوں میں باہمی تعلق مناسب ہوگا اگر الجبرا، حساب، جیومیٹری، ہر جماعت میں تا حد امکان ایک ہی اُستاد کے تفویض کئے جائیں۔

الجبرا کے کام کی ابتدا حساب کی تعلیم سے ہونی چاہیئے اور استاد کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ الجبرا حساب کی تعمیم یافتہ صورت ہے۔

الجبرا کی ابتدا بالعموم علامتوں سے کی جاتی ہے جن سے طلبہ غیر مانوس ہوتے ہیں اس لئے اکثر گھبراتے ہیں اور پھر اُن کو ان علامتوں کی (مجہول مقداروں) انہیں بذریعہ تفویض سکھائی جاتی ہیں یہ طریقہ قابل احتراز ہے (بعض مدرسین نے اصول مساوات کو آسان اور عملی حسابی سوالات کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی اور اس طریقہ کو زیادہ مفید پایا ہے)۔

سکنڈ فارم میں عملی ہندسہ کی تعلیم میں تسہیل کی غرض سے جیومیٹریکل ڈرائینگ کا آغاز فرسٹ فارم کی ڈرائینگ جماعتوں میں ہونا چاہیئے۔اس طرح جیومیٹری کی تعلیم کو تعریفات کے ذریعہ سکھانے کا جو مُضر طریقہ رائج ہے اس کو چھوڑ دینے میں مدرسین کو مدد ملے گی۔

تعلیم کے طریقے۔ بہتر ہو گا کہ مدرسین ریاضی اُمور ذیل کو مدنظر رکھیں:۔

(۱) طلبہ کو انگلیوں یا نقطوں وغیرہ کی مدد سے گننے کی عادت سے باز رکھا جائے۔

(۲) جماعت صغیر و فرسٹ اسٹینڈرڈ میں پہاڑے سکھانے سے پیشتر مثل پہاڑوں کے جمع و تفریق کی زبانی مشق خوب کرائی جائے۔

(۳) یہ غیر ضروری ہے کہ مشترک ذو اضعاف اقل مشترک عاد اعظم بڑی بڑی کسور عام اور تحویلات وغیرہ پر زیادہ زور دیا جائے۔کیونکہ یہ چیزیں عملی نقطۂ نظر سے وقیع نہیں ہیں۔

(۴) کسور اعشاریہ کو عملی حیثیت سے سکھایا جائے اور چونکہ وہ کسور عام سے آسان ہوتی ہیں اس لئے اُن کا استعمال زیادہ ہونا چاہیئے۔

(۵) ریاضی کی تعلیم میں مادّی امثال کو ذہنی امثال پر مقدم رکھنا چاہیئے۔نظریہ کبھی پہلے نہ بتلایا جائے۔اس کی جگہ عملی کام کے بعد ہے۔

(۶) سوالات ایسے ہوں جو طلبہ کی عملی زندگی اور تجربے سے تعلق رکھتے ہو۔

(۷) صحت اور عجلت کو نصب العین بنائیں اور پیچیدہ سوالات کو حل کرنے کی قابلیت ایک ضمنی چیز قرار دی جائے۔

(۸) مضامین اس تسلسل سے نہ پڑھائیں جائیں جس سلسلہ سے نصاب میں درج ہیں اس کی ترتیب ضروری ردو بدل کے بعد اپنے طریقہ کار کے مطابق کر لی جائے۔

زبانی حساب:۔ زبانی سوالات کی مشق کو چھوڑ کر صرف تحریری سوالات پر زور

دینا ریاضی میں مُفید نہیں ہے۔

زبانی مشق ایسے سادہ سوالات پر مشتمل ہو جن کی کثیر تعداد تھوڑے سے وقت میں کی جا سکے۔ زبانی مشق ذیل کے طور پر کی جائے۔ مدرس زبانی مشق سے صرف چوتھی جماعت تک ہی کام نہ لے بلکہ اوس کے اوپر کی جماعتوں میں بھی جاری رہے۔ زبانی مشق صرف اسی خاص ساعت تک جو اس کے لئے ٹیم ٹیبل میں وقف ہو محدود نہ کی جائے بلکہ تحریری مشق کے ساتھ ساتھ جہاں ضرورت ہو اکثر و بیشتر ہوتی رہے۔

ریاضی کا تعلق عملی زندگی کے ساتھ ہم اپنے مدرسین سے لانگ مین گرین اینڈ کمپنی کی مطبوعہ "پریکٹیکل سیریز" (Practical Series. Longman) کی سفارش کرتے ہیں جن کو ذراسی ترمیم کے ساتھ بطور کتاب درسی کے استعمال کیا جا سکتا ہے مناسب ہو گا اگر سررشتہ ان کتب کو مقامی حالات کی مناسبت سے ترمیم کر کے شائع کرے۔

مقوے، چھڑیاں، فیتے، گز، گھڑیاں، باٹ، سکے، پیمانے وغیرہ عملی تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہیں اس لئے ہر مدرسہ میں ان اشیاء کا موجود رہنا مفید ہو گا۔

ہم سررشتہ سے سفارش کرتے ہیں کہ سرکاری امتحانات کے سوالات بھی روزانہ زندگی کے معاملات پر مبنی ہوں تاکہ ایسا مدرس بھی جس کا مقصد صرف طلباء کو امتحان میں کامیاب کروانا ہے اپنی تعلیم کو عملی بنانے پر مجبور ہو۔

مترجمہ

عبداللطیف بی ایس سی

مددگار مدرسہ فوقانیہ دار العلوم

رپورٹ سب کمیٹی تعلیم اردو

پروگرام کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۵ اپریل ۱۹۲۹ء میں یہ تصفیہ ہوا کہ انجمن اساتذہ بلدہ کے سالانہ کانفرنس کو زیادہ مفید بنانے کی غرض سے آئندہ سالانہ کانفرنس میں زیادہ علمی کام کئے جائیں۔ بنابراں یہ تحریک منظور ہوئی کہ مختلف مضامین کی تعلیم پر غور وخوض کرنے کے لئے کمیٹیاں مقرر کی جائیں منجملہ پانچ کمیٹیوں کے ایک کمیٹی تعلیم اردو پر مقرر ہوئی۔
اس کمیٹی کے لئے حسب ذیل حضرات ارکان منتخب ہوئے۔

(۱) ابوظفر عبد الواحد صاحب صدر نشین۔ لکچرار سٹی کالج۔
(۲) محمد حسام الدین صاحب فاضل۔ مولوی فاضل فوقانیہ عثمانیہ دار العلوم بلدہ۔
(۳) ثناء اللہ شریف صاحب ایم۔ اے فوقانیہ انگریزی چادر گھاٹ بلدہ۔
(۴) عبد الحق صاحب مولوی عالم وسطانیہ شاہ علی بنڈہ۔
(۵) عبد الغنی صاحب وسطانیہ قلعہ گولکنڈہ۔
(۶) امیر حسن صاحب فوقانیہ عثمانیہ نامپلی۔
(۷) ظفر احمد صاحب وسطانیہ عثمانیہ دار الشفاء۔
(۸) بہادر حسین صاحب وسطانیہ عثمانیہ چنچل گوڑہ۔
(۹) محمد حسین صاحب آزاد وسطانیہ عثمانیہ شاہ گنج۔
(۱۰) مظفر الدین صاحب وسطانیہ عثمانیہ گوشہ محل۔
(۱۱) سید محمد ناظر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد۔
(۱۲) شیو شنکر آئیر صاحب اے۔ دی ہائی اسکول بلارم بازار۔
(۱۳) احمد الدین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایل ایل بی۔ ریذیڈنسی بازار حیدرآباد۔
(۱۴) سید فخر الحسن ملاّ۔ بی۔ اے۔ بی ٹی (معتمد)۔
بعد میں مندرجۂ ذیل حضرات نامزد کئے گئے۔

(۱۵) عبدالسلام صاحب ۔ ناظر مدارس بیدر شریف ۔ (۱۶) احمد عبداللہ صاحب صدیقی ۔ لکچرار نظام کالج ۔

مسائل زیر غور اس کمیٹی کے زیر غور حسب ذیل مسائل تھے ۔

(۱) نصاب اُردو بحوالہ کتب درسی ۔ (۲) قابلیت اساتذہ ۔ (۳) معلمین اُردو با سناد علوم شرقیہ کی ٹریننگ کا انتظام (۴) طریقہ تعلیم (۵) عبارت خوانی (۶) مضمون تحریری و تقریری (۷) قواعد ۔

تعلیم اُردو کی اہمیت قبل اس کے کہ مقررہ مسائل پر بحث ہو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو پڑھانے کی ضرورت اور نصاب تعلیم میں اس کی اہمیت کے متعلق رائے ظاہر کی جائے ۔ اُردو زبان کم از کم بلدہ میں چند مدارس کو چھوڑ کر باقی تمام مدارس میں بحیثیت زبان مادری کے پڑھائی جاتی ہے ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خیالات و جذبات کو صاف صاف اور مناسب الفاظ میں ظاہر کرنے کی اور دوسروں کے خیالات و جذبات کو سمجھنے کی ضرورت ہمیشہ پڑتی رہتی ہے ۔ مدارس میں بھی جب سے جامعہ عثمانیہ کا قیام وجود میں آیا ہے اُردو ذریعہ تعلیم ہو گئی ہے ۔ اور تاریخ کے واقعات، جغرافیہ کے معلومات، ریاضی کے مسائل، اقلیدس کی شکلیں، غرض کہ ہر مضمون کو سمجھنے کے لئے اُردو کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس لئے بچوں کو اس قابل بنانا کہ وہ اُردو میں بآسانی اظہار مافی الضمیر کر سکیں اور دوسروں کے اظہار مافی الضمیر کو سمجھ سکیں ۔ نصاب تعلیم کی نہایت اہم ذمہ داری ہے ۔

علاوہ ازیں مدرسہ میں بچوں کا بہت قلیل وقت صرف ہوتا ہے اور بچہ مدرسہ کے باہر والے متعدد طاقتور اثرات سے متاثر ہوتا رہتا ہے ۔ بلکہ مدرسہ آنے کے پہلے ہی سے امکان اور محلہ کا اثر اس کی طرز گفتگو میں سرایت کر جاتا ہے نیز ایام طالب علمی میں بھی وہ مدرسہ کے باہر زیادہ بات چیت کرتا ہے اور اس کی لغات، تلفظ، لب و لہجہ پر ماحول کا اچھا یا بُرا اثر پڑتا رہتا ہے ۔ ان زبردست قوتوں کا مقابلہ ضروری ہے اور اس کے لئے تعلیم اُردو ناگزیر ہے ۔

اگر ادنی جماعتوں میں اُردو پڑھانے کا مقصد صرف یہی ہے کہ بچے اُردو میں صحیح بولیں اور صحیح لکھیں اور سمجھیں تو اعلیٰ جماعتوں میں جہاں غیر زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے اُردو دانی کی

ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ جو اپنی مادری زبان کی خوبیوں، کلام کی باریکیوں اور نزاکتوں اور عبارت آرائی کے حُسن و تاثیر سے کماحقہ، واقف نہ ہو وہ اجنبی شاعروں کی سحر کاریوں اور اجنبی ناثروں کی نادر بندشوں اور دلآویزیوں سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

نصاب اُردو بحوالہ کتب درسی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے آیا جو نصاب اُردو مدارس سرکارعالی میں رائج ہے وہ تعلیمی ضرورتیں پوری کرتا ہے اور جو کتب درسی مقرر ہیں وہ اُصولاً و عملاً مناسب و موزون ہیں یا نہیں؟ کمیٹی کو افسوس ہے کہ مضمون کی اہمیت کے باوجود، نصاب اُردو کی طرف جس قدر توجہ ہونا چاہیئے نہیں ہوئی۔ کسی مضمون کے نصاب کی سب سے بڑی ضرورت تدریجی ترقی ہے۔ کم از کم تحتانی جماعتوں میں اس ضرورت کا لحاظ لازمی ہے۔ ہر مصنف یا مؤلف اپنی کتاب کی تصنیف یا تالیف میں ایک خاص معیار مقرر لیتا ہے اور اگر ابتدائی جماعت سے انتہائی جماعت تک کی کتابیں ایک ہی مولف یا مصنف کی مصنفہ یا مولفہ ہوں تو عبارتی مشکلات درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہیں اور بچوں کے ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی پانے پر دشواریاں یکبارگی نہیں بڑھ جاتیں اور نہ دفعتہً غیر معمولی دقتوں کا سامنا کر کے طبیعت ہٹتی ہے۔ مگر مدارس سرکارعالی میں کسی ایک سلسلہ کی کتابیں مقرر نہیں ہیں۔ جماعت صغیر کے لئے محمد سجاد مرزا صاحب کا قاعدہ اول و دوم میں رائے گلاب سنگھ کی پہلی و دوسری کتاب، تیسرے و چوتھے درجہ میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی کتابیں، فرسٹ فارم میں کمک اُردو یا چمن زار اُردو۔ سکنڈ فارم و تھرڈ فارم میں احمد عارف صاحب کی خمخانہ اُردو و بزم اُردو داخل نصاب ہیں، اور میٹرک میں انجمن ترقی اُردو کی نصاب اُردو۔ دنیائے نصاب میں اس طوائف الملوکی کا اثر یہ ہے کہ جب لڑکے دوم سے سوم یا مڈل سے میٹرک میں جاتے ہیں تو نصاب کی اضافی مشکلات میں بے حد فرق ہو جاتا ہے جو بچوں کی ذہنی شگفتگی کو مٹا دیتا ہے اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ کم از کم ہر طبقہ میں ایک ہی سلسلہ کی کتابیں شریک نصاب کی جائیں۔

موجودہ نصاب کی دوسری خامی یہ ہے کہ مڈل تک کی تمام جماعتوں میں صرف

ایک ایک مولفہ کتاب درسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ عام طور سے دوسری کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں۔ صرف مقررہ درسی کتاب پڑھانے میں خرابی یہ ہے کہ چند دنوں کے بعد ان کی دلچسپی جاتی رہتی ہے اور ایک ہی کتاب کو لگاتار اور بار بار پڑھنے سے لڑکے اکتا جاتے ہیں علاوہ ازیں نصابی کتب میں اکثر اسباق عبارتوں کی دقت پیچیدگی کی وجہ سے منتخب ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو پڑھنے میں وہ روانی، شادمانی اور شگفتگی و انبساط نہیں پیدا ہوتا جو قصص و حکایات، افسانہ و تواریخ و سوانح کی سلیس و سیدھی سادی زبان سے پیدا ہوتا ہے۔ مدرس کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ بچوں کو ترغیب دیتے رہیں کہ غیر درسی مفید کتابیں اور بچوں کے اخبار مثلاً سعید، پھول، نونہال وغیرہ کا مطالعہ کرتے رہیں اونچی جماعتوں میں کتب خانہ سے کتابیں لے کر پڑھنے کی عادت ڈلوائی جائے۔ یہ اعتراض ایک حد تک بجا ہے کہ اردو زبان میں ایسی کتابیں کافی تعداد میں اور کافی موزونیت کی نہیں جو مدارس کی تعلیمی ضروریات پوری کرسکیں پھر بھی تحتانی جماعتوں کے لئے دار الاشاعت پنجاب کے سلسلے اور اعلیٰ جماعتوں کے لئے پریم چند اور سدرشن، ظفر عمر اور حکیم احمد شجاع اور وکیل و صوفی بک ڈپو وغیرہ کے اخلاقی افسانے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

اسباق کتب میں، خصوصاً نیچی جماعتوں میں چند خوبیاں ہونی ضروری ہیں۔ سبق دلچسپ اور نصیحت آمیز ہو اور معقولات کو محسوسات کے ذریعہ ظاہر کیا جائے مثلاً نیکی و بدی کے مضمون کو نیک و بد کی حکایت سے ظاہر کیا جائے اور واقعات بچوں کی سمجھ اور گرفت سے باہر تو نہ ہوں لیکن اتنے معمولی بھی نہ ہوں جو ان کے اشتیاق اور زیادہ جاننے کے شوق کو نہ ابھاریں۔ کچھ ایسے قصے ہوں جو بچوں کو تخیل کی دنیا میں اڑا لے جائیں مثلاً پریوں وغیرہ کے قصے۔ موجودہ درسی کتابوں میں چند مضرت رساں فروگذاشتیں یہ ہیں:۔

(۱) ابتدائی کتابوں میں وہ نظمیں اور قصے شامل نہیں جو بڑی بوڑھیاں بچوں کو سناتی ہیں۔ ان قصوں کا اثر محتاج توضیح نہیں۔ (۲) درمیانی اور انتہائی کتابوں میں اساتذہ کا کلام ترک کر دیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ جدید مذاق غزلوں اور قصیدوں سے متنفر ہے لیکن اساتذہ کے کلام میں لطافت و شیرینی، محاوروں کی بے ساختگی اور پاکیزگی،

بندشوں کی چستی و ندرت، سادگی، سلاست و فصاحت، خوبی ادا اور حسن بیان سے
جو اصول خزانے موجود ہیں وہ دورِ جدید کی قافیہ پیمائیوں میں نایاب ہیں۔ اس فروگذاشت
سے موجودہ پشت کے ادبی ذوق اور جمالیاتی حواس کو بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ (۳) شروع
سے آخر تک مکالموں یا چھوٹے اخلاقی و تاریخی ڈراموں کا وجود ہی نہیں بچوں کو مکالموں
اور ڈراموں سے جو قلبی لگاؤ ہوتا ہے وہ روشن ہے۔[1]

(۴) بالعموم اردو کی کتابیں شمالی ہند کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں اس لئے ان کے
موضوع غیر ملکی ہیں ایسے اسباق کے پڑھنے میں دکھنی طلباء کو سخت دشواریاں پیش آتی ہیں
اور وہ اکثر شمالی الفاظ کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے حالانکہ اگر اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے دکھنی
لفظ استعمال کیا جائے تو سبق کی مشکلات کم ہو جائیں (۵) کتابیں سوائے سجاد مرزا صاحب
کے قاعدہ اور گلاب سنگھ کی کتابوں کے، عالم طور سے بہت خراب چھپی ہیں خط بھدا اور چھاپا
گندہ ہے کتابوں میں جو تصویریں ہیں وہ خوبصورت نہیں۔ (۶) ترتیب خصوصاً طبقہ وسطانیہ
کے کتابوں کی، اصول نفسیات کے قطعی منافی ہے۔ نثر و نظم اور مکالمے کے اسباق ایک
دوسرے کے بعد کتاب بھر میں تقسیم رہیں (۷) اکثر کتابوں کا حجم اتنا زیادہ ہے کہ اگر اصول تعلیم کے
مطابق تعلیم دی جائے تو وہ ختم نہیں ہو سکتیں اور اگر ان کو ختم کیا جائے تو طریقۂ تعلیم کا
خون ہو جاتا ہے اس لئے کتابوں کے انتخاب میں حجم کی مناسبت کا لحاظ کیا جائے (۸) بعض
کتابوں میں اشارات اسباق، اسباق کے ساتھ دئے گئے ہیں یہ طریقہ نامناسب ہے۔

معلمین اردو و اساتذہ مشرقیہ کی ٹریننگ اردو کی تعلیم عام طور سے مشرقی سند یافتہ حضرات
کے ذمہ ہے جن کو جدید طریقۂ تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا جب کہ علوم
مشرقیہ کے اسناد والوں کو مغربی ڈگری یافتہ حضرات کے مساوی تسلیم کیا جا چکا ہے تو جس
طرح علوم مغربیہ کے لئے ٹریننگ کا انتظام ہے اسی طرح علوم مشرقیہ کے لئے بھی ٹریننگ کا
انتظام کیا جائے اردو کی تعلیم سے لڑکوں کو خاطر خواہ فائدہ پہونچانے کے لئے بے حد
ضروری ہے کہ جو اساتذہ سند یافتہ علوم مشرقیہ ہیں ان کو ٹریننگ حاصل کرنے کے موقع

---

[1] اگر ان مکالموں اور ڈراموں کی عملی مشق کرائی جائے تو زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ ٹیچر

بہم پہونچائے جائیں۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ عثمانیہ ٹریننگ کالج میں میٹرک کے ساتھ منشی و مولوی و منشی عالم و دبیر اور ایف اے کے ساتھ مولوی عالم اور منشی فاضل کو تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے [1]۔

چونکہ عثمانیہ ٹریننگ کالج میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے اس لئے مشرقی اسناد والوں کو حصول تعلیم میں کوئی دشواری نہ ہوگی اور یہ اساتذہ بآسانی مغربی سند داروں کے ہم سبق رہ سکیں گے۔ مگر زبان انگریزی سے ناواقفیت کیوجہ سے ان کے ساتھ یہ رعایت ہو کہ میٹرک ٹریننگ کے مضامین اختیاری میں فارسی کا بھی اضافہ کیا جائے تاکہ انگریزی کی جگہ فارسی پڑھ سکیں اور ایف اے ٹریننگ میں لازمی انگریزی کی جگہ پر ان کو تاریخ ادب اُردو کی تعلیم دی جائے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام اور امتحانات علوم مشرقیہ کی مسدودی کی وجہ سے اب علوم مشرقیہ والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کا خوف نہیں۔ جو اساتذہ کہ اب سررشتہ میں ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں اور اکثر نے تو ملازمت میں کافی مدت گذار دی ہے اس خیال سے کہ ان کو آئندہ کوئی ترقی کا موقع نہیں ہے کمیٹی کی سفارش ہے کہ سندیافتگان علوم مشرقیہ کو ۳۵ سال کی بجائے ۴۰ سال کی عمر تک داخل ٹریننگ کیا جائے اور جو لوگ کہ ۴۰ سال سے متجاوز ہیں اور سررشتہ تعلیمات میں کم از کم ۱۵ سال سے ملازم ہیں ان کو ٹریننگ سے مستثنیٰ اور ٹرینڈ کے مساوی قرار دیا جائے۔

طریقہ تعلیم | جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے معلمیں اُردو کو اپنے زمانہ طالب علمی میں ایسے مکتبوں میں تحصیل علم کرنے کا اتفاق ہوا ہے جہاں قدیم طریقہ پر تعلیم دی جاتی ہے اس لئے ان کو جدید اصول و عمل تعلیم سے واقف ہونے کا موقعہ نہیں ملا ان کی ہدایت و رہبری

---

[1] اب چونکہ جامعہ عثمانیہ نے شعبہ تعلیمات کا افتتاح کر دیا ہے جو بی ٹی کی تعلیم دے گا اس لئے یہ مشورہ بے موقع نہ ہوگا کہ بی ٹی میں بی اے و ایم اے کے ساتھ مولوی فاضل اور مولوی کامل کو بھی تعلیم دی جائے۔ جہاں تک نصاب کا تعلق ہے یہ باطمینان کہا جاسکتا ہے کہ فاضل و کامل حضرات کو تعلیم بی ٹی میں سوائے زبان انگریزی کے اور کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ یہ دشواری ان کے لئے انگریزی کو اختیاری مضمون بنا کر بآسانی رفع ہوسکتی ہے۔ — ایڈیٹر

کے لئے چند ضروری اصول تعلیم بتائے جاتے ہیں۔

تعلیم اُردو کو موثر و کامیاب بنانے کے لئے کمیٹی کا خیال ہے کہ ہر معلم اُردو کو مذکورۂ تحت تعلیمی اصول پر سختی سے نگاہ رکھنا چاہیئے دوسرے مدرسین کی طرح معلمین اُردو بھی بالعموم تعلیمی گھنٹہ کا زیادہ حصہ خود بولنے میں صرف کرتے ہیں اور بچوں کو بولنے کا کم موقع دیتے ہیں یہ طریقہ زیادہ کارآمد نہیں ہے کیونکہ اس طرح نہ صرف معلمین تکان و ضعف دماغی کا شکار ہوتے ہیں بلکہ لڑکے بھی تعلیم سے پورا فائدہ نہیں حاصل کرتے جب تک قوت اظہار نہ پیدا ہو اس وقت تک بچوں کے ذہنی ارتسامات نقش برآب رہتے ہیں۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو مشکلات خود بچوں سے حل کرائی جائیں اور بچوں کو ہمیشہ لقمہ تر کھانے کا عادی نہ بنایا جائے۔ سبق کو واضح کرنے کے لئے مثالوں تصویروں اور خاکوں کا استعمال بے حد ضروری ہے سوالات کی اہمیت بھی عام طور سے محسوس نہیں کی جاتی اور اکثر اساتذہ سوال پوچھنے کی بجائے سرگرم بیان رہتے ہیں۔ اچھے سوال کی پہچان یہ ہے کہ بچوں میں غور و فکر اور باریک بینی کی خو پیدا ہو۔ نئے سبق کے لئے لڑکوں کو تیار کرنے اور پڑھائے ہوئے سبق کا اعادہ کرانے کے واسطے سوالات بیحد ضروری ہیں۔ سوالات کا صحیح استعمال یہ ہے کہ کسی ایک لڑکے کو پہلے ہی سے نامزد نہ کیا جائے بلکہ پوری جماعت سے سوال کرنے کے بعد کچھ مہلت دی جائے تاکہ تمام لڑکے جواب سوچیں اور تب کسی کو جواب دینے کے لئے پکارا جائے۔ سوالات کو نئے میں سلسلہ کا لحاظ نہ رکھا جائے بلکہ اگلی اور پچھلی بنچوں والے، تیز و کمزور ہر لڑکے سے جواب مانگا جائے۔ تختۂ سیاہ کا استعمال بھی توضیح و تمثیل خاکہ کشی اور خلاصہ نویسی کے لئے یکساں طور پر لازمی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ارتسامات نہ صرف کان بلکہ آنکھوں کی راہ سے بھی ذہن تک پہونچائے جائیں۔

اُردو کی تعلیم میں دوسرے مضامین سے بھی مدد لی جائے۔ مثلاً جو سبق کسی ملک یا شہر کے متعلق ہے اس میں نقشہ استعمال کیا جائے۔

عبارت خوانی تقریباً تین سال کی عمر سے بچے اپنی لغات اور خیالات میں اضافہ کرنے لگتے ہیں اور جب چار یا پانچ سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں

الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہوتا ہے اس لئے مدرسہ میں بے تکلف گفتگو کے موقع دینا ہر معلم اُردو کا فریضہ ہے۔ یہ گفتگو عموماً روزمرہ کی باتوں کے متعلق ہوگی لیکن ہمیشہ یہ خیال رہے کہ موضوع گفتگو بدلتا رہے تاکہ بچوں کا جی نہ اکتا جائے۔ تصویریں اور مرقعے بالعموم گفتگو کی ترغیب دیتے ہیں ہر حال میں بچوں کو اپنے گھر کی زبان میں گفتگو کرنے دیا جائے گفتگو کا خاص مقصد یہ ہے کہ بچوں کی زبان میں سلاست اور روانی پیدا ہو اور جب تک زبان میں روانی نہ پیدا ہو اور ان کا ذخیرہ الفاظ کافی نہ ہو جب تک بچوں کی سمجھ اتنی کافی نہ ہو کہ وہ آواز کے فرق اور یکسانیت میں تمیز کر سکیں اور جب تک ان کو اتنے قصے کہانیاں نہ سنائی جائیں کہ وہ خود قصہ پڑھنے کے لئے بیتاب و مضطرب ہوں اس وقت تک ان کو عبارت خوانی نہ شروع کرائی جائے۔

ابتدائی جماعتوں میں عبارت خوانی سکھانے کے لئے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں مثلاً طریق ہجی، طریق صوتی۔ طریق دیکھو اور کہو وغیرہ ان میں سے کوئی طریقہ عیب سے خالی نہیں تمام طریقوں میں سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جس میں بچے لفظوں کی شکل اور اس لفظ سے جو شئے مراد ہے اس میں یا اس کی تصویر میں ربط پیدا کر سکیں جب ان کو الفاظ کی خاص تعداد یاد ہو جائے اس وقت ان کو کتاب دی جائے کتاب میں ہر شکل لفظ کے معنی بتانے کی ضرورت نہیں تھوڑے ہی عرصہ میں الفاظ مکرر سہ کرر آتے ہیں اور بچے خود ان کے معنی نکال لیتے ہیں۔

مدارس میں اکثر جماعتیں بڑی ہوتی اور کثرت تعداد کی وجہ سے ہر لڑکے کو فرداً فرداً پڑھانا مشکل ہوتا ہے اس لئے اجتماعی تعلیم دینے میں سہولت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اجتماعی کتاب خوانی میں بڑا نقص یہ ہے کہ کمزور بچے اپنے ساتھیوں کے ساتھ الفاظ دہراتے رہتے ہیں اور عبارت کی طرف توجہ نہیں کرتے اور نہ اس کو سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ چھوٹی جماعتوں میں چند ہی روز میں کچھ ایسے لڑکے نکلیں گے جو تیز اور صحیح پڑھ سکتے ہیں اور بعض ایسے جو ان کے ساتھ نہیں چل سکتے اس لئے ان کو علٰحدہ علٰحدہ ٹولیوں میں تقسیم کر دینا مناسب ہوگا۔ تیز بچے اپنا سبق خود نکال لیں گے اور کمزور بچوں پر استاد زیادہ توجہ کر سکے گا۔ تیز لڑکوں سے کمزور لڑکوں کو مدد دلوانے میں بھی دونوں کا فائدہ ہوتا ہے۔

شروع میں بلند آواز سے پڑھنا زیادہ ضروری ہے تاکہ تلفظ اور مخارج درست ہو جائیں اور پڑھنے میں روانی پیدا ہو مدرسین عام طور سے عبارت خوانی کے وقت اپنی کتاب دیکھتے رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرأت کے سقم نظر انداز ہو جاتے ہیں ابتدا ہی سے بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ الفاظ کی بجائے پورے جملوں اور پوری عبارتوں کا مفہوم سمجھ سکیں اس غرض کے لئے خاموش مطالعہ بحد مفید ہے اس میں ایک خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ بچے بہت سی عبارت اُڑا جاتے ہیں لیکن فائدہ کے مقابلہ میں یہ خطرہ ہیچ ہے۔ کمیٹی کی رائے میں خاموش مطالعہ جماعت دوم سے بآسانی شروع کیا جا سکتا ہے۔

اونچی جماعتوں میں بلند خوانی تلفظ اور لہجہ سدھارنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ ادبی لطافتوں سے لذت اندوز ہونے کے لئے زور سے پڑھنا گا ہے گا ہے ضروری ہے اشعار کو ہمیشہ بلند آواز سے پڑھنا چاہیئے ورنہ لڑکے کلام کے ترنم اور بندش کا لطف نہ اُٹھا سکیں گے عام طور سے خاموش خوانی اعلیٰ جماعتوں کی خصوصیت ہونی چاہیئے۔

مضمون تحریری و تقریری جب سے بچہ بولنے لگتا ہے اسی وقت سے وہ مضمون سازی شروع کر دیتا ہے لیکن اُس کا مضمون یعنی گفتگو غیر مربوط و غیر مسلسل ہوتی ہے لہٰذا ابتدائی زمانہ کی تعلیم مضمون سازی کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ لڑکے مسلسل اور مربوط گفتگو کر سکیں۔ اس منزل میں بچوں سے توقع کی جاتی ہے کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا۔ سنا یا پڑھا ہے اس کو بیان کر سکیں گے۔

طریقہ تعلیم میں طریق فطرت کی پابندی کی جائے یعنی مضمون سازی تقریری ہو۔ البتہ جب بچے روانی اور صحت کے ساتھ لکھنے لگیں اس وقت تحریری مضمون سازی شروع کی جائے۔ ابتدائی جماعتوں میں تحریری مضامین زبانی مشقوں پر مبنی ہوں۔ مضمون تقریری و تحریری میں روزمرّہ واقعات و مناظرہ کا بیان۔ تصاویر کی تشریح قصّوں کا گڑھنا اور دہرانا وغیرہ داخل ہو جہاں تک ممکن ہو عنوانات حسی ہوں اور لڑکوں کے دائرہ علم سے باہر نہ ہوں۔

زیادہ عمر والے لڑکوں کے لئے بھی تقریری مضمون سازی کی ضرورت ہے اس مرحلۂ

مکالمے اور مختصر تقریریں بے حد مفید ہوتی ہیں۔ لیکن ترقی عمر کے ساتھ تحریری مضامین میں زیادہ وقت صرف کیا جائے۔

طبقۂ وسطانیہ میں، خصوصاً مدارس بلدہ میں جہاں تعداد طلبا کی زیادتی کی وجہ سے انفرادی توجہ آسان نہیں تحریری مضمون سازی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس طبقہ میں بھی عنوانات غیر حسی نہ ہوں بلکہ روزمرہ مشاہدات سے متعلق ہوں۔ اسباق کی خلاصہ نویسی بھی نفع بخش ہوتی ہے۔

طبقہ فوقانیہ میں مضامین بالکلیہ تحریری اور عنوانات تخیلاتی اور تنقیدی ہوں گے طلبہ کی مادری زبان اردو ہے میٹریکیولیشن میں اپنی زبان میں ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی قابلیت آجاتی ہے اگر کوئی شاعر مدرس ہو تو قافیہ بندی بھی دلچسپ اور فائدہ مند ریاضت ہوگی۔

مدرسوں میں عام طور سے چند مخصوص عنوانات پر مضمون لکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے اور میٹرک کے طلبا بھی روزانہ زندگی کے ضروری معاملات کے متعلق ایک حرف نہیں لکھ سکتے۔ کمیٹی کی سفارش ہے کہ کم از کم طبقہ فوقانیہ میں تمسکات ہبہ نامے رہن نامے بیعنامے۔ کرایہ نامے۔ فرمایش نامے۔ منی آرڈر۔ اور اضلاع کے مدارس میں دستاویز پٹہ و لگان وغیرہ لکھنے کی مشق کرائی جائے۔

طبقۂ ثانویہ بلکہ تحتانی طبقہ کی بالائی جماعتوں ہی میں بچے بحث و مباحثہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اس لئے جماعت کی تعلیم مضمون نگاری کے علاوہ ہر اسکول میں بچوں کی انجمن ہائے مذاکرہ ہوں جہاں وہ اپنے خیالات کا اظہار اور تبادلہ کر سکیں۔ شروع شروع میں بچے مضامین لکھ کر پڑھیں گے لیکن رفتہ رفتہ جھجک نکل جاتی ہے اور وہ زبانی تقریر کرنے لگتے ہیں۔ مضمون نگاری کے ضمن میں نمونہ اور اصلاح کا سوال پیدا ہوتا ہے بچوں کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ خود مضمون لکھ سکیں بلکہ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ مشہور انشا پردازوں نے جو عمدہ مضامین لکھے ہیں ان سے بھی واقف ہوں اس لئے مصنفین کے وہ مقالے جن میں زبان و بیان کی خوبیاں ہیں وقتاً فوقتاً بچوں کو سنائے جائیں۔

اصلاح کے متعلق کوئی حکم لگانا عبث ہے۔ اصولاً بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام بچوں کی کاپیاں فرداً فرداً بچوں کی موجودگی میں صحیح کی جائیں۔ لیکن بدقسمتی سے جماعتیں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے اس لئے جو غلطیاں کئی بچوں میں عام ہوں ان کو ایک ساتھ سمجھانا بہتر ہے اور خاص غلطیوں کو انفرادی طور پر سمجھایا جائے مدرس اصلاح کا خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کرے لیکن مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچے اپنی غلطیوں کو سمجھیں اور خود درست کرنا سیکھیں۔ یہ مقصد اُس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک کہ مدرس غلطیوں کی اہمیت نہ جتلائے اور کاپیوں پر حاشیہ نہ چڑھائے۔ قواعد اور ہجے کے غلطیوں ہی سے مضمون کی اچھائی یا بُرائی کو نہ جانچنا چاہیے نفس مضمون کی مناسبت وصحت، ترتیب خیالات اور طرز ادا کا لحاظ بھی لازم ہے۔

قواعد قواعد اُردو کی تعلیم اب تک نہایت خشک وغیر دلچسپ رہی ہے۔ عربی قواعد کے تتبع میں اس کو بھی ریاضت ذہنیہ کی خاطر پڑھاتے ہیں۔ اُردو زبان کی قواعد نہ تو اس قدر پیچیدہ ہے اور نہ اس میں زیادہ گردانیں ہیں اس واسطے سبق کے سبق فعلوں کی گردان اور کلموں کے اقسام کی تعلیم میں صرف کرنا نارو ا ہے۔

تعریفات زبانی رٹا دینے کا طریقہ قطعی نامناسب ہے۔ دوسرے مضامین کی بنت تعلیم قواعد میں جزو سے کل مستنبط کرنے کا اصول زیادہ کارآمد ہے۔ بچوں کے لئے تعریفات جاننے سے زیادہ یہ مفید ہے کہ وہ جملہ میں الفاظ کے باہمی تعلق کو جانیں۔

موجودہ طریقہ تعلیم میں اُردو قواعد کو اُردو کتاب سے الگ کرکے پڑھایا جاتا ہے حالانکہ دونوں کو لازم وملزوم رہنا چاہیے قواعد کا سبق ہمیشہ درسی کتاب کے ساتھ وابستہ رہے۔ تختہ سیاہ کا استعمال بھی معلم قواعد کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ قواعد کی عمدہ تعلیم کا انحصار مثالوں اور تجربوں پر ہے جو صرف تختہ سیاہ کے ذریعہ ذہن نشین کی جا سکتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مادری زبان کی قواعد پڑھانا ہی فضول ہے۔ ان کا قول ہے کہ قواعد جانے بغیر لڑکے صحیح اُردو بول سکتے ہیں۔ یہ دلیل کسی حد تک

صحیح ہے۔ حقیقت میں قواعد زبان کے تابع ہے نہ کہ برعکس۔ لیکن صحیح زبان بے ساختہ بولنے اور صحیح زبان سمجھ کر بولنے میں فرق ہے۔ گو بغیر قواعد کے علم کے صحیح زبان بولنا ممکن ہے لیکن رموز زبان سے واقفیت اطمینان اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے۔ مزید برآں حیدرآباد میں کتابی اور گھر کی زبان میں تفاوت ہے اس لئے قواعد کی تعلیم یہاں خاص طور پر ضروری ہے

اگرچہ ثانوی طبقوں میں زبان کی باریکیاں تلمیحات، استعارات، رموز اوقاف، صنائع بدائع کی تفہیم کے لئے قواعد کی تعلیم ضروری ہے مگر کمیٹی کی قطعی رائے ہے کہ تحتانی جماعتوں میں قواعد کی تعلیم مطلق نہ دی جائے۔

اپنی تحقیق و تفتیش کی بنا پر کمیٹی کی متفقہ رائے ہے کہ اردو تعلیم کی موجودہ حالت ناقابل اطمینان ہے اور جب تک زاویۂ نگاہ میں تغیر اور طرز تعلیم میں تبدیلی نہ ہو اس وقت تک اردو کی تعلیم سے جو نفع ہونا چاہیئے وہ نہ ہوگا۔

تعلیم ورزش جسمانی پر انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد کی مقرر کردہ سب کمیٹی کی تجاویز

مقدمہ (۱) اس عام مسلمہ خواہش کا لحاظ کرتے ہوئے کہ تعلیم ورزش جسمانی کو (اوس کے وسیع معنوں میں) تمام شاہی اور امدادی مدارس کے نصاب میں مناسب جگہ دینے اور اس کا خیال کرتے ہوئے کہ بلدہ حیدرآباد میں ایسی تعلیم ورزش جسمانی کے لئے موجودہ انتظام ناقص اور ناکافی ہے ۱۳۳۹ف میں ایک ایسی کمیٹی منعقد کی جائے جو بلدہ حیدرآباد اور ہر ضلع کے مدارس کے مناسب جبری تعلیم ورزش جسمانی کا اسکیم بنا سکے۔

(۲) اس کمیٹی کے غور و خوض کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لئے صدر مہتمم تعلیمات مدارس متعلقہ کی رپورٹ میں پیش کریں جن میں ان باتوں پر روشنی

ڈالی جائے۔

(الف) تعلیم ورزش جسمانی کے لئے موجودہ سہولتیں کیا ہیں؟

(ب) کہاں تک افسران مجاز یا حکام مدرسہ ان کا معقول استعمال کر رہے ہیں؟

(ج) مدرسہ میں طلبہ کا کونسا حصہ موجودہ سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے؟

(عموماً یہ محسوس کیا گیا ہے کہ مدرسوں کے صدر صاحبان اس کا لحاظ نہیں رکھتے کہ اکثر کھیلوں کے لئے جو ورزشی حیثیت سے بلند پایہ ہیں مثلاً امریکن کھیل۔ زیادہ جگہ درکار نہیں ہوتی لہذا جتنی جگہ انہیں مل سکتی ہے اس سے بدرجۂ اتم فائدہ نہیں اٹھا سکتے)

(۳) اس مجوزہ کمیٹی کے روبرو تعلیم ورزش جسمانی کے متعلق تجربات حتی الامکان پیش کئے جائیں مثلاً (الف) ہندوستان کے دیگر حصص کے (ب) دوسرے ممالک خصوصاً جاپان، امریکہ، برطانیۂ عظمیٰ، جرمنی، سویڈن، اور ڈنمارک کے

(۴) تعلیم ورزش جسمانی کا کتنا ہی صحیح طریقہ کیوں نہ ہو معائنہ طبی سے بے تعلق نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے اور دیگر معمولی تجارب کے ساتھ ساتھ طلبہ کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جائے۔

طبقۂ (اوّل) وہ طلبہ جو چھوٹے اور بڑے کھیل، اسپورٹس اور جمناسٹک کی جماعتوں کے لئے (جہاں ایسی سہولتیں موجود ہیں) موزوں ہوں۔

طبقۂ (دوم) وہ طلبہ جو اس قدر سخت ورزش کے متحمل نہ ہوں۔

طبقۂ (سوم) وہ طلبہ جو صرف جسم کی وضع اور حرکت کے قاعدے سیکھنے۔ سانس لینے۔ خم ہونے اور ورزش مصلح کرنے کے قابل ہوں۔

طبقۂ (چہارم) وہ طلبہ جو ورزش جسمانی کے کسی شعبہ کی شرکت سے دامی یا عارضی طور پر ممنوع کر دئے گئے ہوں۔

اس صورت میں طلبہ کے لئے طبقۂ (سوم) سے (دوم) میں اور (دوم) سے (اول) میں ترقی کرنے کی ترغیب ہوگی کیونکہ اعلیٰ معیار کی شقوں میں دلچسپی کا

عنصر زیادہ ہونے کی وجہ سے لڑکوں کی کھیل کی تحریک طبعی نسبتاً زیادہ ہوگی۔

(۵) سررشتہ تعلیمات تعلیم ورزش جسمانی کی غرض سے ایک مدرسہ قائم کرنے کی تدابیر اختیار کرے اور جب تک یہ عمل میں نہ لائی جائیں ٹیچرس ٹریننگ کالج بلدہ میں خاص انتظام ایسے اساتذہ اور ڈرل ماسٹروں کی تعلیم کا ہو جو تعلیم ورزش جسمانی دینے یا نگرانی کرنے کے لئے منتخب ہوسکیں۔

ذیلی۔ (۶) ہفتہ میں ایک مرتبہ بلدہ میں صدر مدرس نظام الاوقات مدرسہ میں لڑکوں کو اپنے اپنے حلقوں کے مطابق ورزش کرنے کی بالالتزام گنجائش رکھیں اور ہفتہ میں کم از کم تین مرتبہ بلا لحاظ طبقہ جات اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ ورزش کرنے کا موقع دیں۔ متذکرہ اولی کو دائرہ امکان میں لانے کے لئے بہتر ہوگا کہ چھ ایام کارگذاری میں سے آدھا دن تعلیم ورزش جسمانی کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔

(۷) محکمۂ فینانس سے درخواست کی جائے کہ تعلیم ورزش جسمانی کے لئے رقوم متوالی وغیر متوالی منظور کیا کرے رقم متذکرہ اولی برائے معائنہ طبی اور تعلیم المعلمین ورزش جسمانی کے اخراجات اور معلمین ورزش جسمانی کی تنخواہیں اور بھتہ (جب وہ فارغ التحصیل ہوجائیں) اور ضروری اخراجات عملہ ہو۔ اور رقم آخر الذکر سامان ورزش خریدنے کھیل کے لئے زمین تیار کرنے ڈرل کے لئے سائبان اور تیرنے کے حوض بنانے میں صرف کی جائے۔

(۸) صدر مہتمم ورزش جسمانی کو کم از کم چار بلکہ ممکن ہو تو چھ مددگار دئے جائیں جنکی تنخواہ معقول ہو۔ یہ نہ صرف تعلیم ورزش جسمانی کے ماہر ہوں بلکہ اہم کھیلوں میں سے کسی ایک کے نہایت تجربہ کار ترجمان ایسے مددگار گریجویٹ ہوں گے اور تقاضائے سن کی وجہ سے جب وہ اپنے چست و چالاک باقی نہ رہیں کہ خود کسی کھیل میں حصہ لے سکیں تو مدرسہ تعلیم المعلمین کے نصاب تجدیدی کے حصول کے بعد انہیں تعلیمی سلسلہ میں منسلک کر دیا جائے۔

(۹) ایک بڑی تعداد فارغ التحصیل معلمین ورزش جسمانی کی جو پرانے فنیش کے ڈرل ماسٹروں کی جگہ بھرتی کیے جائیں اپنی اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے مختلف گریڈ پر منقسم ہو۔ (مثلاً گریجویٹ۔ انٹرمیڈیٹ۔ میٹرک) جب وہ اتنے معمر ہو جائیں کہ تعلیم ورزش جسمانی کے قابل نہ رہ سکیں تو مدرسہ تعلیم المعلمین کے نصاب تجدیدی کے حصول کے بعد انہیں تعلیمی سلسلہ میں منسلک کر دیا جائے

(۱۰) ممکن ہے کہ موازنہ میں معلمین ورزش جسمانی کی کافی تعداد تمام مدارس کے لئے مہیا کرنے کی گنجائش نہ نکلے۔ ایسی صورت میں سررشتہ کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے نوجوان اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کو ترغیب دلائے کہ جزوی تعلیم ورزش جسمانی ہی حاصل کر لیں۔ انہیں اس کے لئے تھوڑا سا معاوضہ اس وقت تک دیا جائے جب تک کہ ان کی جوانی ان کا ساتھ دے اور خود عملی رہبری کرتے رہیں۔

(۱۱) حسب تجاویز نمبر (۸ تا ۱۰) متذکرۂ صدر سررشتہ میں رفتہ رفتہ ایک تعداد صدر مدرسین اور مددگاروں کی ایسی ہو جائے گی۔ جو صدر مہتمم ورزش جسمانی اور اس کے مددگاروں کا ہاتھ بٹائیں گے اور مدارس میں تعلیم ورزش جسمانی آپ اپنی نظیر رہے گی۔

(۱۲) منتہائے مقصود یہ ہو کہ ہر مدرسہ میں ایک کھیل کا میدان اور ایک فارغ التحصیل معلم ورزش جسمانی رہے۔ اس امر پر بھی غور کیا گیا ہے کہ حصول مقصد کے لئے ایک مدت درکار ہو گی لیکن سردست کوئی مدرسہ تعلیم ورزش جسمانی کی اسکیم کے حدود سے باہر نہ رہنے پائے: مثلاً

(الف) فی الحال یہ کوشش کی جائے کہ منتخب حلقوں کے چند مدارس کے لئے ایسی زمینیں حاصل کی جائیں جہاں سب مل کر کھیل سکیں۔ (ممکن ہو تو ڈرل کے لئے سائبان اور تیرنے کے لئے حوض بھی) ان میں سے ہر ایک مایک مددگار مہتمم کی نگرانی میں دے دی جائے۔

مثلاً تالاب میر جملہ اگر خشک کر دیا جائے تو اس کی زمین کو بہت کچھ کام میں لا سکتے ہیں اور اگر افواج باقاعدہ کی بلدہ سے باہر منتقلی کی اسکیم کوئی صورت اختیار کرے تو اور بھی سہولتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

(ب) اضلاع کے مدارس تحتانیہ کی تعلیم ورزش جسمانی اُن تعلیم یافتہ اساتذہ کے ذمہ ہو جو مدرسہ تعلیم العلمین کی تعلیم کے زمانہ میں ورزش جسمانی میں خاص امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے ہوں۔ بلدہ میں مدارس تحتانیہ مقام کے لحاظ سے منقسم ہوں اور ہر مقام کے لئے ایک ایک معلم ہو۔ مدارس فوقانیہ اور وسطانیہ کا موجودہ نظام ڈرل ماسٹروں کی علحدگی کے بعد بتدریج تعلیم یافتہ معلمین ورزش جسمانی کے تقررات سے اور مددگاراں مہتمم کی سخت نگرانی سے بہتر ہو جائے گا۔

(۱۳) روزانہ تعلیم ورزش جسمانی کے لئے مناسب و موزوں وقت کا مقرر کرنا ایک مشکل امر ہے بہترین وقت تو وہ ہوگا جو کسی میقات کا درمیانی حصہ ہو۔ یہ وقت دماغی کام میں وقفہ پیدا کرنے کے علاوہ باعث تحریک ہوگا۔

(۱۴) دوسری شکل صبح و دوپہر کے موجودہ نظام میں دوپہر کی خاطر خواہ غذا کی کمی ہے جو اکثر نہیں تو بعض صورتوں میں ورزش جسمانی اور شام کے کھیل سے بجائے فائدے کے نقصان دہ ہے اس لحاظ سے مدرسہ کا وقت بجائے دس سے چار کے نو سے تین بہت موزوں ہے۔

(۱۵) خوش طبعی و مستعدی۔ خود داری اور خود ضابطگی کی تربیت جو تعلیم ورزش جسمانی کے جدید تصور میں متضمن ہے مدرسہ کے نظام الاوقات میں شریک کرکے بالواسطہ دیئے گئے بجائے بے واسطہ دیا کریں۔ ہر مدرسہ کو اپنی روایات کی بنا آپ ڈالنی چاہئیے اور یہ بات حاصل ہو سکتی ہے زبان پند و نصائح سے۔ عمل نہ صرف صدر مدرس اور اس کے مددگاروں کا بلکہ کھیلو نکے کپتان اور ٹیم کے تعلق رکھنے والے اراکین کا بھی۔

اسی طرح سے علم ترکیب اور اجسام اور تحفظ صحت کی تعلیم جو ہم نے اپنے خیال میں تعلیم ورزش جسمانی میں شامل کی ہے سوائے اعلیٰ جماعتوں کے کسی کو باضابطہ اسکھلانے کا خیال نہ کریں۔

چونکہ موجودہ وقت ہی کو کم کیا جارہا ہے نصاب میں اضافہ کرنا ممکن نہیں

(١٦) بالآخر بچّوں کو تعلیم ورزش جسمانی کا صداقت نامہ دے کر اس کی اہمیت بڑھانی چاہیئے۔ جس طرح مختلف امتحانات سرکاری کی شرکت کے وقت چیچک اور طاعون کے ٹیکوں کے صداقت ناموں پر اصرار کیا جاتا ہے اسی طرح اس صداقت نامے کو بھی منسلک کر دایا جائے۔

(١٧) اگر تعلیم ورزش جسمانی کا کوئی اسکیم عملی صورت اختیار کرے تو ابتدا ان مدارس سے ہونی چاہیئے جہاں بحالت موجودہ اس کی تعلیم کا اقل ترین انتظام ہے۔

مترجمہ

علی رضا خان بی۔اے

ment" *Proposed by Mr. Chandwarkar, M. A., Head-Master, Government Middle School, Residency and seconded by Mr. S. Khairat Ali, Assistant Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters.*

(2) "That in the opinion of this Conference the present curriculum of history and geography in the primary classes and First Form needs revision and that it is necessary to substitute History and Geography of India for History and Geography of the Nizam's Dominions in Form I. *Proposed by Mr. Ganesh Chand, B. A., B. T., Assistant, Darul Uloom High School and seconded by Mr. Gulam Dastagir, B. A., Assistant, Government Middle School, Shah Ali Bunda.*

(3) "That this Conference requests Government that without prejudice to the long vacation which teachers are at present allowed, they should especially be granted once during their term of service privilege leave on full pay received in advance for a period not exceeding four months to enable them to go to places of pilgrimages for performing the *Haj, Ziarat or Tirat Yatra. Proposed by Moulvi Hissamuddin Saheb, Moulvi Fazil, Assistant, Darul Uloom High School, and seconded by Mr. Ganesh Chand, B. A., B. T.,*

Two important lectures were delivered at the Conference, one on "The Kindergarten System" by Mr. Sajjad Mirza, M. A., (Cantab), Principal, Chaderghat High School and one on Physical Education by Mr. F. Weber, Y. M. C. A. Director of Physical Education for India. We regret that owing to lack of space we are obliged to hold over till our next issue reports of these instructive and interesting lectures.

In his concluding speech the President congratulated the Association on the practical work which it was doing and expressed the hope that the members would endeavour to put into practice all that they had heard and learnt at the Conference. Mr. Syed Ali Akbar, President of the Association, thanked Mr. Fazl Mohamad Khan, the Chairman and members of the various Sub-Committees, the Exhibition judges and others for all that they had done to make the Conference and the Exhibition a success and hoped that as suggested by Mr. Khan Fazl Mohamad Khan, one of the Sub-Committees for the next Conference would be a Sub-Committee for considering how a practical turn could be given to the lessons in the various school subjects.

---

their pupils real mental training, to teach them the dignity of manual labour and to devote the greatest possible care and attention to the building and training of their bodies and characters. "You teachers", he said, "are makers of men, and the men made by you are makers of the world. No teacher can ever be successful unless he takes up his work enthusiastically and strains every nerve to perform the difficult task of man-making". Mr. Fazl Mohamad Khan laid special stress on the importance of vocational training. The helplessness of the educated men of India, he declared, was due to their wrong mentality which led them to regard Government service and the learned professions as the only noble occupations. He advised teachers to change their own mentality first, then the mentality of their pupils and through them gradually the mentality of the people in general. They should not confine their efforts to preparing their pupils for the public examinations, but should aim at producing "ideal young men who are equipped with a good physique and a trained mind, and who are men of character, true, honest and straightforward, steeped in the spirit of toleration, co-operation, and loyal citizenship; men who will not despise honest and useful work of any kind; men who will be successful in any field of human activity—scientific research, public service, commerce, agriculture or other industries, and men who will be able to make the State happier and richer in every respect". We hope that the teachers of the Hyderabad State will take to heart the eloquent appeal which the Director of Public Instruction has addressed them and that they will at once begin to work on the lines suggested by him.

The Conference passed three resolutions which are as follows:—

(1) "This Conference requests Government that in awarding Riyati scholarships special consideration should be shown to the children of the members of the Education Department, particularly the orphans, and that the number of scholarships given annually should be in proportion to the number of the employees of the Depart-

be to place both the stand-points before the Education Department and to leave it to the Department to decide the question. The Conference gladly agreed to this suggestion.

Besides the reports of the Sub-Committees mentioned above, we have published in this issue the Welcome Address delivered by Mr. Ahmad Husain Khan, Chairman of the Reception Committee, Report of the Association for the year 1928-29 read by the General Secretary Mr. Syed Mohd. Sharif Mushadi and the Presidential Address delivered by Mr. Khan Fazl Mohamad Khan.

The report of the Association shows that the Association continues to do useful work. The Education Department has already taken action on some of the resolutions passed at the previous conferences, while others are under its consideration. The opening of a library and the practical nature of the subjects chosen for discussion at the ordinary meeting are also satisfactory features of the work done during the year.

In his able welcome address, Mr. Ahmed Husain Khan drew attention to the need for the introduction of compulsory primary education, ruralisation of the curriculum of village schools, construction of school buildings, improvement of the teaching staffs of secondary schools, redistribution of school holidays and change of school hours.

All these are no doubt important and pressing needs, but whatever measures are introduced for improving the conditions under which our schools are working at present, they will succeed only if the teachers perform their duties efficiently and enthusiastically. What then are the duties of teachers? This question was answered by Mr. Fazl Mohamad Khan in his instructive and inspiring Presidential Address. In a voice which could be heard in the farthest corner of the hall and with a force which compelled attention, the President fervently appealed to the teachers to give

The Third Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association. The Third Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association was held at the City College on the 4th and 5th July 1929 under the presidency of Mr. Khan Fazl Mohamed Khan, M. A., Director of Public Instruction. There were nearly a thousand persons present at the first sitting, including an unusually large number of ladies belonging to the various schools at the headquarters as well as of officers and teachers from the districts. At the other sittings also the attendance was quite good.

As usual, an Educational Exhibition was held along with the Conference and it was opened by the President before the commencement of the proceedings of the Conference. Prizes were awarded for the best exhibits, the largest number of prizes being won by the Zenana Nampalli College. Miss Kelley, Head-Mistress, Madrasae Aliya, Miss Webster, Head Mistress, St. George's Grammar School, Mrs. Sebastian, Principal, Women's Training College and Mr. Syed Mohamad Husain, Deputy-Director of Public Instruction kindly acted as judges.

The main business of the Conference this year was to consider the reports prepared by the Sub-Committees which had been appointed three months previous to the Conference. The report of the Sub-Committee on Physical Education was published in our last issue, while the other reports appear elsewhere in this issue. All the reports were adopted unanimously. Speaking on the report on the Teaching of English, Mr. Ali Akbar favoured the present practice of beginning English in Standard III, as against the recommendation of the Sub-Committee that it should be commenced in Standard II After Rev: F. C. Philip, Chairman of the Sub-Committee on the Teaching of English, had replied, the President declared that in his opinion the best course for the Conference to adopt would

the very utilitarian point of view of examinations, for it is only natural that clear and well expressed answers appeal more to an examiner than those couched in ill-defined and faulty English.

Members of the Committee.—Rev. F.C. Philip M.A. (Chairman), Mr. G.S. Prakash Rao M. A., L. T, (Secretary), Mr. Mohammed Osman, B. A, T. D. (London), Mr. P Sebastians M. A Mr. Dinkar Narayan, B. A., B. T. Miss D. Webster, Mr. G. A. Chandravarkar, M. A. Mr. Mirza Abdul Hamid Beg, B. A., B. T. Mr. M. Parthasarathy B. A., B. T. Mr. A Sivasankaram Iyer, Mr. Syed Abdul Kadir. Mr. Murtaza Hussain, B A. Mr. Abdul Gafoor. P. Subramanya Iyer, B.A., Mr. Md. Siddiq, B. A, B.T. Mr. Abdur Shukur, B. A.

Editorial Notes.

Ourselves. With the publication of this issue the *Hyderabad Teacher* begins the 4th year of its existence. As we go to the press, we have received Mr. Ahmed Husain Khan's resignation from the editorial staff, which he has been compelled to tender owing to his transfer to Aurangabad as Divisional Inspector of Schools. We take this opportunity of thanking Mr. Ahmed Husain Khan for the valuable help and co-operation which we have always received from him in conducting this journal during the last 2½ years. Though he will no longer be able to work with us on the editorial committee, we trust that he will continue his interest in this journal and to assist us by contributing articles. His departure from Hyderabad is a loss not only to the *Hyderabad Teacher*, but also to the Hyderabad Teachers' Association, of which he was an active and enthusiastic member ever since its inception and Vice-President for nearly 3 years. We hope that he will start a Teachers' Association for the Aurangabad Division and that he will also help in the formation of a central organisation covering the whole Dominion.

More leisure periods should be given to English teachers for cultural reading and for the heavy correcting work involved, if their teaching is to be efficient.

Co-ordination and Correlation of English studies.—English should be taught as an organic whole. The interdependency of the English subjects has been apparent throughout this report and the principle of co-ordination must be kept in mind. The tendency in the past to assign special teachers for subjects within the group, even grammar and composition being in different hands, is not helpful. To rectify this there should be periodic meetings of the school English teaching staff, and in the same connection, an English Teachers' Department could be formed within the Teachers' Association to make for greater efficiency in English teaching generally.

Correlation with other subjects is also important. The introduction of allied material helps to a more complete grasp of the topic and creates interest. A little digression at times may be permitted, e. g., a lesson on the Thugs might be the occasion for an excursus into Indian History, and the Suez Canal lesson might be illustrated by a geographic account of the surrounding country. All this however requires that the teachers' own knowledge should be wide and extensive and not confined to one branch of a single subject.

After reading the above report, Mr. Philip, Chairman of the Sub-Committee, spoke as follows:—

In schools where English is the medium of instruction as well as a subject, correlation with other subjects can be carried much further. English becomes the key to all the other subjects, and they in turn provide ample scope for exercise in English. Indeed, proficiency in these subjects depends very much on the pupil's power of comprehension and expression in English, and hence a true grasp of the language is more essential for the student, even from

school library. A Library period for Middle and High school classes, or a literary "project" to be attempted as already indicated, will foster such use.

Teachers of English.—It seems to be thought in many quarters that anyone who has passed an English examination can teach English. Yet in no subject is training more important. The teacher is the key to the position and unless there is an improvement here, we are only moving in a vicious circle, and will get nowhere. A man's personality and natural endowments come more into play in the teaching of English than in any other subject. Voice, dramatic power, insight, sympathy—all have their part in the work to be done in the very varied English group. Teachers of other subjects have more or less tangible material to deal with, but teachers of English have to create an atmosphere and form those very intangible things taste and style—in short, in this respect a teacher has to be a creative artist. Other things besides degrees, therefore, count in the teaching of English, voice and accent especially should be a factor in selection.

Further, in the West the best qualified teachers are assigned to the lower standards in order that right foundations may be secured. If the importance of the work done is to count, it should not be considered derogatory for even a graduate to do this, work in the lower classes. The Indian perspective in this respect needs altering; perhaps an enhanced rate of pay for well qualified teachers in these key position would rectify such faulty perspective.

In view of these facts the committee make the following recommendations:—

A course in "special English" as instituted in Madras for those intending to teach English would prove invaluable.

A few teachers could be selected and sent for special training in the language arts.

choice of Readers and Text Books is considered unsatisfactory. Readers written in the light of the aims and methods of teaching English set forth above are very necessary. Periodic changes in readers are also essential. The present Bengal Reader has been in use for at least ten years. This is absurd from every point of view. Reading lessons needs vitalizing and only fresh and attractive readers will accomplish this. Supplementary readers are now available for all classes and such reading should be encouraged. In Australia readers have been abolished and a general school Magazine, prepared every month in three grades, has been substituted to preserve freshness and vitality in the reading lesson, and it is really enjoyed by the children.

Modern authors should also be used more as text books, and the older classic ones—in the existing state of English in India—should be deferred to the University stage, as boys tend to reflect archaisms in their composition. For the same reasons it is questionable whether even Shakespeare should be studied in the high school course.

The grading of text books needs investigating—the gap mentioned between the Bengal Reader IV in III Form and the present book for the Pre-Matric Class should be rectified.

General Reading.—The School Library should be constantly renewed if it is to preserve its interest for pupils and it should possess books suitable to all grades. There is a tendency to overlook the claims of the lower classes in this respect, and books suitable to their age must be supplied if they are to use the library. Their needs may also be met by the institution of Class Libraries which make a distinctive appeal of their own, especially if run by the boys themselves.

Newspapers of various types should find a place in the reading room of every school. The chief thing is that pupils should be encouraged to read the books and use their

Efforts should be made to popularize the above methods, especially the Direct Method. Demonstration classes could be held in connection with the Teachers' Association and visiting experts could also be invited to help. At such meetings English teaching apparatus and material should be exhibited. Special grant provision might be made for English teaching material as is done for other subjects. This would facilitate the establishing and furnishing of an English room as mentioned above—possibly one for each grade, primary, middle and high.

System in Work—Correction. This is a vital but neglected part of the English teacher's task. If written work is not corrected a large part of its value is lost. Fewer compositions and essays carefully corrected with explanations do more good than many done in a slovenly way. Care must be taken to see that the pupil's attention is drawn to the errors as otherwise the corrections are wasted. Adapting a code of symbols to indicate to pupils the type of error is also a useful method. Keeping a "book of errors" to record prevailing faults is a help to the teacher in conserving his work and in determining where emphasis should be laid. An interesting experiment is to get children to correct each others compositions—but, of course, not as a regular thing.

Spelling may perhaps be dealt with under this head, as here system is imperative if this perennial weakness is to be conquered. Spelling is largely a matter of the visual memory and each teacher will adopt his own devices to secure success. Word-building, the play way of "spelling cricket", etc., all help, but system is the main thing. Dictation given in a casual way is useless—it must be prepared for by the pupil. Regular transcription exercises are also helpful in securing good writing, correct observation and spelling. A spelling book, maintained by the pupil, is also valuable, in fact a necessity.

Text Books, Readers, Libraries, etc.—The present

papers read by pupils, school magazines, all help to this end. Mental culture and fluency and facility in the language should underlie all our schemes and ample scope should be given under this heading, (of expression.) for exercise in them.

Methods and aids. We have already indicated those necessary in the primary stages. Here we would like to state that the method known as Jone's method is a splendid play way of beginning the language—even in the Kindergarten stages. It focusses the eye, ear and hand in a play way on grappling with the difficulties of sounds and reading; and with the help of a few simple diacritics, also taught in the play way, no words seem too big for the child.

For slightly older children the Direct Method is the best. The common practice of giving vernacular equivalents in season and out of season is the worst of all. The child is encouraged thereby to think in the vernacular and then to translate his ideas into English; this, besides being a laborious and wrong way of learning the language, inclines him to use his vernacular idiom in English—a fact very much in evidence in Hyderabad. The Direct Method which emphasizes the oral aspect—the natural way of learning a language—and brings experience and impression together, helps the child to think and write in English direct.

A method that may be used to advantage with older pupils is the Project Method which stresses freedom for each student to work out his own "project," assigned or otherwise. It tends to develop initiative and originality and has a fine character basis. Though somewhat new, it is quite applicable to English, especially literature classes. It demands, however, a separate English room for the project workers. Such a room furnished with pictures and busts of English writers creates an English atmosphere and is valuable whatever method may be adopted, and should be aimed at as an ideal for each school.

value is sometimes disputed but we think it could be included with advantage.

Précis writing is considered by some to be too advanced for Matric and sixth form classes, but elementary exercises in précis might well be done in these classes as so many aspire to Government employment where it is necessary.

Grammar and Translation. The place of Grammar in the teaching of English is a much-discussed topic. In some places it is overdone by formal grammar being taught from start to finish. In other places it is given a very subordinate position. Most teachers leave out regular instruction in grammar with the idea of doing it along with the text book, but in actual practice it is not done, as the teacher often does not know how to teach it inductively. The best way is for the pupil to learn grammar inductively from the very beginning, and for the teacher to make it possible for a boy to build up his own practical outline working grammar for himself. Later on a brief course in formal grammar may be given so that pupils may classify their grammatical knowledge into a system. Teach the language first and show the laws it follows afterwards. The grasping of the functions of words is more important than learning the detailed nomenclature of them which is often attempted.

Translation. It is the opinion of a few that translation may be done away with, as, for the purpose of interpreting foreign thought, sound knowledge of the foreign language and the mother tongue should be all that is required. The majority of the Committee, however, hold that a certain amount of exercise in translating is essential, particularly for future Law Court and office work.

Expression. Before leaving this section a few words on expression generally seem necessary. Students, as a rule, express what they like best and scope should be given for such expression. Literary societies, debates, dramatization (even in grammar) and recitation, Littlemen's lectures,

harmful from this point of view and tend to make appreciation almost impossible.

Most children are able to detect the musical element in poetry and even appreciate beauty of form if a poem is well read to them. Such instinctive appreciation is far more important than learning the mere technique of poetry. We must not invert nature's order. Metre should not be taught as so many rigid groves into which poetry must fit itself, but shown to be simply the tune to which the poem inevitably sings itself. Later on some elements of Prosody may be taught to pupils in the sixth form.

Composition is primarily the expression of thought through language, oral or written. This fundamental truth needs to be borne in mind as the emphasis in the past has been largely on the form, over emphasis on which sometimes tends, especially in the early stages, to cramp free utterance. Oral composition should, therefore, be the beginning of English teaching and should be encouraged in various forms throughout the course. (Ross's Oral Composition Lessons-adapted may be found helpful to those unacquainted with the idea) Letter writing is a valuable exercise in this connection as greater freedom and originality seem to come more naturally to the pupil in this way than in the more stereotyped forms. Story reproduction, especially with parts omitted and left to the imagination, can also be used. The essay should not be started too early. It is an advanced literary form and the tendency is for teachers to expect to secure the finished product without attending to the preliminary process of gradation and development, e. g., from simple to compound sentences, synthesis of sentences, and so to the paragraph as the unit of thought, thus leading to the essay. Urdu speaking boys especially need drill in the idea of the paragraph on account of the running-on tendency of Urdu.

Paraphrasing is generally given for the H. S. L. C. examination but is left out in the Osmania Matric. Its

The letter or word appeals to the eye, the sound to the ear; the two must be associated and connection made between the new visible language the child is attempting to learn and the spoken language he is using. Constant drill is necessary to achieve this mechanical-mental operation. The play way, especially as set forth in Jone's Method, is a great help here. At this stage there should be ample material for this purpose in order to facilitate word drill and play e. g. movable letters, pictures with labels for naming, cardboard or paper slips showing single sentences for dramatic interpretation, flash cards, etc. Very few schools possess such material; efforts should be made to rectify this.

Reading lessons are conducted, as a rule, in too mechanical a way. They should be more varied, and vitalized by pupils acting parts, etc. Silent reading appears to be neglected, and when practised, is rather aimless. It must be supervised to be of any use. This is important from the point of view of comprehension.

Comprehension. Tests should be made as regards phrase, sentence and paragraph comprehension, in order that students may be trained to take in what they read, hence to appreciate.

Appreciation is very important and rather neglected. In the early stages story telling by the teachers, nursery rhymes etc., all lay the foundation of taste. Students should be taught to find out for themselves beauties in the text, the first reading of which should not be too analytical and detailed. Reading of choice extracts by the teacher and library periods on the project method for higher classes help towards this end.

As regards Poetry—its teaching and appreciation, the first essential is that it should not be taught as prose. In poetry—prose also—there is far too much of simply giving explanation of difficult words and phrases and then considering the work finished. Over annotated editions are

Learning the Language.

Speaking and Reading. In the initial stages the teaching of English should be based on two definite principles, practice in using English sounds and practice in conversation. In short, speaking the language—the primary use of language—must predominate. The matter should consist of easy phonetic sounds derived from home and school (not from a primer) and suitable objective material is necessary in order that some of the exercises may be of a motor character. Speech training must proceed from the very first, and here a teacher's own example is most potent in moulding the child's speech in the initial stages. The voice therefore should be carefully cultivated.

A knowledge of phonetics and breathing exercises is invaluable in these early stages. Wrong sounds and errors in pronunciation are very difficult to correct afterwards. From our evidence, it appears that very little is done in our schools along this line, and that a special class in phonetics, voice production, and breathing exercises would be invaluable for teachers. Gramaphone records arranged by experts are now available as a help to getting correct articulation and pronunciation. These would be a valuable addition to any school. Perhaps the Educational Department could help by supplying a sample set to the Teachers' Library for loaning purposes to schools. It was also felt that there was too much of the grammar and translation method in general use in teaching the language and that more use should be made of the Direct Method of teaching English and that special classes must be instituted for teachers desirous of becoming familiar with it.

Reading. It should be recognized that reading involves three distinct acts—(1) a mechanical process of learning and applying symbols; (2) ability to express their sound equivalents; (3) comprehending the subject matter.

suggestions in the light of facts which came to light on the sub-committee and thus help to rectify the weakness at present existing in the teaching of English in our schools.

Curriculum.

It was felt that the existing curriculum needs changing in certain directions.

In view of the high standard required, the study of English is not begun early enough. Difficulties present themselves, of course, but the present situation demands an earlier beginnig for the study. At present a boy does not begin the study of English till the third standard, and then it is one of three languages. This tri-lingual course is an undue strain on the boy and is a serious handicap to the proper study of English. The Vernacular and English should be sufficient for the primary stage. The third language, frequently a classic, could be started at a later stage *viz.*, first form. This would allow more time for the rational study of English. Ten periods a week should be allowed for it even in the foundation stages.

Another defect is the enormous gap existing between the standards of the Middle and High Schools. A pupil passes from the Bengal 4th Reader and is expected to do selections and essays from Johnson, Burke, etc., and even Browning, e. g., "The Lost Leader", in the Pre-Matric and Matric classes.

Oral work is not sufficiently stressed in the present curriculum. In view of the common defects in speaking the language, more time should be given to this subject. The committee are of opinion that an oral test in the Leaving Certificate Examination would help considerably to rectify this weakness.

The Committee consider that the present 2 years' course for the Osmania Matric is insufficient and recommend a 3 years' course.

Report of the Sub-Committee on the Teaching of English.

It seems generally agreed that the standard of English in our schools is not what it should be. College professors and lecturers report that there is a deterioration in the standard of English amongst Indian Students and that the work of the high school has to be done at the University. The recent report of the Madras University Commission also states that "The students who come up from the high schools for a college course are most meagrely equipped in English", and they propose raising the Matriculation standard next year. Some radical steps therefore seem necessary in order that an improvement may be effected.

At the outset: it would be well to enquire: What is our aim in teaching English? Is it to be utilitarian merely, or is the cultural aspect to have a place in our scheme? Our procedure depends very much on the answer given. The utilitarian idea leads to compromises and short cut methods, a "working knowledge" theory, etc. The cultural aim means laying broad and deep foundations in order that a real knowledge of the language may be gained, as a means, not only of expression, but as a key whereby a new world of culture and ideas is opened to the pupils, and also that through literature the genius of the English people may be studied. If even Germany insists on this aspect in her curriculum of English studies (*vide* Mr. Ali Akbar's article in "The Hyderabad Teacher" Vol. III. 2), how much more should this be the case in India where Indian students are in close touch with English administration and civilization and have all to gain by understanding it.

This report, therefore, is based on the cultural aim and not on a mere "working knowledge" idea. It does not pretend, however, to set forth the whole rationale of the teaching of the English, but simply to make some practical

Oral work must consist of simple problems, so that several may be done within a short time.

Oral work must be used as a drill.

Teachers must not stop teaching oral arithmetic after the Fourth Standard, but must continue it in the upper classes also.

Mental work should not be done only in a particular period set apart for it, but must be used with written work as often as necessary.

Correlation of Mathematics with practical life. We recommend to our teachers the series "Practical Mathematics" (Longmans, Green & Co.), which, if slightly adapted, would be excellent as text-books, treating mathematics in their relation to practical life. We recommend that the Department adapt these books to local conditions and publish them.

We believe that card-boards, sticks, tape, yard-measure, a clock, weights, coins, scale, etc., are indispensable aids to practical teaching and should therefore be supplied to every school.

We recommend that the Department should insist that questions given in the Government examinations be based on every-day experience, so that even teachers who merely aim at passing the students in the examinations may make their teaching more practical.

Members of the Committee. Mr. Ahmed Khan, B. A., (Chairman), Mr. G. Sundaram (Secretary), Mr. Abdul Lateef, B A., B.T , Mr. P. V. Subba Rao, B. A., B. T., Mr. V. V. Hardikar, Mr. Sivashankaram Iyer, Syed Abbas Husain, Mr. B. Manohar L., Mr. Bahadur Khan, Syed Hussain, Hafeezullah Meer, Mr. Wahid Ali, Mr. T. S. Narayanchari, Mr. Reddi Narshimloo.

---

means of simple and practical arithmetical problems and have found this method satisfactory.

As an aid to the teaching of Geometry in the Second Form, Geometrical Drawing may be introduced into the Drawing classes of First Form. This may help the teacher to do away with the present pernicious practice of beginning Geometry by making students commit definitions to memory.

Methods of instruction. The teacher would do well to bear the following in mind:—The students should avoid the habit of counting by fingers, dots, etc.

In the Infant Class and the First Standard before multiplication tables are taught, addition and subtraction combinations should be memorized and drilled as well as the multiplication tables.

It is not necessary to lay undue stress on L. C. M., G. C. M., formidable vulgar fractions, simplification, reduction etc., as these are not of much practical value.

Decimals should be taught practically, and as they are easier than vulgar fractions, should be used more often both by teachers and pupils.

In the teaching of Mathematics the concrete should always precede the abstract. Theory should never be taught first.

Problems should be given relating to the experience of the pupils.

Speed and accuracy must be the goal. Ability to solve intricate problems is merely secondary.

Subjects need not be taught in the order given in the curriculum ; re-arrangement may be resorted to to suit one's own methods.

Mental and Oral Arithmetic. Too much stress on written work to the exclusion of oral work is not a wholesome practice in Mathematics.

metic Books in Telugu, making use of local money, weight, etc.

As most schools teach Algebra in Form II, it may be introduced into the curriculum of that class.

Teachers should not begin the teaching of Geometry by forcing the students to commit to memory the definitions given at the beginning of the text-book. After considerable practical work is done, the particular definition concerned may be used to make the mathematical knowledge precise and accurate.

Co-ordination in the work of various teachers in the various classes. It is desirable that every teacher of Mathematics should have a very definite idea of the amount of work that he has to do during the year. Once a principle is taught by a particular method, the same should be followed in the upper classes, so that there may be no confusion in the minds of the pupils. This rule is especially important in the primary classes. Headmasters should arrange for a conference of the Mathematics teachers of the school to discuss the curriculum, apportion the work among the various teachers and decide the particular methods to be followed. Headmasters should see that teachers finish the work assigned to them for the year and also follow the methods approved by these school conferences.

Co-ordination between different branches of Mathematics. It is desirable that the same person should teach Arithmetic, Algebra and Geometry to a class.

Work in Algebra should grow out of the teaching of arithmetic. The teacher should realise fully that Algebra is generalised Arithmetic.

Teachers should not begin Algebra by thrusting on students algebraical symbols which frighten them and then teach them to mechanically evaluate them with given arithmetical values. Some teachers have approached the subject by teaching to the pupils the principles underlying equations by

Report of the Sub-Committee
on the
Teaching of Mathematics in the
Primary and Middle Classes.

Curriculum and Text Books. According to the curriculum laid down by the Department for the First Standard, boys should be taught Numbers up to 1,00,000. As small boys are not capable of grasping the idea of a huge figure like this, we recommend that Numbers up to 1,000 only be taught in this class.

The present practice of making use of the idea of "carrying tens" while teaching addition in the Infant Standard should be discouraged. Addition should be taught only with the help of concrete objects and the teaching of "carrying tens" should begin in the 1st Standard.

While teaching Multiplication Tables to pupils of the Second Standard, teachers should put into practice the idea that multiplication is repeated addition. As far as practicable, they must make the pupils frame these tables by self-effort. From 'the known to the unknown' is the principle to be followed. Tables may be taught in a more rational order. The following is suggested :—

2, 10, 5, 4, 8. 3. 6, 9, 7

As the portion laid down in the curriculum for Standard IV cannot be covered within one year, a slight reduction of the same is recommended. "Simple Interest" may be omitted in this class.

Further, "Areas of rectangles and squares" should be taught practically; this should not be interpreted to mean extended work on 'Square Measure'.

For the benefit of Telugu knowing boys, it is advisable that the Department prepares a series of up-to-date Arith-

and help of parents. We recommend the following methods :—

Parents' meetings may be called by school authorities and the advantages of vocational education may be explained to them.

Arrangements may be made for exhibitions along with the annual prize distributions in the schools and the hand-work of the children may be displayed.

Articles on vocational education may be written in newspapers and periodicals &c. Libraries should be opened in Balda and in the districts with a supply of newspapers and periodicals.

Arrangements may be made for lantern lectures on vocational education.

Industrial museums may be established in as many places as possible. The museum should include also exhibits or crafts of other countries, especially Eastern countries. We believe that such a museum will be of great value and therefore it should be well equipped. Besides having considerable educational value, it will have commercial value also, as it will afford valuable information to visitors who come to Hyderabad with commercial intentions.

Members of the Committee. Mr. Syed Mohamed Husain, B.A.,(Oxon), Chairman, Mr. Mohd. Sultan (Secretary) Mr. Baquer Mohiuddin, B.A., Mr. K. P. Sastri, B.A., L.T., Mr. G. B. Garden, M. A., Mr. Sadruddin, Mr. Gulam Dastagir, B.A., Mr. Mohd : Sharifuddin. Mr. Sidadapurkar, Mr. Mushtaq Ahmad, Mr. Balreddi, Mr. S. Tajammul Husain, B.A., Rev. S. Daniel, B.A., L.T., Mr. Hamid Ali, Mr. Md. Nasir Husain, Mr. A. Sivasankar Iyer.

APPENDIX

LIST OF SUBJECTS.

Bamboo and basket, Blacksmithy, Carpentry, Brick-making, Dressmaking, Mat-making, Pottery, Rope making, Coire work. Book binding, Toy making, Tin-smithy, Wire goods manufacture, Weaving. Bidari Industry, Goldsmithy, Printing, Fitters work, Shorthand, Typewriting. Book-keeping, Cane work.

FOR GIRLS —Needle work, Embroidery, Cookery, Domestic Economy, Hygiene, Yarn spinning, Cloth weaving.

the number of ordinary uneducated craftsmen in the country, but to produce such craftsmen as can improve and elevate their occupations by modern practical and scientific methods. Hence it is extremely important that science should have an important place in the curriculum. We recommend that science should be taught as a compulsory subject from Form I onwards in a practical and interesting manner. In high school classes special stress should be laid on the teaching of this subject and it should be made compulsory both for the H. S. L. C. and the Osmania Matriculation Examinations.

Industries.—There can be no real progress in a country unless the industries are developed. In order to revive the dead industries of this country, the efforts of the Education Department alone will not do, and unless and until the Industrial Department organises and subsidises certain useful industries, no useful results will be achieved in this direction and the chief object of introducing vocational education in the schools, that is, keeping away young men from clerical posts, will never be gained.

Vocational Educational for women. Girls in the primary schools could be taught the same subjects as prescribed for boys. In middle and high schools some such occupations may be taught as may be helpful to them in their after-life and enable them to perform their duties as wives and mothers in an efficient manner. The following subjects are recommended :—

1. Needle work.
2. Cookery.
3. Domestic Economy.
4. Yarn spinning.
5. Cloth weaving.
6. Embroidery.
7. Laundry work.

How the public could be interested in vocational education. It is hoped that the introduction of vocational education in our schools will be appreciated by the public. Speedy success cannot be achieved without the co-operation

who have received vocational education in a recognised institution and who are imbued with love of service to their country, should be employed as teachers for vocational training. For the present such teachers are rare. If Government will be magnanimous enough to accept the following proposals, we are sure that within a short period a good number of trained teachers will be available.

PROPOSALS.

1. Arrangements should be made in the Normal College, Balda and other normal schools to train teachers in certain useful vocations.

2. A few teachers should be selected and deputed to the agricultural and technical institutions in British India for training, and scholarships be granted to them.

3. The pecuniary conditions of the teachers should be improved so that they may devote themselves to their work with peace of mind.

Future of young men vocationally trained. It is our duty to say a few words as regards the prospects and careers of the young men who will pass examinations in vocational subjects. In our opinion it will be incumbent on Government to provide suitable posts to such young men in different departments *viz.*, Revenue, Agriculture, Forest, Public Works, Electricity. Co-operative and Industrial Departments. Those who wish to continue the agricultural occupation should be given uncultivated lands on lease and government loans on reduced rates of interest should be advanced to them by the Co-operative Department for buying ploughs, seed and cattle etc. The capitalists of the country will take up the task of opening factories and workshops with Joint Stock Companies and will employ these educated men.

MISCELLANEOUS RECOMMENDATIONS.

Teaching of Science—By advocating the introduction of vocational education in schools, our object is not to increase

School Farms. In our opinion, under well irrigation the area of each farm should be at least 5 acres. In the Punjab similar provision has been made for a secondary school farm. If it be not possible to acquire this much land, then at least 3 acres should be secured.

We are afraid, the same number of periods as recommended for industrial vocation will not be enough for agriculture and horticulture. Pupils will have to work extra time out of school hours either in the morning or in the afternoon, after the school is over. We are not prepared to give a detailed syllabus either for industrial vocation or for agriculture and horticulture. We leave this to a committee of experts.

Technical and Agricultural Schools and Colleges. The introduction of vocational training in the State Schools will necessitate the establishment of technical and agricultural schools and colleges in His Exalted Highness the Nizam's Dominions, so that the pupils having finished the courses in the middle and high schools, may be able to continue, if they have a special inclination, their further education in technical or agricultural high schools. Therefore we recommend:—

a. that one agricultural and one technical high school should be started at least at every divisional head-quarter with a hostel attached to it.

b. that one agricultural and one technical college should be established at the Capital.

Training of Teachers. When the scheme of vocational training is introduced in our schools, the main difficulty will be the supply of properly trained teachers. We have no teachers at present in the department capable and trained enough to take up the work of teaching vocational subjects if these are started immediately in the schools. It will be a great mistake to employ uneducated professional men for vocational education in schools. Educated teachers

enough for vocational training. Of course, teachers can take extra work from the pupils out of school hours, if they like.

Agricultural Education. The main source of wealth and income in His Exalted Highness the Nizam's Dominions is agriculture. Eighty five per cent of the population of this State is dependent on agriculture. Therefore, we strongly recommend that attempts should be made to teach agriculture as a vocation in rural schools.

Rural Primary Schools. No attempt should be made to teach technical agriculture or horticulture in the primary schools or primary sections of middle and high schools. The subjects recommended for primary schools can safely be adopted in rural primary schools with special emphasis on gardening.

Gardening. Gardening rightly understood is allied to nature-study and should not be treated as professional training for an industry. It is really a manual occupation which trains the hand to greater skill, the mind to more careful observation and the character to a fuller appreciation of the virtue of patience. It makes children assiduous, inculcates love of the soil in them and removes apathy for agricultural pursuits.

Rural Middle and High schools. We are of opinion that in rural middle and high schools, as far as possible, practical agriculture and horticulture should be taught as a vocational subject. Agriculture in middle and high schools has an educative value both because it involves manual work combined with some brain work and because it trains boys to apply brains to agriculture. It is evident that the introduction of agriculture and horticulture in the secondary schools will necessitate acquisition of land, as without farms this subject cannot be taught. In order to secure lands, the Education Department will need the co-operation and help of the Revenue Department.

Time to be allotted for manual occupations, drawing and nature-study in the primary schools. We recommend that in all primary schools and in the primary sections of middle and high schools, the following number of periods should be allotted for manual occupations, drawing and nature-study:—

(a) Manual occupation .... 4 periods per week.
(b) Drawing.... .... 6 " " "
(c) Nature-study .... 3 " " "

Middle Schools. We recommend that vocational teaching with a definite economic object should be introduced into middle schools. Any one or more industries might be selected from the list printed as appendix I to this Report. Keeping of accounts should also be taught in this section, as far as possible. Agriculture and horticulture might also be introduced, if the school is located in a rural area. Even in urban areas wherever conditions permit, agriculture could be taught as a vocation.

As regards the number of periods to be allotted for vocational training in the middle section, we recommend that at least 8 periods per week should be devoted to vocational training. This can be done either by reducing the number of periods for other subjects or by getting this part of the work done out of school hours.

High Schools. In the high schools technical subjects involving some knowledge of science or art, such as, carpentry, cabinet making, fitter's work, pattern making, foundry work, etc., should be introduced according to the local conditions. Commercial education, which is already an optional subject for the H. S. L. C. Examination, might also be made an optional subject for the Osmania Matriculation Examination. Agriculture might be introduced into both urban and rural high schools if the facilities exist.

In view of the large number of subjects which a high school boy has to study, we consider 3 periods per week

a view to give vocational bias to general education, we recommend the following subjects for this section:—

(1) Manual training. (2) Drawing. (3) Nature-study. (4) Gardening.

Manual Training:—The object of manual training should not only be to produce carpenters, blacksmiths, goldsmiths, etc., but to train the hands and eyes of children in such a way as to make the learning of any profession or vocation easy in future. It will be by means of manual training that we shall be able to remove the apathy towards manual work and to ascertain the aptitude of children for future vocations in life. Manual training in primary sections should only be limited to some such manual occupations as clay modelling, sand play, paper cutting and folding, sloyd, &c. In primary sections children while engaged in manual occupations, should have freedom to use their imagination and inventive faculties to the fullest extent. Manual training can be imparted profitably in middle and high schools also.

Drawing:—It is hardly necessary for us to enumerate the advantages of teaching drawing in schools Suffice it to say that it not only cultivates the mind but its knowledge is essential for all the technical and vocational subjects.

Nature Study—The main object of teaching nature-study is to deepen the interest of the child in the world around him and to train him in the habits of careful observation and clear thinking. This can be done by the elementary study of a few of the simpler phenomena of animate and inanimate life. We might note here that manual occupations, drawing and nature-study, are already included in the curriculum. As these subjects prepare the ground for further scientific and vocational education, we hope that the Education Department will make every effort to make their teaching efficient in all schools by employing properly trained teachers.

of pupils and attract them to other forms of occupation to enable them to earn their livelihood by dint of their own skill and labour.

How is vocational education to be introduced? An ideal solution of the problem will be the establishment of a system of compulsory education up to the age of 12 or 13 and at that point a general examination on the results of which bifurcation should take place, the best being sent to ordinary secondary schools and the rest to central pre-vocational schools. This will open the way to the University for those who go to the secondary schools, while those who have attended the pre-vocational schools will get admission to the technical and agricultural schools. Ideal, as it is, we are aware that this system cannot be put into force until primary education is made compulsory and adequate funds are available to run separately schools of different types.

As the problem, however, is pressing and cannot wait for ideal solutions, we offer the following suggestions to meet the existing conditions:

1. We recommend that, to being with, certain useful vocations should be introduced as compulsory subjects in schools of certain selected areas, both urban and rural.

2. If vocational subjects are grouped with other optionals, we fear that the pupils will not take them and the desired result will never be achieved. Hence we strongly recommend that vocational subjects should be made compulsory wherever they are introduced and exemptions should be rare. Different kinds of vocations should be taught in schools of different grades.

Primary Schools. We are of opinion that no attempt should be made to teach industrial vocations or practical agriculture in the primary schools or primary sections of middle and high schools. It will be enough if a vocational bias is given in these schools to general education. With

REPORT

OF THE

Sub-Committee on Vocational Education.

Definition of vocational education. It is said that all education is vocational. Prof. Adams in his book, "The Evolution of Educational Theory," writes: "There are many for whom the very name vocational education is anathema, yet, when we get down to bed rock the adjective is tautologous. All education is ultimately vocational. Even the stoutest protagonist of purely disciplinary and formal training must attempt a teleological aspect. Some final purpose shapes his efforts . . . . . . being neither a wild beast nor a God; his pupil will not live alone. Citizenship of some sort is his destiny ". It may be true that all education is vocational, but the term vocational has come to be applied to a particular type of education which, though a part of general education, gives a definite bias in one or more directions to a pupil's education and thus prepares him indirectly for a particular occupation in life. It includes any training designed to fit boys and girls for trade in after-life, as opposed to general education, which merely develops the child's mental faculties without any reference to the career, which he or she may ultimately adopt.

Need for vocational education. The need for vocational education has been long felt both by the public and the Education Department. One important reason for urging the introduction of vocational training into our schools is the urgent need for attracting young men to trade, industry and agricultural pursuits as means of livelihood. In our opinion, too much emphasis attached to literary education is partly responsible for the tendency among the educated classes to seek clerical and professional careers which are over-crowded. Therefore, we recommend that some practical steps should soon be taken to introduce in our schools some such subjects as will give a vocational bias to the education

or rather enhanced, in the atmosphere of close association in which it was brought up. This is one of the secrets of its vitality and success. This is a natural gift due to the peculiar circumstances of its birth and upbringing. Urdu has, therefore, a great future. Such a language being the medium of instruction in the Osmania University, the University has a great future, too, provided that you, Teachers of Hyderabad, give a thorough training to your pupils in every respect before sending them on to the University.

The importance of English.

In using Urdu as the medium of instruction, you should not forget the importance of English to which we owe so much. It has thrown open to us the grand portals of all modern knowledge and it is for some purposes the language of the whole civilized world. Urdu being the medium of instruction in the Osmania University, it is all the more necessary for you to devote more attention to the teaching of English so that the proper standard of literary knowledge in this important language may be maintained. I have received complaints from the University and elsewhere that the boys who pass out of our schools do not come up to the mark in this subject. Therefore, it is strongly urged that more intensive work in English should form part of our programme of consolidation.

Gratitude to His Exalted Highness the NIZAM.

Teachers of Hyderabad, let me remind you that twenty years ago there was not even one-tenth of the educational activity which we now see in these Dominions. How has this great progress come about? It is all due to His Exalted Highness the Nizam's keen and generous interest in the welfare of his subjects. His generosity and foresight have performed the wonderful miracle of completing more than half a century's work in a few years. We are all very grateful to His Exalted Highness for providing us with such grand educational institutions in such a short time.

also the intelligence of the boys. The boys who go up to the University should be fine specimens of boyhood in every respect, so that the graduates of our University may hold their own in the world in any walk of life.

The Osmania University and its medium of instruction.

The task has been made so easy for us by the establishment of the Osmania University, which is a great improvement on the existing Indian Universities. It does not require any argument to prove that better mental training at a less cost of energy can be had at the Osmania University than at any other University in India. Why should it not be so, when the medium of instruction is the lingua franca of India, that is, Urdu? It is not only the lingua franca of India, but it also serves humanity even beyond the shores of India. Spoken Urdu, which is just the same as Hindi, is not only useful in many eastern lands but it is also useful in some other parts of the world which are accessible to Indians through the British connection. It is not at all surprising, because Urdu has won these advantages in a very natural manner. It was born of the close Hindu-Muslim relationship and was brought up under the joint Hindu-Muslim partnership. When the British came, its development continued because it was a natural and convenient means of communication between man and man in most parts of India. Since the advent of the British in India, the usefulness of Urdu has increased tremendously, because, owing to the joint Indo-British partnership in the world, Urdu has gone hand in hand with English, beyond the shores of India, and one can hear Urdu spoken at hundreds of places all over the globe. The great services of Urdu to humanity in these days are the result of the close union of three great races—Hindu, Muslim and British,—which is, in fact, God's gift to this wonderful language. Urdu was born in the Deccan and other parts of India in an atmosphere of comradeship and fraternisation. Its power of absorption and assimilation was born with it. This power was maintained,

honest and useful work of any kind; men who will be successful in any field of human activity—Scientific research, Public service, Commerce, Agriculture or other Industries, and men who will be able to make the State happier and richer in every respect.

Begin at once.

The school year has begun ; the weather has changed ; you have all returned fresh after taking rest during the Summer Vacation. The time is therefore very opportune for making a serious effort on the lines indicated above. During the year, I will see how much progress each school has made in organising various activities. When I come round to inspect, which I will do during the year, each school ought to be able to render an account of its progress. I would like to see the schools in these Dominions to be real schools for genuine education, and not mere factories for producing cheap clerks and dreamers.

The first stage of consolidation.

You all know that the first stage of expansion of the Department is over, and the first stage of consolidation has begun. Those who wish to win honour in the Department, should try to distinguish themselves in the work of consolidation and improvement on the lines suggested by me. The second stage of expansion of the Department will come after we have consolidated our present position and also when more funds are available. Some slight expansion will be possible even now when and where the funds permit. But the lines of improvement suggested should always be kept in view both in consolidation and expansion work. It should also be remembered that the standard of literary education in the schools should not only be maintained but raised as far as possible. I am sure that the organisation of the various activities for the training of physique and character will, according to the proverb: " Sound mind in a sound body ", increase not only the capacity for work, but

sustained effort. The Department will view with great pleasure the efforts of any school in this direction, and will always be ready to guide and help the introduction of Manual or Vocational Training suitable to the locality concerned. It is gratifying that some teachers have already introduced Manual or Vocational Training in their schools. They are great pioneers and I congratulate them heartily on their fore-thought and keenness. You all know that the Indian world is changing fast and trying to make people more practical with a view to equip them properly for the struggle of life. We should not allow this State to be left behind. Now is the time to begin and you are the people to whom this great work has been entrusted. Your difficulties are great, but they can and must be overcome. You have to change your own mentality first and then to change the mentality of your pupils and through them gradually change the mentality of the people in general. There are not enough clerkships to go round, but there is room enough in the whole wide world.

Give practical turn to teaching.

The introduction of Manual or Vocational Training is not the only way to give a practical bias to our pupils. There are hundreds of lessons in various subjects which lend themselves appropriately for the purpose of giving a practical training to the boys. The teachers should exert themselves in this direction. The Teachers' Association might take up this work for the benefit of its members. A Sub-Committee could be appointed for arranging lessons or lectures in which the methods of giving a practical turn to teaching might be illustrated.

The expected results.

If we succeed in our efforts then we shall be able to produce ideal young men who are equipped with a good physique and a trained mind, and who are men of character, true, honest and straightforward, steeped in the spirit of toleration, cooperation and loyal citizenship; men who will not despise

In connection with the organisation of games and sports in schools, I must point out that the benefits to be derived from them will be very limited if the right kind of spirit is not developed. The spirit of sportsmanship means nothing but the spirit of gentlemanliness on the play-field. The least manifestation of bad spirit in games and sports is the greatest stigma on a school and shows that the school is doing more harm than good in the matter of character building.

The spirit of Sportsmanship.

There are two important factors which powerfully influence the characters of school boys. They are the discipline of the school and the example set by its staff. If the discipline is good, the pupils are bound to grow into disciplined and law-abiding young men with the power of self-restraint and other good habits properly developed. On the other hand, laxity of discipline acts like a slow poison and ruins the boys. Similarly, the example of teachers exerts a tremendous influence on their pupils. It is well known that example is better than precept. Therefore, if a teacher teaches one thing and sets another example, he will not only make himself the laughing-stock of his pupils but will also do incalculable harm to them. You will always find that the noble example set by the pure, useful, earnest and devoted life of a teacher is one of the most powerful influences for the proper formation of his pupils' characters.

The influence of discipline and example.

The necessity of giving our boys a practical bent has been indicated above. It has also been pointed out that handwork is considered by most of us to be degrading. If suitable Manual or Vocational Training is introduced in schools, it will not only tend to give the pupils a practical bent, but will also help in removing from their minds the wrong idea that manual labour is degrading. In this work also we really require initiative, enthusiasm and

Introduction of Manual and Vocational Training.

There are other difficulties also in our way, which are mainly due to the fact that imagination and sentiment play an important part in our lives. But the stern realities of life combined with your own earnestness, will help you in removing all these weaknesses and changing all wrong mentalities.

Others difficulties.

I revert to physical culture and character-building again. They are really two of the greatest needs of India and they are in fact allied subjects. I repeat again and again that if you consider your duty to have been done by teaching your boys the prescribed text-books and making them pass certain examinations, then you are absolutely mistaken. This is only a part of your duty. Further, if you leave the physical culture of your pupils to your drill masters only, then it means that you are shirking your duty. The teachers of every school should combine together to organise games, sports and scouting, and also study and apply the modern method of physical culture. Some of you, perhaps, think that you are unable to do anything unless Government or the management provides you with playgrounds and the necessary material. You should not forget that in your own school, you represent Government or the management. This is exactly what I meant by saying that your cause can suffer only through lack of initiative. If the teachers of a school exert themselves seriously, they can easily overcome difficulties ; the Department is always there to guide them and help them to success. I would like to see much more serious attention being paid to physical culture than is being done at present. The organisation of games, sports and scouting will help not only to improve the physique of your pupils, but will also help considerably in character building. In addition to this, every school should organise as many other activities as possible with a view to make the boys practical and to train their character.

Suggestions regarding physical culture and character building

can be done by earnest efforts in the right direction and by inviting the co-operation of parents.

If education makes a man fit for doing only one thing, that is, either clerical or literary work, then it is very defective indeed. Given proper training and suitable chances, the educated man ought to make a success anywhere and under any circumstances. He will be able to do so only if all his faculties are properly developed and trained. If we aim at developing all the faculties of our pupils and building their character and if, at the same time, we give them a practical bent, they will not feel helpless as they do at present, but each one will take up the profession which suits him best. For doing so, we, teachers, will have to change our own mentality and outlook first, so that we may be in a position to give the necessary turn to our teaching, with a view to change the mentality of our pupils. Every teacher should ponder over this question deeply and discuss it with his colleagues and superiors at every available opportunity. When he is thoroughly convinced of the defects in our mentality and outlook, his whole self will change, and, if he is a really enthusiastic teacher, hundreds of ideas will come to him in and out of the class-room, and he will be able to invent hundreds of devices with a view to achieve the desired object, which is simply this: that we should not merely teach our boys the prescribed text-books with a view to make them pass certain examinations, but we should make men of them by developing and training their bodies, minds and characters, and by giving them a practical bent. Provision for everything has been, or can be, made in our schools. It is for us to take the fullest possible advantage of the opportunities offered. Our cause can never suffer, and if it suffers at all, it will suffer through lack of initiative, lack of spirit and enthusiasm and lack of sustained effort.

We should change our mentality first and then that of our pupils.

hearted manner. It is well-known that in making ordinary articles for daily use in this world one has to take a great deal of trouble. It, therefore, stands to reason that for man-making we require the greatest of all human efforts, because man is the best, the highest and the noblest creation of God. You teachers are makers of men, and men made by you are makers of the world. No teacher can ever be successful unless he takes up his work enthusiastically and strains every nerve to perform the difficult task of man-making. The enthusiasm of a teacher is very catching, which is a very great advantage indeed. One half of his task is done by enthusiasm and the other half by initiative, vigilance, perseverance and incessant toil.

Education should not diverge from life.

May I now suggest the lines on which we should proceed to cure the helplessness of our young men? Just as stomach plays a very important part in maintaining the health of an individual, so the economic conditions of a country play an important part in determining the happiness of its inhabitants. Further, if a young man of average intelligence starts life in any profession after the necessary training, two great factors, which contribute towards his success, are physique and character. Therefore, in order to remove the helplessness of our boys, and to make a useful and happy race of men, we should in teaching them keep in view the economic and other conditions of life in the country. Hence it is necessary that the education we give should not diverge from life, but it should, so to say, proceed on lines parallel to the life of the people. We should prepare men—practical men—for all kinds of useful work in life, and not merely those who can either ply their pen or wag their tongue, or dream empty dreams and thus make themselves and others miserable. We should, in the case of each individual pupil, take a practical view of education and prepare each boy for some definite work in life. This

a machine. The young man with only a sort of defective mental training and with other faculties not properly trained, does not properly fit into the machine and is always a source of trouble. This can be cured if, in giving our pupils literary and theoretical instruction, we discourage cramming and aim at real mental training, and at the same time try to develop the practical side of their nature. This will tax the resourcefulness of the teaching profession to a great extent, but it must be done, if we are to make men and not mere clerks and dreamers, who have no place in this practical world.

Our deplorable attitude towards manual work.

I invite your attention to another important defect in our mentality. The so-called educated people consider manual work to be degrading. Our social customs have contributed a great deal to the formation of this wrong mentality. All work is noble and no work can be degrading. This mentality also must be changed if our schools are to produce useful young men.

The necessity of enthusiasm in teaching.

Teachers of Hyderabad, now you will understand why, in the beginning of my address, I used the same words of exhortation as were used to fire the enthusiasm of brave sailors just before they were going to enter big fights. My valiant band of teachers, you have also to fight—fight a great battle against ignorance and all the prejudices of centuries. The struggle is bound to be very hard and very long; therefore, you should gird up your loins and do your utmost in the fight. I am confident that the ultimate victory is yours provided that you do your work with a zeal and earnestness worthy of your great cause. It is really a very difficult task. We cannot change the present clerk-making process into a man-making process without a great deal of exertion. The first essential condition is enthusiasm. We can never succeed if we take up the work of improvement in a half-

in short, all his physical and mental faculties and his power to adhere to the best and highest principles of right and justice in dealing with men and affairs. All this is not covered by the sort of mental training which is given in our schools. It is good and useful as far as it goes, but it does not go far enough. Very often, it goes on wrong lines, because cramming is tolerated and even encouraged. We should discourage cramming and encourage real mental training and at the same time we should devote the greatest possible care and attention to the building and training of their bodies and characters.

The inefficiency of young men with defective mental training without practical training.

It has been stated above that almost all school-going boys during their education think of their future official positions. The parents, too, wait till the boy passes a certain examinatoin or takes a degree, and then father and son together begin the most tiring work of job-hunting by sending applications most persistently to various offices and paying visits most perseveringly to the officers concerned till the desired object is secured. But even as a public servant, a young man, who has read for examinations and who has not had all his faculties developed and trained, is not quite a success. He has received a sort of defective mental training and the practical side of his nature is undeveloped and untrained, therefore, his brain is generally full of unassimilated ideas causing mental indigeston. Such a young man is very often obsessed with a sense of undue self-importance; he is extremely sensitive and consequently very difficult to deal with. Owing to his defective training, he considers himself superior to all his colleagues and is always clammering for undue advancement. Consequently, he lacks co-operation and does not properly fit into the general scheme of things. As you know, all work in life generally consists of concerted human effort. We are required to put in team work, and each individual is part of

contribute towards this cure. The first step in this direction is to know the difficulties in our way. As has been indicated above, some people think that the helplessness of our educated men is due to the Indian system of education. We ought to know that in this regard the mentality of our people is to blame more than anything else. It may be surprising, but it is a fact that, when a boy in India goes to school for the first time, his parents begin to have vague dreams of his future official position. The ideas of the boy about his future also work in the same groove. This mentality does not exist in more advanced countries. The conditions of our country have, to some extent, contributed towards the formation of this deplorable mentality. The educated and cultured classes in this country generally try to secure official positions or take up literary work of some kind or other. They are a sort of a class by themselves. They take to what may be called learned professions and they have no inclination to do anything else. This is not a satisfactory state of things. If we want to advance, we must change this mentality and get out of this groove of thought and action.

Our fondness for passing examinations and obtaining degrees.

Another defect in our mentality is that we attach more importance to the passing of examinations and the obtaining of degrees and diplomas, than to training of character. Real education means the complete training of body, mind and character. But our mentality is so defective in this respect that a person, who has only passed a certain examination is called educated. His academic qualifications certainly show that he has had a sort of mental training up to a certain standard, but in the actual struggle of life, all his faculties are put to test, *viz.*, his capacity for work, his devotion to duty, his dealings with his subordinates, equals and superiors, his honesty, veracity and straightforwardness, his loyalty and co-operation, his consideration for others,—

is fortunate enough to have been endowed by nature with a good physique, there is not much chance of his being benefited by the physical training provided in most schools. We are thus neglecting our duty with regard to body-building.

Character building neglected.

There is another part of duty which is still more important and which is also being neglected in most schools. It is the building of character. There are a few institutions where some efforts are being made in this line and in which various activities are organised with a view to give the necessary training for the formation of character. But in most institutions very little attention is being paid to this important side of education.

The helplessness of educated young men

Many educated young men come to me almost every day asking for employment as teachers or clerks. Very often, I have to disappoint them by informing them with much regret that there is no vacancy. When I sympatise with them in their disappointment and with a view to help them suggest some other profession, they always express their inability to take up anything except a clerkship or a teachership. It may surprise you, but it is a fact that there are graduates who have been waiting for appointment as clerks or teachers for years and yet they have no inclination to take up any other kind of work in life. Why are our young men so helpless? Some times people level their criticism at Indian system of education. This is not fair. There is nothing wrong with our system of education. Under this system, a better type of young men can be turned out, if the teachers do their duty.

The service-seeking mentality of our people.

The helplessness of the educated young men of our country is due to many causes, but proper training can go a long way to cure it. I shall limit myself to what the teachers can

into the world, from our educational institutions, young men equipped with various educational qualifications. What is the mental outlook of these young men with regard to education? What is the object of their parents in getting them educated? What are the ideas of the public with regard to instruction in general? As we all know, there is one idea reigning supreme in almost every mind and one ultimate object in view of most people, and that is the securing of a place in a learned profession or a clerical appointment in a public or private office. This is the end-all and be-all of our education.

The economic value of our teaching.

Even in this respect let us see how far we have been successful. It takes an average boy eleven years to pass the Matriculation Examination. What is his earning capacity after having undergone that long training? In these Dominions, he can get, if he is fortunate enough to do so, a clerical appointment in the grade of Rs. 30-60, which means that, after eleven years' training he has been made fit to earn one rupee a day, and after twenty-one years' service, that is, after thirty-one years' training and experience, he will be able to earn two rupees a day. This much, as you all know, can be earned by a daily labourer after very little training. This is the economic value of the products of our institutions. In many parts of India, even a graduate can be had on Rs. 30, per mensem. Therefore, from the economic point of view, we are not in a position to say that we are very successful.

The results of our teaching on physical side.

From the physical point of view, too, our success is not very great. Do we give enough attention to physical culture? Do we not devote all our care to the teaching of books and leave the body to take care of itself? The arrangements in most schools for physical training seem to be made for the sake of form. They do not take up physical culture as seriously as they ought to do. The result is obvious. Unless a boy

great things from you. Do you know what is expected from the teachers of Hyderabad? I suppose the most natural answer to this question is that teachers are expected to teach. This is quite true, but teaching is such a vast subject and there are so many views of it, that I would like to answer this question in a slightly different manner, and in doing so, I would keep in view the expectations which your great names have raised in my mind. My answer is very simple and it is this: *Hyderabad expects every teacher to do his duty.* You will perhaps remember that such words were used at psychological moments on two historic occasions of quite a different nature. But these words are so simple and so appealing that they can appropriately be used on all those occasions where supreme human effort is particularly needed.

Teaching is the most important work in the world.

4. If there is in this world any work which requires supreme effort, it is teaching. The more civilised and advanced a nation, the greater the attention which it devotes to teaching and teachers. In fact, the amount of attention paid by a nation to teaching indicates correctly its progress on the path of civilisation and it determines its place among the nations of the world. The work of teaching, therefore, is of the utmost importance to humanity.

Have we done our duty and what are the results?

5. It is well known that doing one's duty in a great task is very difficult indeed. The success or failure of all human effort is judged by results. I hope you will excuse me if I place before you the results of our teaching, and then ask you to judge for yourselves how far we have been successful in doing our duty. I am not going to criticise our work in a captious spirit, but we, teachers, should always be glad to have our shortcomings pointed out to us. Besides, I have the privilege of being one of you. Let me ask you to consider for a moment the results of our teaching. We send

Presidential Address

BY

KHAN FAZL MOHAMMAD KHAN, M. A.,
Director of Public Instruction, Hyderabad-Deccan.

I am very thankful to the Teachers' Association for asking me to preside over their annual gathering. It has given me great pleasure to join this important function. The Annual Report, which we have just heard, shows much progress, and the office bearers and workers of the Association deserve our hearty congratulations on their success.

The Association should expand its activities on the practical side.

It is specially gratifying to know from the programme of this Conference that the Association is beginning to pay some attention to practical work. I am sure that the activities of the Association which have been organised with a view to improve methods of instruction will benefit teachers in general. I am glad to say that this step is in the right direction. The appointment of Sub-Committees on different subjects, specially on Physical Education and Vocational Training, shows that the Association is fully alive to the needs of the country. It is a matter of genuine pleasure to me that the Association is doing real work in right earnest, and that it is not merely an organisation for teachers to come together annually to hear addresses and speeches and to pass resolutions. I hope that the activities of the Association, on the practical side, will be continued and expanded with still greater vigour in the future.

Hyderabad expects every teacher to do his duty.

3. "The Hyderabad Teacher" and "The Hyderabad Teachers' Association" are great names. Great names always have great responsibilities and they raise great expectations in the human mind. We are, therefore, naturally expecting

(c) The proposal for the introduction of the system of Provident Fund in aided schools has also borne fruit, because the Director of Public Instruction has asked the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, to prepare a scheme after carefully studying the Provident Fund rules in vogue in different parts of India.

(d) The question of making Elementary Science an examination subject in the Osmania Matriculation and H.S. L. C. Examinations is receiving the consideration of the authorities concerned.

Financial condition of the Association.—Mr. Muhammad Eusuf, Assistant, Darul Uloom High School, and Mr. Gulam Mahmood, Assistant, Gosha Mahal Middle School, audited the accounts of the Association for 1337 Fasli (1928 A.D.).

The accounts show that in 1337 Fasli, the subscriptions amounted to a little over O. S. Rs. 1000/-, while the expenditure was O. S. Rs. 1078/- *viz.* Rs. 300/- for the magazine, Rs. 276/- for allowances and stationery expenses, etc., Rs. 218 for the Conference and Exhibition and Rs. 284/- for the travelling expenses of the representative to the All-India Teachers' Conference, Bombay. The credit balance of the Association during the year ending in Aban 1337 Fasli, including the savings of 1336 F., amounted to O. S. Rs. 650/4/-. The excess of expenditure over income this year is due to the fact that the Government grant towards the travelling expenses of the representatives for the All-India Teachers' Conference held in Calcutta has not been received yet.

The Hyderabad Teacher—The financial position of the magazine, which with the publication of the issue which is just out, has completed 3 years of its existence, deserves your special attention, as, with a few exceptions, the members of the Association do not subscribe to it individually. The magazine is being consequently run at a financial loss to the Association. We are, however, grateful to the Divisional Inspectors of Schools, Gulburga

(c) The proposal for the introduction of the system of Provident Fund in aided schools has also borne fruit, because the Director of Public Instruction has asked the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, to prepare a scheme after carefully studying the Provident Fund rules in vogue in different parts of India.

(d) The question of making Elementary Science an examination subject in the Osmania Matriculation and H.S. L. C. Examinations is receiving the consideration of the authorities concerned.

Financial condition of the Association.—Mr. Muhammad Eusuf, Assistant, Darul Uloom High School, and Mr. Gulam Mahmood, Assistant, Gosha Mahal Middle School, audited the accounts of the Association for 1337 Fasli (1928 A.D.).

The accounts show that in 1337 Fasli, the subscriptions amounted to a little over O. S. Rs. 1000/-, while the expenditure was O. S. Rs. 1078/- *viz.* Rs. 300/- for the magazine, Rs. 276/- for allowances and stationery expenses, etc., Rs. 218 for the Conference and Exhibition and Rs. 284/- for the travelling expenses of the representative to the All-India Teachers' Conference, Bombay. The credit balance of the Association during the year ending in Aban 1337 Fasli, including the savings of 1336 F., amounted to O. S. Rs. 650/4/-. The excess of expenditure over income this year is due to the fact that the Government grant towards the travelling expenses of the representatives for the All-India Teachers' Conference held in Calcutta has not been received yet.

The Hyderabad Teacher—The financial position of the magazine, which with the publication of the issue which is just out, has completed 3 years of its existence, deserves your special attention, as, with a few exceptions, the members of the Association do not subscribe to it individually. The magazine is being consequently run at a financial loss to the Association. We are, however, grateful to the Divisional Inspectors of Schools, Gulburga

owing to a misunderstanding, very few members applied. This misconception arose because those who were already members of other Co-operative Societies were under the impression that they would get themselves transferred when the Society would be established. The attention of the members, however, has been drawn again and they have been informed of the necessary particulars.

Miscellaneous—(1) During the year under report on receipt of sanction from Government, this Association was affiliated to the All-India Federation of Teachers' Associations, Cawnpore, with effect from 1st November, 1928. Mr. V. D. Hardikar, B. A., Head Master, Vivek Vardhini School and Mr. Syed Khairat Ali, Assistant Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, were elected to represent this Association at the Fourth Annual Conference of the Federation, held in Bombay during the Christmas of 1928. But as Mr. Khairat Ali could not go, Mr. Hardikar alone represented the Association at the Conference.

(2) The origin of the idea of establishing a library was explained in the last report. Accordingly, nearly a hundred copies of English and Urdu books on education have since been purchased. There is still a balance of nearly a hundred rupees in the fund and arrangements are being made to buy books with that amount.

(3) At the suggestion of the Central Executive Committee that a Central Teachers' Association for the Dominions should be formed, the Director of Public Instruction has asked the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, to prepare a draft constitution for such a Central Association, which will be ready shortly.

(4) The Government has been approached for a grant-in-aid to the Association and our application is receiving the consideration of the Education Department. In view of the useful work which the Association is doing, it is hoped that our request will be granted.

(5) The resolutions passed at the first and second Conferences of the Association were duly forwarded to the higher authorities through the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, and the following action has been taken in connection therewith:—

(a) 1335 F. (1926):—With regard to the provision of suitable buildings and play-grounds for schools, the Government is taking the necessary steps as far as the funds permit.

(b) In respect of Medical Inspection of Schools, the Director of Public Instruction has instructed the Divisional Inspector of Schools, Head Quarters to prepare a scheme for the same.

(c) The resolution regarding the curriculum of H.S. L.C. course is under the consideration of the H.S.L.C. Board.

(d) The Director of Public Instruction has drawn the attention of the authorities concerned to the resolution regarding adequate representation of teachers on the Board of Examiners and moderators in the Osmania Matriculation, H. S. L C. and Middle Examinations.

(e) The question of bringing the syllabus of the second additional languages in the Middle Examination to a uniform standard of efficiency is under the consideration of the Examination Branch of the Office of the Director of Public Instruction.

(*a*) *1337 Fasli (1929)*: —The Osmania University has been approached on the proposal for the amalgamation of the Osmania Matriculation and the H. S. L. C. courses of study. It is understood that a Committee has been appointed to consider the question of the amalgamation of the two systems

(*b*) A reply has been received from the Office of the Director of Public Instruction that the proposal for changing the school hours will be considered if the public also supports it.

owing to a misunderstanding, very few members applied. This misconception arose because those who were already members of other Co-operative Societies were under the impression that they would get themselves transferred when the Society would be established. The attention of the members, however, has been drawn again and they have been informed of the necessary particulars.

Miscellaneous—(1) During the year under report on receipt of sanction from Government, this Association was affiliated to the All-India Federation of Teachers' Associations, Cawnpore, with effect from 1st November, 1928. Mr. V. D. Hardikar, B. A., Head Master, Vivek Vardhini School and Mr. Syed Khairat Ali, Assistant Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, were elected to represent this Association at the Fourth Annual Conference of the Federation, held in Bombay during the Christmas of 1928. But as Mr. Khairat Ali could not go, Mr. Hardikar alone represented the Association at the Conference.

(2) The origin of the idea of establishing a library was explained in the last report. Accordingly, nearly a hundred copies of English and Urdu books on education have since been purchased. There is still a balance of nearly a hundred rupees in the fund and arrangements are being made to buy books with that amount.

(3) At the suggestion of the Central Executive Committee that a Central Teachers' Association for the Dominions should be formed, the Director of Public Instruction has asked the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, to prepare a draft constitution for such a Central Association, which will be ready shortly.

(4) The Government has been approached for a grant-in-aid to the Association and our application is receiving the consideration of the Education Department. In view of the useful work which the Association is doing, it is hoped that our request will be granted.

Primary course are still under the consideration of the Executive Committee. A brief account of the discussions on the question of revising the curriculum of History and Geography will be given by Mr. Ganesh Chand, B A., B. T., Assistant, Darul Uloom High School, when he moves his resolution on the subject.

Public Meetings.—The following three public meetings were held during the year under review :—

(1) At the St. George's Grammar School, an instructive and interesting lecture on "Education in rural schools" was delivered by Dr. Harold Mann, Agricultural Adviser to H. E. H. the Nizam's Government, under the chairmanship of Nawab Zulkadar Jung Bahadur, M. A., (Cantab). The full text of the lecture has already been published in 'The Hyderabad Teacher'.

(2) Professor Hudlikar delivered a lecture on 'The education of children' at the Viveka Vardhini Theatre. The meeting was presided over by Rev. F. C. Phillip, Warden, St. George's Grammar School and Vice-President of the Association.

(3) Professor T. Kulkarni (Gwalior) delivered a lecture on "Ideas on Education" at a public meeting held under the auspices of the Association at the Young Men's Improvement Society Hall under the presidentship of Mr. S. Ali Akbar, M. A, (Cantab), Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters and President of the Association.

Co-operative Society--It was stated in the last report that the bye-laws of the Co-operative Society had been framed and that they would come into force after the approval of the Executive Committee. Accordingly, after the bye-laws had been sanctioned, a prominent and active member of the said committee was appointed provisional secretary of the proposed Co-operative Society and it was announced that members desirous of joining the society should send in their applications to the Secretary. But

Members.—As per rules approved by Government, the membership of the Association is compulsory for all the teachers of the schools under the control of the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters. There was, therefore, no increase or decrease in the number of ordinary members. The number of members belonging to schools outside the said Division has, however, increased from 20 to 31.

Meetings of the Central Executive Committee—During the year under report, five meetings of the above Committee were held. The business transacted was as follows :—

(1) Drawing up in advance of a programme of monthly meetings for each quarter. (2) Preparation of the budget. (3) Election of office-bearers. (4) Appointment of auditors for checking the accounts of the Association. (5) Organisation of the annual conference.

Branch Meetings—During the year under review, at each centre six monthly meetings were held, at which the following subjects were discussed :—

(1) The problem of the "back-ward" boy. (2) The teaching of composition in language subjects. (3) Is it possible to reduce the period of the Primary course from 3 to 4 years? (4) Is there any need for revising the present curriculum of History and Geography in Primary and Middle sections? (5) Internal school examinations. (6) How far is it possible to introduce vocational instruction in the existing schools and what form should such instruction take in the various stages of instruction?

It is to be regretted that an account of the work done at each centre could not be published in the quarterly journal of the Association, as reports from the different centres were not received by the editors in time. It is hoped that in future the Branch Secretaries will send in the reports regularly.

The resolutions passed by the various branches of the Association on the question of reducing the period of the

fall into line if a signal is given in right quarters and the difficulties in the way are removed. The Association believes our President will see to it that such a signal is given. Rejoicing in this belief, we welcome him the more in our midst to-day.

Report of the Hyderabad Teachers' Association for the year ending in Amardad 1338 Fasli (June 1929)

BY

S. M. S. MUSHADI,

General Secretary, Hyderabad Teachers' Association.

LADIES & GENTLEMEN,

IT is gratifying that the Association has completed four and a half years of its life and we have assembled here to-day at its Third Annual Conference. The proceedings of this Conference will be conducted on more practical and business-like lines than those of the previous Conferences, because on this occasion we shall have the pleasure of hearing the reports of the five Sub-Committees appointed by the Association in April, 1929. These Sub-Committees have arrived at their conclusions after carefully considering from the practical point of view the subjects entrusted to them.

Branches of the Association.—During the year under report there were 14 branches of the Association as before, but at the request of the Principal, Chadarghat High School, the Chadarghat Branch was transferred to St. George's Grammar School, as in the former school there is at present no big hall where the monthly meetings of the Branch can be held conveniently.

extra day to be knocked off if any other day happens to be a holiday during a particular week. Further, many holidays given on religious grounds could be cut down. People whose orthodoxy cannot be called into question have confessed before me that some of the holidays could be dispensed with. When this is done we can have a summer vacation of two months—for secondary schools at any rate. If this is considered too much, a break of a month and half during summer and of ten days during winter must be provided for. In this connection, may I also call your attention to the necessity of reverting to the old practice of holding the annual examinations in winter? The present practice I believe is neither convenient to the teachers and examiners nor very agreeable to the students concerned.

As this is a conference of teachers belonging mostly to primary and secondary schools, I shall leave university education deliberately out of account except to point out that if more money is not spent on primary and secondary education, the university itself will not get good material which for its complete success it so badly needs.

I have presented before you so far one side of the shield. I do not however wish to give you the impression that teachers as a body are more sinned against than sinning. True, amongst this class there are many who would be considered an ornament to the profession in any country in the world. But these are the exceptions. The rule is for a teacher to be satisfied if he does enough work so as not to get into trouble. This will be bad enough even in a country where there is universal education. But in India it is a crime. Unless the teachers consider themselves not merely the paid servants of Government, but soldiers belonging to an army of social workers and undertake with enthusiasm extra responsibilities in addition to the teaching work in classes, the future of education in this country cannot be very bright. I however believe the majority of them will

regard to this matter, a change does not seem desirable. The Association is not discouraged by this. The matter will be pressed again. Here I shall respectfully invite the attention of our Director to a reconsideration of the matter. Many schools have been expecting it and will welcome it. A few persons might express disagreement. But in the interests of proper physical education I hope such disagreement would be overlooked.

As regards the question of holidays, it was at first proposed that a resolution should be moved at the Conference requesting the Department to appoint a thoroughly representative body to consider and revise the present list of holidays and place the list thus revised through the Director before the Commitee appointed by the Government for this purpose. As information reached us that this Committee had already finished its labours and submitted its findings to the Government, we thought any resolution in the matter would be out of place and so the matter was dropped. As this is a question that affects the efficiency of our work, I hope I shall be pardoned if I refer to it at length. Lest I should frighten some people here who might think I was proposing any increase in the total number of holidays, I shall set first their fears at rest by telling them at the outset that what I propose is not any increase in their number, but merely their redistribution. Many lay men think that teaching is a very easy kind of work and that teachers get too many holidays. I shall not waste any time in trying to convince these people. I shall address myself to students of psychology and education. These people know that there is no work that makes such heavy demands on nervous energy as the drudgery of school teaching. How can you expect conscientious teachers to teach day after day and month after month with a break of one day a week and yet keep up freshness and enthusiasm. We know from experience that it is impossible. Such being the case, would it be too much if I plead for a working week of five days, the

latter. Reform of the courses of studies and curriculum and the question of the introduction of vocational education are already under consideration. One need not dwell on these here except to point out that in the interests of economy a way should be found to do away with the present dual system of the matriculation and the H. S. L. C. courses.

A question that suggests itself here is whether when the above reforms are carried out the Matriculation results will be better than what they have been so far. Year after year hundreds of boys appear for this examination and the passes never go up beyond 30 per cent. What are the failures due to? The comparatively shorter period of the course from the Middle to the Matric is only partly responsible for this state of affairs. The real cause of this huge wastage is to be found in the lack of adequate and competent staffs at many of the Osmania High Schools. No improvement is possible unless more graduates are given. This is not all. The sort of people that are generally recruited for the teaching of History, Geography and English are with few exceptions not properly qualified to teach them. Indiscriminate recruitment may have been excusable when the supply available was small. At the present day only graduates possessing good degrees and fit in other respects should be appointed. In the case of Geography teachers even this is not enough. Until the University adds Geography to its courses of studies, the standard of teaching in schools of this subject will continue to be low.

Another badly needed reform concerns the hours of work in schools and the holidays. With regard to the first question, a resolution demanding a change from the present practice was passed last year. In the course of a personal talk Nawab Masood Jung Bahadur, the then Director expressed his agreement with the proposed change. The resolution was duly forwarded. The Association has received a reply to the effect that until there is unanimity of opinion with

myself to a consideration of a few pressing local problems in the field of education.

All round there is a cry for compulsory primary education. Though during the last ten years the number of boys in primary schools has increased from about 67,000 to about 2½ lacs still only about twelve per cent of the total population of school-going age is under instruction. In British India province after province is resorting to compulsory education to increase the percentage of literates. If a beginning is not made soon, we shall be left very far behind educationally. Our government has also approved of the principle of compulsion. I believe it is about to make a beginning. It is all to the good. But there is one aspect of the question that ought not to be overlooked. It is no use multiplying schools of the type we have at present. I shall go further and say that before compulsion is resorted to on an extensive scale, the existing primary schools, urban and rural, should be put right. Specially with regard to the latter I consider the following to be the most pressing needs:—

Ruralization of the curriculum of village schools, better type of recruits, their more intensive training with a view to fit them for the kind of rural up-lift work that is being done in some parts of Punjab, better buildings, provision of farms and gardens, more liberal scales of salaries where these are defective.

In the field of secondary education the scope for consolidation is greater. Amongst the most urgent requirements of secondary schools are the provision of better buildings and more play grounds. Until adequate funds are provided for these, one cannot hope for any appreciable improvement in the health and physique of school children. The need for medical inspection has already been emphasized by the Association. It will come sooner or later. But medical inspection without better buildings and more playgrounds will merely bring into prominence the need for the

series of Sub-committees dealing with purely technical questions. These have met a number of times and the fruits of their labours will be placed before you in the shape of brief reports for your consideration. The second reason for this departure is the need felt by the Association for consolidation as opposed to expansion. Education has progressed in Hyderabad at such a rapid pace recently that there is a danger of our getting very poor results from it if the work of consolidation is not taken up in earnest before the State launches on a further programme of expansion. Lest I should be misunderstood and considered on upholder of a policy of obscurantism because I am emphasizing here the need for consolidation rather than of expansion, let me state here that the statistics regarding education in the State reveal an appaling state of affairs and that there is need for more and more education of all kinds. Though I realise this, I believe also that it is much better to do a little thoroughly than attempt much in an inefficient and wasteful manner. So I wish to emphasize that it is time we paused a bit, took stock of the present situation, noted the weak spots in the structure and adopted measures to remedy them before we march forward. It is appropriate that a period like this sees the advent at the head of affairs of the Education Department of a sound educationist like our distinguished president. It is also appropriate that the first important public gathering whose deliberations he has kindly consented to guide, should be a body which has met to consider questions resting on his decision. I need not say that we feel honoured by his presence and that we believe that nothing but good will come out of this contact of the official head with the deliberations of a body like ours.

At the past conferences you have listened to the history, aims and work of the Association. What it has accomplished during the past year will be reported to you presently by the General Secretary. I shall therefore confine

The Third Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association Welcome Address

BY

AHMED HUSAIN KHAN, B. A.,

Principal, Darululoom High School

and Vice-President, Hyderabad Teachers' Association.

LADIES AND GENTLEMEN,

THE pleasant duty of welcoming our distinguished President and other eminent guests present here falls to my lot. On behalf of the Hyderabad Teachers' Association, I offer them a hearty welcome to this, the Third Annual Conference. From a perusal of the programme you will have noticed a slight but very important change in the organization of this year's Conference. This new departure,—new to Hyderabad, though familiar in other parts of India—has been necessitated by one or two important considerations. In the first place, educational conferences in the Dominions have of late shown a tendency towards multiplicity. Though this is a welcome change indicating an awakening on the part of the public towards the educational needs of Hyderabad, these conferences from the nature of their organisation could not but concentrate on the general as opposed to the technical aspects of education. Questions pertaining to the general policy, finance and organization, no doubt, interest the teachers assembled here. But there are other questions that affect their work more vitally. These concern the technical side of education There was a danger of this aspect being neglected. To remedy this defect, it has been considered necessary to constitute a

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

CONFERENCE NUMBER.

Vol. IV.] July, 1929 A. D. / Shahrewar, 1338 F. [No. 1.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan, Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

SECUNDERABAD - DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUND____BAD

1929.

Single Copy Annas 12. (Postage Extra).

رجسٹر شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴

آذر ۱۳۳۹ف م اکتوبر ۱۹۲۹ء

جلد (۴) — شمارہ (۲)

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

دائرۂ ادارت:-

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول

سید فخرالحسن ملا بی اے۔ بی ٹی (علیگ) مدیر

محمد عبدالنبی صدیقی بی اے۔ بی ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو پیدا کرنا۔
(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا
(۳) فن معلمی پر نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا

اصول

(ا) رسالہ کا نام حیدر آباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (عہ۸ا) فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ا ر) صرف اردو (۸ ر)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	ـــے	صہ ۸ ر	ســے ،
نصف صفحہ	صہ ،	عــہ ۱۲ ر	عہ ۸ ر
ربع صفحہ	عــہ ۸ ر	عہ ۶ ر	۱۵ ر
فی سطر	۱۰ ر	۸ ر	۶ ر

۱

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ آذر ۱۳۳۹ف م اکتوبر ۱۹۲۹ء

جلد (۴) شمارہ (۲)

فہرست

۲

افتتاحیہ

ناظم صاحب تعلیمات اور لازمی کھیل | جس روز حیدرآباد ایتھلیٹک اسوسی ایشن کے فٹ بال ٹورنمنٹ کا آخری مقابلہ ہوا۔ اس روز عالیجناب خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات نے بچوں کو مخاطب کرکے ایک نہایت نصیحت آموز اور پرجوش تقریر فرمائی جس میں آپ نے تحصیل علوم وکسب اخلاق کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں زیادہ حصہ لینے پر زور دیا۔ آپ کے جوش اور سرگرمی سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو بچوں کی جسمانی صحت وشگفتگی کسقدر عزیز ہے اور کھیلوں کی ترویج سے کتنی گہری دلچسپی ہے۔ آپ نے اپنی تبلیغی تقریر سے نہ صرف بچوں کے جائز جذبات کو ابھارنے پر اکتفا کی بلکہ ایک گشتی بھی جاری فرمائی جس کی رُو سے مدارس پر کھیلوں کا انتظام لازم کردیا گیا ہے۔

کھیل اور ورزش کی ضرورت ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے۔ اور جسمانی تندرستی اور دماغی و اعصابی نشوونما میں قریبی تعلق ہر زمانہ میں مانا گیا ہے۔ لیکن کیا ہم آج ورزش وتعلیم کی منافرت سے واقف نہیں کیا ہم یہ نہیں دیکھتے کہ سیکڑوں گریجویٹ کمزور لاغر و پژمردہ ہیں

اس بے توجہی سے جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ بارے موجودہ نسل نے اس غلطی کو محسوس کیا اور رفتہ رفتہ اس طرف توجہ کی جاری رہے۔

اس میں شک نہیں کہ فی الحال لازمی کھیل کی راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں سب سے بڑی دشواری کھیل کے میدانوں کی عدم موجودگی ہے۔ بلدہ حیدرآباد کے مدارس میں سے بعض ہی ایسے ہیں جن کے لئے کھیل کے میدان بدست ہیں۔ دوسرے مدارس برسوں سے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ لیکن اکثر اب تک کوئی میدان نہ حاصل کرسکے یہ تو اس وقت کا قصہ ہے جبکہ پورے مدرسہ کے لڑکوں میں سے صرف چند شریک گیمس ہوتے تھے۔ یہ بیحد حوصلہ افزا ہے کہ ناظم صاحب نے بازیگاہوں کے انتظام کو اپنے فرائض کے پروگرام میں سب سے پہلے جگہ دی ہے۔ ہمیں وثوق سے معلوم ہوا ہے کہ صاحب موصوف نے

خود دورہ کرکے بلدہ کے مدارس کے قریب میں موزوں بازیگاہوں کا معائنہ فرمایا اور اُن کے حصول کی سعی جاری ہے
دوسری دشواری مالی ہے اتبک جو چندہ کھیلوں کے واسطے طلبا سے جمع
کیا جاتا تھا اور وہ جو امداد سرکار سے ملتی تھی۔ دونوں بمشکل ان چند طلبا کیلئے سامان گیمس خریدنے
کے لئے کافی ہوتے تھے جنکو کھیلوں کی مشق کرانا مدرسہ اور گیم ٹیچر کی نیکنامی کے لئے ضروری تھا
لیکن جب کہ کھیلنے والوں کی تعداد تقریباً دس گنا بڑھ جائیگی یہ رقوم ہرگز کافی نہیں ہوسکتیں
بنابریں ہم پرزور سفارش کرسکتے ہیں کہ ہر مدرسہ کے لئے سرکاری امداد کم از کم اس قدر دیجائے جتنا
کہ اس مدرسہ میں سالانہ چندۂ گیم وصول ہوتا ہے اسوقت ممکن ہے کہ مدارس نئے اخراجات کی کفالت کرسکتیں
ان دو عملی دشواریوں کے علاوہ تیسری دشواری شاید انتظامی ہو گشتی کے اعتبار سے
چند مدرسین کی نگرانی کافی ہے۔ ہمارے خیال میں فقط نگرانی کافی نہیں اگر مدرسین خود کھیلوں میں حصہ
بھی لیں تو اس کا اثر زیادہ ہوگا اس میں شک نہیں کہ مدرسین پر نئے فرائض عائد ہوتے جاتے
ہیں اور جو معاوضہ ان کو مل رہا ہے وہ انکی دماغی کاوشوں کا معاوضہ نہیں ہوسکتا۔ دراصل انہوں نے
نونہالان قوم کو سنوارنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اس پیشہ کو اختیار کرکے اپنی علو ہمتی اور ایثار کا
ثبوت دیا ہے۔ اس لئے اُن محبان قوم، ان پرستاران وطن، ان جفاکش و جانفشان
سورماؤں سے ہمیں کامل توقع ہے کہ وہ اس دعوت عمل کو لبیک کہیں گے جو ان کے سپہ سالار
ان کے کانوں تک پہونچائی ہے اساتذہ خود تن دہی اور جوشش سے تعمیل احکام میں کوشاں ہوں
مبادا یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے اور نئی پود کو نکما ہیچ پوچ۔ اور مرزا پھویا بنانے کا داغ انکے
چمکدار ہاتھوں کو بدنما کردے۔

امتحان مڈل | چار سال سے امتحان مڈل سسکیاں لے رہا تھا۔ آخرکار اس کا وقت آپہونچا
اور امتحانات علوم مشرقیہ کی طرح یہ بھی کالعدم ہوگیا۔ اسمیں شک نہیں کہ اس نے اپنے دور زندگی
میں حقِ خدمت بخوبی ادا کیا۔ ابھی ان آنکھوں میں روشنی باقی ہے جنہوں نے حیدرآباد کے
زمانہ جاہلیت کو دیکھا اور اس پر آنسو بہائے ہیں۔ ابھی وہ دل متحرک ہیں جو ملک کے علمی افلاس
اور تعلیمی تہی مائگی پہ مدتوں تڑپے ہیں ابھی وہ دست و بازو سلامت ہیں جن کا زور ریاست میں علوم
جدیدہ کی ترویج میں صرف ہوا ہے۔ اسوقت مڈل کا امتحان مفید تھا اور ملک کو اس کی ضرورت تھی

لیکن زمانہ نے شاہراہ ترقی پر لمبے لمبے قدم بڑھائے ہیں اور علمی مطمح نظر بہت اونچا ہوگیا ہے اب مڈل کا امتحان اس لباس کے مانند تھا جو از کار رفتہ ہوجانے کے بعد اتار کر پھینک دیا جاتا ہے خواہ ابتداءً وہ کتنا ہی مفید اور کار آمد کیوں نہ رہا ہو۔ یہ وہ مادّہ فاسد تھا جس سے تعلیمی فضا عرصہ سے مسموم ہو رہی تھی۔ یہ امتحان اب بالکل غیر ضروری اور مضرت رسان ہوگیا تھا۔ اور اس کی مسدودی جناب خان فضل محمد خاں صاحب کے ان انتظامی شاہکاروں میں شمار ہوگی۔ جن کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔

مڈل کا امتحان گیا مگر اس کی جگہ دو امتحانوں نے لے لی۔ ایک تو ان طلبہ کے لئے جو فوقانی تحتانی مدارس کے خواہاں ہوں اور دوسرا ایسے لڑکوں کے لئے جو فوقانی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں موخر الذکر امتحان ایک بورڈ کے ذمہ رہیگا جس کے میر مجلس صدر صاحب سمت متعلقہ او معتمد مہتمم صاحب ضلع ہوں گے یہ امتحان ان تین میقاتی امتحانوں کے ماسوا ہوگا جو مدارس میں لئے جائینگے اس امتحاں سے اکثر فوقانی مدارس کے طلبہ مستثنیٰ رہیں گے۔ باقی فوقانیہ مدارس و وسطانیہ مدارس کے طلبہ کے لئے اس امتحان کی کامیابی اعلیٰ جماعت میں ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے

تعلیم بالغان اور تعلیم روزگاری | اس عنوان سے جو مضامین صفحہ ۱۵ اور ۲۲ پر درج کئے گئے ہیں یہ ان مفید لکچروں کا خلاصہ ہیں جن کو مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے اور مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے صدر جمعیتہ اتحاد باہمی کے تبلیغی جلسوں میں دیا تھا۔

مقدم الذکر مضمون نگار نے تعلیم بالغان کی ضرورت، اہمیت اور اس کے کامیاب مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اور ایک ایسی اہم عملی اسکیم پیش کی ہے جس کا نفاذ ملک سے جہالت دور کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے موخر الذکر مقالہ نگار نے تعلیم روزگاری کی اہمیت اور اس کے اہتمام پر کافی روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مروجہ تعلیم منشی یا بابو تیار کرتی ہے لہٰذا موجودہ نقائص کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ باشندوں کے پیشوں کی تعداد معلوم کی جائے اور ایک بورڈ کے قیام کی تحریک کی ہے جس کے صدر صدر المہام صاحب فینانس اور اس کے اراکین ناظم تعلیمات، ناظم صنعت و حرفت، ناظم زراعت، ناظم امداد باہمی اور چند بڑے پیشوں کے نمایندے ہوں۔

اگر ایسا بورڈ قائم ہوجائے اور تعلیم روزگاری کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغان کے نفاذ کی جانب ارباب حل و عقد توجہ فرمائیں تو ہر طبقہ اور پیشہ کی تعلیمی ضروریات پوری ہونگی، جہالت افلاس اور بے روزگاری کا مسئلہ حل ہوجائیگا اور یقین ہے کہ ملک پیدایش دولت میں لگ جائے گا۔

۵

ایک مخلصانہ پیام طلبہ کے نام

(از عالیجناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔اے۔ ڈیگر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی)

ذیل میں ہم ناظم صاحب تعلیمات کی وہ نصیحت آموز تقریر جو پچھلے دنوں موصوف نے فٹ بال ٹورنمنٹ کے آخری مقابلے کے وقت فرمائی تھی درج کرتے ہیں اس تقریر میں جس مشفقانہ انداز اور پرخلوص جذبات کے ساتھ طلبہ کو مخاطب کیا گیا ہے وہ ان کی سیرت سازی میں خالی از فائدہ نہ ہوگا ہمیں یقین ہے کہ موصوف کی سچی ہمدردی نونہالان ملک کے لئے ازبس مفید ثابت ہوگی۔

(شریک)

محترم خواتین، معزز حضرات، اور میرے عزیز بچو! مجھے آج کے جلسہ میں شریک ہوکر بہت خوشی ہوئی کہ مجھے فٹ بال کا دلچسپ کھیل دیکھنے اور انعامات تقسیم کرنے اور آپ سے گفتگو کرنے کا موقع حاصل ہوا جس کی مجھے بہت مسرت ہے سب سے پہلے میں ان طلبہ کو فرداً فرداً اور ان کی ٹیموں اور مدارس کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے اس سال مختلف کھیلوں میں فتح حاصل کی اور فتح کے خوبصورت نشانات حاصل کئے۔ ان طلبہ کے لئے اور ان مدارس کے لئے بہت بڑے فخر اور بہت بڑی خوشی کی بات ہے میدان میں نکل کر جیتنا آسان کام نہیں ہے۔ ہر شخص جو میدان میں نکل کر فتح حاصل کرتا ہے۔ وہ بہت بڑی عزت کا مستحق ہے۔ اور اسے خود بھی بہت خوشی حاصل ہوتی ہے

میں ان عہدہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے ان تمام ٹورنمنٹوں اور کھیل کا انتظام کیا خاص کر مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و معتمد اتھلیٹک اسوسی ایشن اور مسٹر برٹ پرنسپال نظام کالج و صدر کمیٹی فٹ بال سکشن و سکرٹری صاحبان و دیگر کارکنان کی انتھک کوششیں قابل شکریہ ہیں اور میں ان سب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس سال مدرسہ چادر گھاٹ کو بڑی عظیم الشان فتح حاصل ہوی اور اس مدرسہ کے ہر سہ شعبہ جات تحتانیہ، وسطانیہ، اور فوقانیہ نے فٹ بال کے کھیل میں میدان جیت لیا۔ اور شاگرد ان

فٹ بال میں بھی کامیابی حاصل کی ہیں مدرسہ چادرگھاٹ اور جیتنے والے طلبہ کو خاص طور پر مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ سال بھی مدرسہ چادرگھاٹ اسی طرح کامیابی حاصل کریگا۔ اور یہ بھی امید کرتا ہوں کہ دیگر مدارس بھی اسی طرح کھیل کے میدان میں امتیاز حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

کھیل میں کوشش کرنے کے متعلق میں چند باتیں طلبہ سے خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں دس سال قبل جب کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے تو مدارس کے طلبہ اس قدر زیادہ تعداد میں نہیں آیا کرتے تھے۔ جس قدر اب آتے ہیں۔ یہ اچھی علامت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کھیلوں کا شوق اب بڑھ رہا ہے۔ اور جب کوئی معرکہ کا کھیل ہوتا ہے تو طلبہ میں جوش بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی بہت اچھی علامت ہے۔ لیکن جوش کے اظہار میں تھوڑا سا نقص ہے۔ امید ہے کہ یہ بتدریج رفع ہو جائے گا۔ وہ نقص یہ ہے کہ جب کبھی دو مدارس میں مقابلہ ہوتا ہے تو جانبداری کے جذبہ کی جھلک ضرورت سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں جھگڑیوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ جو ہر ایک شریف انسان کے لئے نہایت نازیبا ہے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کا دل و دماغ ہر اچھی چیز کے لئے ہمیشہ کھلا رہنا چاہئے اس لئے جب دو مدرسوں کی ٹیمیں میدان میں کھیل رہی ہوں تو یہ فطرتی بات ہے کہ ہر ایک مدرسہ کے طالب علم کی خواہش یہ ہو کہ میرا مدرسہ جیت جائے لیکن جب کھیل کے میدان میں مقابلہ ہوتا ہے تو جو ٹیم بہتر ہوتی ہے عموماً وہی فتح پاتی ہے جو طالب علم کھیل کا مقابلہ دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ خواہ وہ ایک مدرسہ کے ہوں یا دوسرے مدرسہ کے ان کو چاہئے کہ میدان میں جب کبھی کوئی کھیلنے والا عمدہ کرتب دکھائے تو سب طالب علم اس کی قدر اور عزت کریں یہ مناسب نہیں ہے کہ صرف اپنے مدرسے کے طلبہ کے عمدہ کھیل پر مسرت کا اظہار کیا جائے اور دوسرے مدرسہ کے اچھے کھیل پر اظہار تحسین نہ ہو

میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ طلبہ کے فطرتی جذبات کو روکوں بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان جذبات کا اظہار اس طرح کیا جائے کہ اس سے سب لوگ خوش ہوں اسپورٹس مین شپ کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ کھیل میں کوئی کام ایسا نہ کیا جائے۔ جس سے دوسروں اور خاص کر مد مقابل کے دل پر برا اثر ہو اس کے علاوہ مدارس اور طلبہ کی یہ خواہش کہ ہمارا مدرسہ کھیل کے میدان میں کامیابی

حاصل کرے اس طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ طالب علم کھیل کے میدان کے گرد کھڑے ہو کر شور کریں بیجا شور کرنے سے بدنظمی پیدا ہوتی ہے ۔ مثلاً آج کسی شخص نے بے وقت سیٹی بجا دی ۔ اور کھیلنے والوں نے یہ سمجھ کر کہ ریفری صاحب کی سیٹی ہے کھیل بند کر دیا ۔ اگر مولوی عبدالمجید صاحب ریفری خاص طور پر کوشش نہ کرتے تو کھیل کا اسی وقت خاتمہ ہو جاتا ۔

کھیل میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مدد کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جملہ طالب علم اپنے اپنے مدارس میں کھیلنا شروع کر دیں ۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ ہر ایک مدرسہ میں صرف چند طالب علم ہوتے ہیں ۔ جو کھیل میں حصہ لیتے ہیں باقی تماشہ دیکھنے کے لئے آجاتے ہیں ، اور تالیاں بجا کر جا و بیجا نعرہ ہائے تحسین بلند کر کے اپنے خیال میں اخلاقی مدد دیتے ہیں ۔ یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ اگر کسی مدرسہ میں پانسو طالب علم ہوں ۔ اور پانسو کے پانسو کھیلیں تو مدرسہ کو پانسو کھیلنے والوں میں سے ٹیموں کے انتخاب کا موقع مل سکے گا اس سے طلبہ کا بھی فائدہ ہے کیونکہ ورزش سے ان کی صحت اچھی ہوگی ۔ اور مدرسہ کی ٹیم بھی بہتر ہو جائے گی میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ جملہ مدارس کے طالب علم کھیل میں شریک ہوں تاکہ وہ تعلیم کے اس اہم پہلو سے پورا فائدہ اٹھا سکیں کھیل کے میدان میں آ کر مقابلہ کا جو لطف انھیں آئے گا وہ کھیل کے باہر کھڑے ہو کر تالیاں بجانے میں نہیں آ سکتا ۔

اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ملک کو بہ حیثیت مجموعی کس طرح کے طالب علم چاہئیں اس میں شک نہیں کہ آج کھیل کا مقابلہ تھا ۔ اس لئے کھیل کا ذکر پہلے آیا ۔ لیکن کھیل تعلیم کا صرف ایک جزو ہے اس لئے تعلیم کے دوسرے اجزا کا ذکر بھی لازم ہے ، تاکہ طلبہ کو غلط فہمی نہ ہو ۔ ملک کو ایسے طالبعلموں کی ضرورت ہے ، جو لکھنے پڑھنے میں بھی اچھے ہوں ، اور ورزش جسمانی اور کھیل کے مقابلوں میں بھی اچھے نکلیں ۔ اور ان کے اخلاق بھی پسندیدہ ہوں ہمارے ملک کو ایسے طلبہ کی ہرگز ضرورت نہیں ہے ، جو صرف کتاب کے کیڑے ہوں ۔ اور جو اپنی صحت سے غافل ہوں ۔ اور غفلت سے اپنی صحت کو برباد کریں ۔ ہمارے ملک کو ایسے طلبہ کی بھی ضرورت نہیں جو صرف ورزش اور کھیل کے شائق ہوں اور لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ نہ ہوں ۔ ایسے طلبہ بھی ہمارے ملک کے لئے مفید نہیں ، جو لکھنے پڑھنے میں اچھے ہوں ، ورزش بھی کریں لیکن ان کے عادات اور اخلاق اچھے نہ ہوں ۔ اس لئے جملہ طلبہ کا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ اپنے دل و دماغ جسمانی صحت ، اخلاق و عادات سب کو اچھے سے اچھا

بنانے اور سب باتوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔

اے میرے عزیز بچو! اپنی اس عمر سے پورا فائدہ اٹھاؤ ابھی موقع ہے۔ سرکاری امتحانات اور کھیلوں کے مقابلے اس لئے ہیں کہ جوانی اور لڑکپن کی امنگوں سے پورا نفع حاصل کرو۔ ان باتوں میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کی کوشش کرو۔ ورنہ چند سال کے بعد جب یہ وقت گزر جائے گا تو کف افسوس ملتے رہ جاؤگے۔ وہ طالب علم کس کام کا جس کے دل میں یہ امنگ پیدا نہ ہو کہ میں امتحان کے میدان میں اپنے جوہر دکھاؤں اور اپنے ہمسروں میں عزت حاصل کروں! وہ طالب علم بھی کیا چیز ہے جس کے دل میں یہ جذبہ نہ پیدا ہو کہ کھیل کے میدان میں مردانہ وار اپنے کرتب دکھاؤں اور اپنے ہم عمروں میں امتیاز حاصل کروں!! اس طالب علم کی بھی کیا حقیقت ہے کہ جس کے دل میں یہ خواہش پیدا نہ ہو کہ میں اپنے اخلاق اور عادات ایسے اچھے کروں کہ دنیا میری عزت کرے

اے میرے عزیز بچو! یہ یاد رکھو کہ عمل کے میدان میں اور اپنے ملک اور مالک کی سچی اور وفا شعار خدمت کرنے میں وہ طالب علم بازی لے جائے گا، جو ہر بات میں پورا ہو تمام دنیا تعلیم اور تربیت میں سخت کوشش کر رہی ہے۔ ہمارا ملک ممالک غیر سے بہت پیچھے ہے۔ مثال کے طور پر میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ ہمارے ملک میں ہل کی نبڈی، یا جھٹکے، ٹانگے وغیرہ گاڑیاں بنتی اور استعمال کیجاتی ہیں، جو نہایت سست رفتاری سے چل سکتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں یعنے غیر ملکوں میں اعلیٰ موٹریں اور اعلیٰ ہوائی جہاز بنتے ہیں، جو دو دو سو تین تین سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ تیز چلتے ہیں۔ یہ ترقی آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ترقی کے حاصل کرنے کے لئے بہت سخت محنت کی ضرورت ہے

اے میرے عزیز بچو! سرکار نے اپنی فیاضی سے تعلیم کا پورا انتظام کر دیا ہے اور وظائف ایشیا و یورپ بھی منظور فرمائے ہیں اس ملک کی آیندہ ترقی کا انحصار موجودہ زمانے کے طلبہ پر ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی تعلیم کی ترقی میں پوری طرح کوشش کریں گے

اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ میری اس تقریر کا یہ مقصد ہے کہ طالب علموں کو بتا دوں کہ ان کا مطمح نظر کیا ہونا چاہئے۔ اور حصول مقصد کے لئے ان کو کیسی سخت کوشش کرنی چاہئے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ آپ کو اپنے مقصد تعلیمی میں کامیابی عطا فرمائے اور ملک و مالک کی سچی خدمت کی توفیق دے۔

۹

تعلیم بالغان

(از جناب سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے کینٹب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و اطراف بلدہ)

تعلیم بالغان سے مراد اُن اشخاص کی تعلیم ہے، جو اپنے سن یا کاروبار کی وجہ سے معمولی مدارس میں شریک نہ ہو سکیں۔ ان ممالک میں جہاں لکھنا پڑھنا عام ہو، تعلیم بالغان کی تحریک کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ جو معلومات کسی مرد یا عورت نے طالب علمی کے زمانے میں حاصل کی ہوں انھیں نہ صرف تازہ ہی رکھا جائے بلکہ ان میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ انگلستان میں ۱۸۷۰ء سے ابتدائی تعلیم ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے جبری ہے اب سارے ملک میں کوئی متنفس جاہل مطلق نہیں رہا اس لئے وہاں تعلیم بالغان کا مقصد اڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی نے حسب ذیل قرار دیا ہے۔

چونکہ جمہوریت کا اقتضا یہ ہے کہ اس کے تمام افراد امور ملکی میں عملی حصہ لیں اس لئے ایک جمہوری ملک میں تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہر فرد نہ صرف اپنے ذاتی یا خانگی یا اپنے پیشہ کے فرایض کو بخوبی انجام دینے کے لائق ہو بلکہ سب سے بڑھکر وہ سمجھ سکے کہ ملک نے اس پر بحیثیت شہری کے کیا فرائض عائد کئے ہیں اور ان کو ادا کرنے میں اسے کیا کرنا چاہئے بالفاظ دیگر وہ اپنے ملک کی گزشتہ تاریخ سے واقف ہو اور یہ جانے کہ دیگر اقوام میں اس کے ملک کا کیا درجہ ہے اور وہ کونسے معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل ہیں جن پر ان کے ملک کا انحصار ہے۔

ہندوستان میں تعلیم بالغان کا مسئلہ جن اصول پر تعلیم بالغان کی تحریک مبنی ہے وہ حالات کے اعتبار سے ہندوستان میں زیادہ اہم اور امریکہ جاپان اور یورپ جیسے ترقی یافتہ ممالک سے جدا ہے۔ یہاں خواندہ اشخاص کی جو تعداد ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے مردم شماری کی اصطلاح میں خواندہ سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنی مادری زبان میں کسی دوست یا رشتہ دار سے معمولی خط و کتابت کر سکے۔ اس اعتبار سے ہندوستان میں ۷½ فی صدی اشخاص خواندہ ہیں سب سے پہلے ہمیں خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جبتک ملک میں تعلیم عام نہ ہو ہمارے ملک میں تعلیم بالغان کا مقصد اس قدر اعلیٰ و ارفع نہیں ہو سکتا جتنا کہ انگلستان کے لئے اڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی نے قرار دیا ہے۔

پرائمری تعلیم یہ امر غور طلب ہے کہ جہالت کی تاریکی کو دور کرنے کے لیئے اب تک کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور کن تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں میں جابجا پرائمری مدارس عرصہ سے قائم ہیں لیکن جس قدر مصارف پرائمری تعلیم پر ہو رہے ہیں اور جیسی توجہ مبذول کی گئی ہے اس کے مطابق خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ مردم شماری سے ظاہر ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں باوجودیکہ مجموعی طور پر آبادی بڑھ گئی ہے اور تعداد طلبہ میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ خواندہ ذکور کی تعداد میں بجائے اضافہ کے کمی واقع ہوی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ قصہ یہ ہے کہ بہت سے اشخاص جو تحتانیہ مدارس سے تعلیم پاکر نکلتے ہیں۔ وہ کتاب کو بالائے طاق رکھدیتے ہیں چند سال میں طالب علمی کے زمانکا پڑھا لکھا نسیاً منسیا ہوجاتا ہے۔ یہ افسوسناک رجعت دیہات میں بہت عام ہے بخلاف اس کے شہروں میں یہ مرض اس قدر عام نہیں ہے جہاں پھر بھی پڑھنے لکھنے کے مواقع حاصل ہیں۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں کچھ نہ کچھ علمی چہل پہل ضرور نظر آتی ہے اور عمدہ مدارس اور کالجوں کے علاوہ کتب خانے بھی موجود ہیں لیکن دیہاتی زندگی کی نوعیت عموماً ایسی ہوتی ہے کہ تحتانی تعلیم سے فراغت پانے کے بعد لکھنے پڑھنے اور علمی مشاغل کے جاری رکھنے کے لیئے نہ تو کوئی ترغیب و تحریص ہوتی ہے اور نہ موقع ہی ملتا ہے۔ لہذا سب سے پیشتر جیسا کہ اوپر اس کا ذکر آچکا ہے ہمیں ملک میں تعلیم عام کرنے کی سخت ضرورت ہے جس کو موجودہ حالات کے تحت کم سے کم نصف صدی کا عرصہ لگے گا۔ مگر جس رفتار سے اور قومیں ترقی کر رہی ہیں اس کے مدنظر ہر محب قوم کی یہی خواہش ہے کہ جلد سے جلد تعلیمی پستی دور ہو اور ملک میں خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کیا جائے مگر مفید شہری بننے کے لیئے جن اوصاف کی ضرورت ہے ان کے پیدا کرنے کے لیئے محض ابتدائی تعلیم کا نسخہ کسی طرح کافی نہیں ہے کیونکہ حالات موجودہ کے تحت کی کرائی محنت ضائع جارہی ہے اور لوگ ابتدائی تعلیم ختم کر کے تھوڑی ہی مدت میں پڑھا پڑھایا بھول کر پھر قعر جہالت میں جا گرتے ہیں اس کا ارتفاع اسی وقت ممکن ہے جب ہم بچوں (آئندہ شہریوں) کے علاوہ پختہ عمروں یعنے موجودہ شہریوں کی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔ ہندوستان میں اس تحریک کا علمبردار پنجاب ہے جہاں اس وقت ساڑھے تین ہزار مدارس بالغان موجود ہیں جن میں کم و

ایک لاکھ طلبہ پڑھ رہے ہیں ہمارے ہاں گذشتہ تین سال سے بتدریج مدارس شبینہ کھل رہے ہیں ۔ مگر یہ تحریک ابھی ابتدائی حالت میں ہے ۔ اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے ایک زبردست پروپاگندہ کی ضرورت ہے ۔

تعلیم بالغان کی ضرورت اگر پختہ عمروں کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے تو اس سے حسب ذیل فوائد مترتب ہوں گے ۔

(۱) اگر ہندوستان کے ہر شہر اور موضع میں ابتدائی تعلیم جبری بھی کر دی جائے تو کروڑہا اشخاص ایسی عمر کے نکلیں گے جو معمولی مدارس میں نہ شریک ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے کاروبار کی وجہ مدارس کے اوقات کی پابندی کر سکتے ہیں ایسے اشخاص جاہل کے جاہل ہی رہیں گے ۔ لہذا جبری تعلیم کے ساتھ پختہ عمروں کی تعلیم کا بھی انتظام کرنا چاہیے تاکہ جہالت کی تاریکی ملک سے بہت جلد دور ہو ۔

(۲) دیہاتیوں کو چونکہ پڑھنے لکھنے کے مواقع کم ملتے ہیں لہذا جبری تعلیم کے نفاذ کے بعد بھی یہ اطمینان نہیں ہو سکتا کہ ابتدائی مدارس میں جو کچھ انہوں نے سیکھا ہے اس کو وہ نہیں بھولیں گے لیکن اگر تعلیم بالغان کا انتظام کیا جائے تو یہ خطرہ باقی نہیں رہے گا ۔ جہاں ابتدائی تعلیم جبری نہیں ہے ۔ وہاں مدارس بالغان کی اور بھی ضرورت ہے کیونکہ جن اشخاص نے پرائمری مدارس میں تعلیم بھی پائی ہے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو لکھنا پڑھنا سیکھنے سے پیشتر ہی مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں

(۳) پرائمری تعلیم کا مقصد اولین یہ ہے کہ بچے لکھنا پڑھنا اور معمولی حساب سیکھ لیں ۔ یہ تعلیم ان کے لئے مفید اور کارآمد ضرور ہے لیکن اپنے ذاتی پیشہ اور خصوصاً شہری فرائض انجام دینے کیلیے تعاریہ کافی نہیں لہذا ان کیلئے اونچا نوں کا انتظام کیا جائے تو وہ اپنے معلومات کو نہ صرف تازہ رکھیں گے بلکہ ان میں اضافہ بھی کر سکیں گے ۔

(۴) پختہ عمروں کا مدرسہ کسی گاؤں یا محلہ کے مختلف فرقوں اور پیشوں کے افراد میں باہمی میل جول اور اتحاد پیدا کرنے کا زبردست آلہ بن سکتا ہے ۔ اگر اساتذہ اچھے ہوں تو وہ متعلمین میں نہایت خوش گوار تعلقات پیدا کر سکتے ہیں ۔

(۵) اس وقت ہندوستان کے تعلیم یافتہ افراد اور عوام میں جو مغائرت ہے وہ تعلیم بالغان

سے ایک حد تک دور ہو جائے گی۔

(۶) تعلیم بالغان کی بدولت کاروباری لوگ فرصت کے اوقات کا مفید استعمال کریں گے اور بیکار گپ شپ اور لڑائی جھگڑے کم ہو جائیں گے اس سے ان کے اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا اور ان کی زندگی کا معیار بلند ہو جائے گا۔

(۷) تعلیم بالغان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب والدین خود تعلیم پانے لگیں گے تو وہ اپنی اولاد کی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لیں گے اور ان کے اخلاق بھی کچھ نہ کچھ درست ہو جائیں گے۔ جب ان کے گھروں کی حالت بہتر ہو جائے گی تو اس کا اثر اولاد کی تربیت پر اچھا پڑیگا۔

نصاب اور طریقہ تعلیم جن اشخاص نے سرے سے مدرسہ میں تعلیم ہی نہ پائی ہو یا اگر تھوڑی بہت پائی بھی ہو تو لکھنا پڑھنا سیکھنے سے قبل مدرسہ چھوڑ دیا ہو ان کو اعلیٰ تعلیم نہیں دیجا سکتی اور وہ پرائمری مدارس کا نصاب ان کے لئے موزوں ہو سکتا ہے یہ ظاہر ہے کہ قصہ گوئی سبق الاشیا ڈرل اور ڈرائنگ جیسے مضامین میں پختہ عمروں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی ہے۔ ناخواندہ یا نیم خواندہ اشخاص کے لئے اولاً اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور روزمرہ کے حساب کتاب سے واقف ہو جائیں۔ . . . .

. . . اور اس کے علاوہ لکچروں کے ذریعہ ایسی معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں جو ان کی اخلاقی اور معاشی بہبودی اور صحت جسمانی سے متعلق ہوں پختہ عمروں کے لئے مندرجہ ذیل مضامین دلچسپ ہیں۔

مقامی تاریخ، حفظان صحت، جغرافیہ، انجمن ہائے امداد باہمی، سیونگ بنک، ملکی نظم و نسق، مقامی صنعتیں، متعدی امراض، فلاح اطفال (چائلڈ ویلفیر) اور (دیہاتی رقبوں میں) زراعت اور امراض مویشی وغیرہ۔ حتی الامکان شروع میں ایسے مضامین کا انتخاب کیا جائے جن کا لگاؤ متعلمین کے کاروبار سے ہو لکچروں کے سننے اور ان کے فوائد کا تجربہ اٹھانے کے بعد ان کا تعلیمی شوق بڑھتا جائے گا اور وہ دوسرے مضامین میں بھی دلچسپی لینے لگیں گے۔ بڑے شہروں میں مقررین کی کمی نہیں ہے البتہ ان کی فراہمی کے لئے کوشش درکار ہے۔ موسمی تعطیلات میں یونیورسٹی کے طلبہ سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ دیہات میں مقررین کا ملنا ذرا دشوار ہے مگر یہ مشکل یوں رفع ہو سکتی ہے

کہ دورہ کرنے والے عہدہ دار سرکاری کام سے فراغت پاکر شام کو مدرسۂ بالغان کا معائنہ کریں اور ایسے مبحث پر تقریریں جو اہل دہ کے لئے مفید اور دلچسپ ہو۔ اس طرح علاوہ اور فوائد کے سرکار اور رعایا میں بہتر تعلقات قائم ہوں گے۔

تعلیم بالغان کے لئے لاسلکی یورپ اور خصوصاً انگلستان اور جرمنی میں پختہ عمروں کی تعلیم کے لئے
سینما اور طلسمی فانوس وائرس (لاسلکی) سینما اور میجک لینٹرن (طلسمی فانوس) کا کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دو سال قبل جب میں شہنشاہی تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان گیا ہوا تھا، وہاں لاسلکی کے ذریعہ جو کام ہو رہا ہے، اس کو دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوی۔ میرے قیام کے زمانے میں سورج گرہن ہوا، جس کے ایک روز قبل پروفیسر ٹرنر ایک ماہر علم ہیت کی تقریر سارے ملک میں منتشر (براڈکاسٹ) کی گئی۔ اس تقریر کا کچھ حصہ میں نے بھی سنا پروفیسر صاحب نے اپنی تقریر کو اس قدر آسان اور دلچسپ بنایا تھا کہ بچے بھی سمجھ سکتے تھے۔ مقررین کی فراہمی میں جو دشواریاں پیش آتی تھیں وہ لاسلکی سے بہت کچھ دور ہوگئیں اور اس کے بدولت مختلف مفید معلومات میں اضافہ ہونے کے علاوہ گھر بیٹھے اعلیٰ درجہ کی موسیقی سننے کا موقع بھی ہاتھ لگا

سینما کو بھی بحیثیت ایک ذریعہ تعلیم کے یورپ میں بہت ترقی دیجا رہی ہے۔ جغرافیہ، حفظان صحت، زراعت اور صنعت و حرفت کی معلومات بہم پہونچانے میں اس کا استعمال بیحد مفید ثابت ہوا ہے لندن میں امپیریل انسٹیٹیوٹ نے ہندوستان کنیڈا۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ وغیرہ کے طبعی، معاشرتی اور معاشی حالات سے متعلق جو فلم تیار کئے ہیں، وہ قابل دید ہیں تعلیمی فلم کی تیاری میں جرمنی نے انگلستان سے زیادہ ترقی کی ہے۔ یورپ میں سینما کی مقبولیت کے باوجود میجک لینٹرن سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں لاسلکی ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور سینما کو ذریعہ تعلیم بنانے کا خیال بھی پیدا ہو چلا ہے بعض حصوں میں سفری سینما (Travelling Cinema) کا انتظام بھی کیا گیا ہے جو نہایت مسرت بخش ہے۔ مگر جب تک لکھنا پڑھنا عام نہ ہو سینما سے وہ فوائد مترتب نہیں ہو سکتے ہیں جو یورپ میں ہوئے اور ہو رہے ہیں، کیونکہ کسی فلم کے سمجھنے کے لئے سرخیوں کا پڑھنا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فلم کو زبانی بھی سمجھایا جا سکتا ہے مگر زبانی سمجھانے کے لئے۔

سینما سے زیادہ میجک لینٹرن موزوں ہے۔ ہندوستان کے شہروں میں میجک لینٹرن کے لکچر کا اہتمام ہو چلا ہے بمبئی میں وزیول انسٹرکشن یعنے عینی مشاہدہ کے ذریعہ تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے اور خاص اسی کے لئے ایک انسپکٹر مقرر ہوا ہے جو دورہ کر کے میجک لینٹرن کی مدد سے طلباء کو مفید باتیں بتاتا ہے۔ میسور میں بھی مدارس فوقانیہ کو میجک لینٹرن دی گئی ہیں اور مددگار رسائٹس کو اس کی حفاظت اور استعمال کے صلہ میں دس روپیے الاونس ماہانہ دیا جاتا ہے۔ سلائیڈز مختلف مدارس میں باری باری سے گشت کرائے جاتے ہیں اور تہواروں کے موقع پر میجک لینٹرن ڈسٹرکٹ بورڈ کو دیجاتی ہے تاکہ پبلک بھی اس سے مستفید ہو سکے۔ میسور گورنمنٹ کے زیر غور یہ بھی مسئلہ ہے کہ دیہات میں اسی قسم کا انتظام کیا جائے۔

افسوس ہے کہ ممالک محروسہ سرکارعالی میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے صرف بڑے بڑے فوقانیہ مدارس میں میجک لینٹرن کا انتظام ہے لیکن عوام کو اس سے فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ صدر جمعیتہ اتحاد امداد باہمی نے چھ میجک لینٹرن اور تین ہزار کے سلائیڈز کا انتظام کیا ہے تقاریر ملکی زبان میں زراعت، امداد باہمی اور تعلیم پر ہوتی ہیں سال گذشتہ جب نظام ریلوے نے سفری نمایشی گاڑی تمام ریلوے مقامات پر بھیجی تھی تو جمعیتہ مذکور کا نمایندہ امداد باہمی کے فوائد پر تقریر کرتا تھا لیکن یہ تمام جدوجہد کسی خاص اصول کے تحت ہونا چاہیے جس کی تنظیم اسی وقت ممکن ہے جب کہ پختہ عمر اشخاص کے لئے کافی تعداد میں شبینہ مدارس قائم ہو جائیں غرض کہ اسباق کے موضوع جو صفحہ قرطاس پر بیجان اور مردہ معلوم ہوتے ہیں اور جو فضا میں ایک گونج سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، سینما اور طلسمی فانوس کے پردہ پر ان کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے اور دل پر گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے

حیدرآباد جیسے شہر میں دو تین میجک لینٹرنیں کافی ہوں گی جن سے باری باری مختلف محلوں میں کام لیا جاسکتا ہے۔ اضلاع میں علاوہ مدارس فوقانیہ کے مہتمم تعلیمات اور مددگار رجسٹرار برائے امداد باہمی کو ایک ایک لینٹرن دیجائے تو حین دورہ دیہات کے باشندوں کو کارآمد باتیں بتائی جاسکتی ہیں۔ مدارس شبینہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہوئے تو ہر ضلع میں نہ سہی مگر

ہر صوبہ میں ایک خاص انسپکٹر کے تقرر کی ضرورت ہوگی۔

اساتذہ، درسی کتب اور مدت تعلیم اوپر اس کا ذکر آچکا ہے کہ مدارس بالغان کا اولین مقصد یہ ہے کہ ان پڑھ یا نیم خواندہ اشخاص مادری زبان میں پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں۔ اس خصوص میں تین سوال اہم ہیں۔

(۱) اساتذہ کا انتخاب (۲) درسی کتب (۳) مدت تعلیم۔

(۱) اگر کسی مدرسہ بالغان میں صحیح طریقہ پر تعلیم نہ دی جائے تو بہت جلد تعداد گھٹ جائیگی اور منتظمین کی محنت رائگاں جانے کا اندیشہ ہے جو طریقہ بچوں کے لئے مفید ہے وہ بڑوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا اس لئے نارمل اسکولوں کو جو مدرسین اور امیدوار ٹرینگ کے لئے بھیجے جاتے ہیں اگر ان میں سے چند کو پختہ عمروں کو تعلیم دینے کا طریقہ بھی بتایا جائے تو اس سے اس تحریک کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ اساتذہ کے انتخاب میں یہ ملحوظ رہے کہ بااثر مدرسین منتخب ہوں جن پر گاؤں کے لوگوں کا اعتماد نہ ہو اور ان کی شخصیت شاگردوں کے دل میں وقعت پیدا کر سکے جو تعلیم دیجائے وہ نہ صرف دلچسپ اور دلکش ہو بلکہ حتی الامکان اُسکا تعلق عملی دنیا اور متعلمین کے کاروبار سے ہو۔

(۲) مدارس تحتانیہ کے کتب، مدارس بالغان کے لئے موزوں نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ بچوں کی دلچسپی کو ملحوظ رکھکر لکھی گئی ہیں لہذا پختہ عمر اشخاص کے لئے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو ادبی حیثیت سے بچوں کی کتب کے معیار کے برابر ہوں مگر مضامین پختہ عمروں کے مذاق اور ان کے کاروبار سے متعلق ہوں۔ پنجاب میں اس قسم کی کتابیں تیار کی گئی ہیں مگر وہ ہماری یہاں کے پختہ عمر اشخاص کے لئے موزوں نہیں ہیں اگر یہ تحریک عام ہو جائے تو ہم کو خاص کتب کی تیاری کا انتظام کرنا پڑے گا۔

(۳) مدت تعلیم کا انحصار پڑھنے لکھنے اور حساب کے معیار پر ہے پنجاب کے ایک عہدہ دار تعلیمات نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر ہفتہ میں چھ دن روزانہ دو گھنٹے تعلیم دیجائے تو معمولی نوشت و خواند ابتدائی حساب کے سیکھنے کے لئے چھ مہینے کی مدت کافی ہوگی میسور میں تو یہ تجربہ کیا جا رہا ہے کہ تین ہی مہینے میں تعلیم ختم کیجائے۔ اس کی کامیابی کے متعلق خود ناظم صاحب تعلیمات

نے جب کہ میں بنگلور گیا ہوا تھا اپنے شک کا اظہار کیا۔ بلدہ میں مجھے جو تجربہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ متعلمین چھ مہینے میں آسان الفاظ اور جملے پڑھنا سیکھ جاتے ہیں لیکن مردم شماری کی رپورٹ میں خواندگی کا جو معیار قرار دیا گیا ہے اس کو نہیں پہنچتے اگر مدت تعلیم ۹۔ ماہ قرار دیجائے تو متعلمین اس قابل ہوسکتے ہیں کہ آسان کتابیں اور اخبار پڑھ سکیں اور معمولی خط وکتابت کرسکیں کوشش اس امر کی کرنی چاہئے کہ پختہ عمر اشخاص میں تعلیمی شوق پیدا ہوجائے تاکہ وہ اخبار بینی اور کتب بینی جاری رکھیں اور مدرسہ سے نکلنے کے بعد بھی لکچروں میں شریک ہوا کریں۔ فارغ التحصیل متعلمین کو پنجاب لیٹریسی سرٹیفکیٹ (یعنے سند خواندگی) دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ترغیب وتحریص دلانے کے لئے مفید ہے، خصوصاً سرکاری یا غیر سرکاری چھوٹی خدمات پر تقرر کے وقت ان صداقت ناموں کا لحاظ کیا جائے۔

ایجنسی برائے تعلیم بالغان پختہ عمروں کی تعلیم کی اشاعت بغیر گورنمنٹ کی دلچسپی ہمدردی اور امداد کے ممکن نہیں۔ سرکاری مدارس میں شبینہ جماعتوں کا افتتاح کرنے کے علاوہ گورنمنٹ کو چاہئے کہ لوکلفنڈ کمیٹیوں اور امدادی مدارس کو ایسی جماعتوں کے قیام کی ترغیب دلائے اور نیز امداد سے دریغ نہ کرے۔ اس کے ساتھ پبلک کی دلچسپی بھی ضروری ہے پنجاب میں تعلیم بالغان کو جو ترقی ہوی وہ انجمن ہائے امداد باہمی کی کوشش کا نتیجہ ہے بعض انجمنوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی رکن تاریخ شرکت سے دو سال کے اندر لکھنا پڑھنا نہ سیکھ لے تو وہ انجمن سے خارج کیا جائے۔ علاوہ انجمنوں کے ریلوی کمپنیاں اور بڑے بڑے کارخانے اپنے ملازمین کے لئے مدارس شبینہ قائم کر کے ملک سے جہالت کو دور کرنے میں بہت کچھ حصہ لے سکتے ہیں۔ فوج میں بھی تعلیم بالغان کی اشاعت کے لئے وسیع میدان ہے۔ اسی طرح قید خانوں میں بھی انتظام کیا جاسکتا ہے۔ جس سے انسداد جرائم اور قیدیوں کو مفید شہری بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ ممالک محروسہ میں دارالضرب ٹیلیفون تعمیرات اور صفائی کے انچ ھ ملازمین کے لئے شبینہ مدارس قائم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کسی شبینہ مدرسہ کے انتظام کے لئے جو کمیٹی مقرر کی جائے اس میں محلہ یا گاؤں کے سربرآوردہ اشخاص کو شریک کرنا چاہئے اور فارغ التحصیل متعلمین کو بھی بلحاظ موزونیت کمیٹی کی رکنیت کے لئے انتخاب کرنا مفید ہوگا۔

کتب خانے | ملک میں تعلیم عام کرنے کے لئے مدارس شبینہ کے ساتھ کتب خانوں کا قیام بھی نہایت ضروری ہے تاکہ مدرسے سے نکلنے کے بعد ان لوگوں کو مطالعہ جاری رکھنے اور ذاتی سعی سے اپنے معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع مل سکے۔ بحالت موجودہ ہر گاؤں میں کتبخانے کا قیام دشوار ہے لیکن ہر تعلقہ میں ایک گشتی کتب خانہ قائم کیا جائے تو تمام دیہات کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ ریاست بڑودہ میں گشتی کتب خانوں کے قیام سے نہایت عمدہ نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ اس وقت ریاست مذکور میں تقریباً ۸۰۰ دیہاتی کتبخانے موجود ہیں اور سالانا ایک لاکھ سے زیادہ افراد ان سے استفادہ کرتے ہیں پنجاب میں ۵۰۰ کتب خانے مدارس وسطانیہ میں قائم کئے گئے ہیں جن سے طلبا اور مدرسین کے علاوہ عوام کو مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے میسور میں ۷۰ کتب خانہ اضلاع میں قائم کئے گئے ہیں جن کو لوکل فنڈ سے امداد ملتی ہے۔

افسوس ہے کہ ممالک محروسہ میں لوکلفنڈ کی کمیٹیوں نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے سردست ہر مستقر تعلقہ پر ایک کتب خانہ قائم کرنے کی ضرورت ہے بلدہ حیدرآباد کی بعض مساجد کے کتب خانوں سے بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے اسی طرح اضلاع کی مساجد میں کتب خانوں کا قیام از بس ضروری ہے۔

پختہ عمروں کیلئے دیگر ذرائع تعلیم | کتبخانوں کے علاوہ عجائب گھروں اور تصویر خانوں اور نمائشوں کے ذریعہ سے پختہ عمر اشخاص کی معلومات میں وسعت دیجا سکتی اور ان کی زندگی کے لطف اور مسرت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس۔ اور برطانیہ ہند کے بعض دیگر بڑے شہروں میں جس پیمانہ پر عجائب گھر قائم کئے گئے ہیں اسی پیمانہ پر بلدہ میں بھی پبلک میوزیم قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ میونسپلٹی اس طرف توجہ کرے گی اضلاع کی لوکلفنڈ کمیٹیوں کو چاہئے کہ کم از کم ہر صوبہ کے مستقر پر ایک عجائب گھر کا افتتاح کریں۔ نمائش کے لئے بہترین موقع کوئی میلہ۔ تہوار یا عرس ہے یہ امر باعث طمانیت ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اب بعض وقت ایسے موقعوں پر نمائش قائم کرکے دیہات کے باشندوں کو مصنوعات اور زرعی پیداوار وغیرہ کے نمونے بتائے جاتے ہیں نظام ریلوے نے سال گذشتہ اسی غرض سے سفری نمائشی ٹرین کا جو انتظام کیا تھا وہ بھی نہایت مفید ثابت ہوا منتظمین اور مدرسین بالغان کو

چاہیئے کہ عجائب گھروں اور نمائشوں کو متعلمین کے ہمراہ جاکر مختلف اشیاء وغیرہ کے متعلق ان کو زبانی تفہیم کریں نیز شہر یا گاؤں میں اگر کوئی تاریخی مقامات ہوں تو ان کو ایسے مقامات کی بھی تفریح کرا کے ملک کی تاریخ سے ان کو دلچسپی دلائیں اور اس کی زندہ یادگار ان کے سامنے پیش کریں۔

پختہ عمر عورتوں کی تعلیم | محبان وطن کی یہ آرزو کہ ہندوستان دیگر ترقی یافتہ ممالک کا ہم پلہ ہوجائے اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب کہ نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی تعلیم عام ہوجائے اگر کوئی شخص جرمنی جاکر یہ دیکھے کہ وہاں گھروں پر مائیں کس طرح بچوں کی پرداخت اور تربیت کرتی ہیں تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہے گا کہ یہی مائیں جرمنی کی عظمت کا باعث ہیں۔ جاپان کی ترقی کا راز بھی یہی ہو کہ اس نے عورتوں کی تعلیم کی جانب اسی قدر توجہ کی جس قدر مردوں کی تعلیم کی جانب۔ اب ٹرکی بھی اسی اصول پر کاربند ہے مصطفےٰ کمال پاشا نے جو تدابیر اور طریقے اختیار کئے ہیں خواہ ہم ان کے موید ہوں یا نہ ہوں لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے پردے کو محض یورپ کی کورانہ تقلید میں موقوف نہیں کیا۔ بلکہ اس رسم کے توڑنے سے ان کی اصلی غرض یہ تھی کہ عورتوں کی تعلیم میں کسی قسم کی رکاوٹ باقی نہ رہے یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان میں (۹۸) فیصدی اور ممالک محروسہ سرکار عالی میں تو تقریباً (۹۹) فیصدی عورتیں جاہل ہیں جب تک عورتوں میں جہالت باقی ہے نہ تو وہ مردوں کی رفیق کار بن سکتی ہیں نہ ہمارے گھروں کی حالت درست ہوسکتی ہے اور نہ ہی بچوں کی پرورش تعلیم اور تربیت ایسی ہوسکتی ہے کہ آیندہ چل کر وہ مفید شہری بنیں ملک سے جہالت اسی وقت دور ہوگی جب کہ تعلیم نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کے لئے بھی جبری قرار دیجائے۔ عورتوں کی تعلیم میں اس وقت دو قدیم رسوم سد راہ ہیں کمسنی کی شادی اور پردہ۔ توقع ہے کہ اول الذکر رسم عنقریب بذریعہ قانون موقوف کردیجائے گی اور میری رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ اگر پردہ یک لخت اٹھا بھی نہ دیا جائے تو کم از کم اس رسم میں ایسی ترمیم کیجائے کہ اس سے لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

لڑکیوں کے علاوہ پختہ عمر عورتوں کو بھی تعلیم کی اسی قدر ضرورت ہے جتنی کہ پختہ

عمر مردوں کو لیکن کچھ تو پردہ اور کچھ کام کاج کی وجہ سے پختہ عمر عورتوں کی تعلیم کا کام آسان نہیں ہے تاہم گھروں پر پڑھے لکھے بھائی اپنی بہنوں اور شوہر اپنی بیویوں کو فرصت کے اوقات میں تعلیم دیکر خواندہ اناث کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ کر سکتے ہیں علاوہ بریں پختہ عمر عورتوں کی تعلیم کے لیے موجودہ مدارس نسواں میں بھی انتظام ممکن ہے۔ شادی شدہ اور دیگر عورتوں کی تعلیم کے لئے رات کا وقت موزوں نہیں ہے۔ لیکن دن کو گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچھ وقت پڑھنا لکھنا سیکھنے کے لئے آسانی سے نکال سکتی ہیں۔ مدارس نسواں میں لڑکیوں کو مدرسہ لانے اور گھر پہنچانے کے لئے منجانب سرکار جو گاڑیاں مقرر ہیں وہ اوقات مدرسہ میں بیکار رہتی ہیں لہذا مدرسہ کے قرب وجوار میں رہنے والی شادی شدہ عورتوں کی تعلیم کے لئے جو وقت مقرر کیا جائے اس وقت ان کو مدرسہ لانے کے لئے انہیں گاڑیوں سے کام لیا جا سکتا ہے اس کے لئے جو مزید صرفہ عائد ہوگا وہ زیادہ قابل لحاظ نہ ہوگا۔ پڑھنا لکھنا سکھانے کے ساتھ شادی شدہ عورتوں کو امور خانہ داری اور بچوں کی پرورش و پرداخت کی بھی تعلیم و تربیت دینا ضروری ہے اس کے علاوہ دیگر امور کے متعلق بذریعہ تقاریر ان کی معلومات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ پختہ عمر مردوں کے لئے جن تقاریر کا انتظام کیا جائے ان میں سے جو تقاریر عورتوں کے لئے موزوں و مفید ہوں پردہ کا انتظام کر کے ان کو ایسے جلسوں میں شریک ہونیکا موقع دیا جا سکتا ہے البتہ بعض مضامین کے لئے جو عورتوں کے مخصوص فرائض سے متعلق ہیں خاص انتظام کرنا پڑے گا۔ انگلستان میں پختہ عمر عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک علیحدہ انجمن (Womens Institutes) قائم ہے جس کی شاخیں چار ہزار مواضعات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ماؤں کی بھی ایک انجمن (Mothers union) موجود ہے جو بچوں کے رکھ رکھاؤ میں نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ بمبئی اور پونہ میں سیوا سدن کی جانب سے شادی شدہ عورتوں کو امور خانہ داری وغیرہ کی تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے خدا کرے وہ دن جلد آئے جب کہ اس قسم کی انجمنیں ممالک محروسہ میں بھی قائم ہوں۔

اعلیٰ تعلیم بالغاں یہاں تک میں نے محض ابتدائی تعلیم بالغان سے بحث کی مجھے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ مدارس میں حتیٰ کہ مدارس فوقانیہ میں بھی جس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اس سے

طلبا میں شہری بننے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے ابتدائی تعلیم بالغان کے علاوہ اعلیٰ تعلیم بالغان کے انتظام کی بھی ضرورت ہے تاکہ ان لوگوں کو جو یونیورسٹی کی بھی تعلیم سے محروم رہے ہیں تلافی مافات کا موقع ملے تعلیم بالغان کی ترویج و ترقی میں۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ اور دیگر غیر سرکاری انجمنوں مثلاً سرونٹس آف انڈیا سیوا سمتی سوشیل سروس لیگ اور اسٹوڈنٹس برادرہڈ بمبئی نے جو جد و جہد کی ہے وہ لایق ستایش ہے۔ لیکن اس کام کو جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے یونیورسٹیاں انجام دے سکتی ہیں وہ دوسرے ذرائع سے ممکن نہیں۔ کلکتہ میسور مدراس۔ ڈھاکہ۔ علیگڈھ اور بنارس۔ ہندو یونیورسٹی نے اس جانب قدم بڑھایا ہے اور حال میں مدراس یونیورسٹی نے ٹامل زبان میں سائنٹی فک مضامین پر عام فہم تقاریر کا انتظام کیا ہے لیکن دوسرے ممالک کی یونیورسٹیوں نے علمی مشاغل کے ذوق اور جستجوئے حق کے بے لوث شوق کو ابھارنے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی ہندوستانی یونیورسٹیوں نے نہیں کیا۔ جامعہ عثمانیہ نے اکسٹنشن لکچر کا انتظام کیا ہے لیکن ابھی تک کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کیگئی ضرورت اس امر کی ہے کہ لکچر زمانہ تعطیلات میں مقرر ہوں اور بجائے چند مخصوص اور دقیق عنوانات کے اگر ایسے موضوعات مقرر کئے جائیں جن سے عوام کو دلچسپی ہو اور جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں تو البتہ ان کی فائدہ رسانی بڑھ جائے گی میرے نزدیک ہر یونیورسٹی میں ایک اکسٹنشن بورڈ ہونا چاہئے جو اعلیٰ تعلیم بالغاں کی ذمہ داری اپنے سر لے اس بورڈ میں جامعہ اور رشتہ تعلیمات کے علاوہ عوام کے بھی نمایندہ ہوں۔ جامعات کے کو ایسی تعلیم دینے اور کامیاب بنانے کیلئے سرکار کی جانب سے امداد دیجائے۔
ذریعہ تعلیم کے متعلق یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان میں تعلیم بالغان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے اکٹوبر ۱۹۲۱ء میں لندن میں ایک کانفرنس ہوئی تھی جس کے صدر سرمائیکل سیڈلر تھے۔ اس کانفرنس نے سفارش کی ہے کہ بالغ العمر اشخاص کو مادری زبان میں تعلیم دینا ضروری ہے اس رائے کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ جو بالغ العمر اشخاص اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں وہ بھی انگریزی کی بہ نسبت مادری زبان میں تقریروں کو زیادہ آسانی سے سمجھیں گے۔ جو مضامین ان لکچروں کے واسطے مقرر ہوں وہ حتی الامکان

ایسے ہوں جن کا تعلق روزانہ زندگی سے ہو مثلاً تاریخ معاشیات۔ سیاسیات جغرافیہ۔ اور سائنٹفک انکشافات و تحقیقات مقررین کو چاہئے کہ وہ ہر مضمون کے متعلق کارآمد کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دیں۔

چونکہ ہندوستان کے (۹۲) فیصدی باشندے جہالت کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں اس لئے جس طرح کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بہ نسبت یونیورسٹی کی تعلیم کے پرائمری تعلیم کی جانب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اسی طرح مدارس ثانویہ میں تعلیم پائے ہوئے پختہ عمروں کی تعلیم کے مسئلہ کے مقابلہ میں ناخواندہ نیم خواندہ پختہ عمروں کی تعلیم کا مسئلہ زیادہ اہم ہے سرکار اور مقامی کمیٹیوں کو چاہئے کہ بچوں کے علاوہ ناخواندہ پختہ عمروں کی تعلیم کا انتظام کرنا اپنا فرض عین سمجھیں نیز ملک کے تعلیم یافتہ افراد سے یہ توقع کرنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ تھوڑے سے ایثار سے کام لیکر جہالت کے خلاف جہاد میں شریک ہوں اور اپنے ان بھائیوں کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے اور ان کو مفید شہری بنانے کے کام میں حصہ لیں وہ اس سے بڑھ کر اور کوئی قومی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔

کیونکہ تعلیم نہ صرف معاشی بلکہ سیاسی ترقی کی بھی بنیاد ہے پچھلے دنوں کیمبرج میں تعلیم بالغان کی پہلی عالمگیر کانفرنس کے موقع پر لارڈ ارون نے جو کانفرنس کو پیام بھیجا تھا اس میں انھوں نے یہ بالکل صحیح کہا کہ "تعلیم بالغان اُن سیاسی مسائل کے حل کرنے میں جو آج ہندوستان کو درپیش ہیں غیر معمولی طور پر اہم اور ممد ہے۔ گذشتہ تین پینتیس سال کے عرصہ میں ہمارے لیڈروں نے جو سیاسی جد و جہد کی ہے اگر اسی قدر جد و جہد ملک سے جہالت کو مٹانے کیلئے لیجاتی تو مجھے یقین ہے کہ کنیڈا برٹش جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ کی طرح آج ہندوستان بھی ایک آزاد ملک ہوتا

---(۰۰)---

تعلیم روزگاری

(از جناب مولوی محمد سجاد مرزا صاحب یم اے دکنٹب) سی ای ۔ (لنڈن)۔

تعریف تعلیم روزگاری سے مراد ایسی تعلیم ہے جو انسان کو اس قابل بنائے کہ وہ خود اچھا کھائے اچھا پہنے ۔ اپنی بیوی کو اچھا کھلائے ۔ اچھا کپڑا اور زیور پہنائے ۔ اپنی اولاد کو اپنے سے بہتر اور آرام دہ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرے اور اپنے اوقات فرصت دماغی اور روحانی ترقی میں صرف کرے ۔

تعلیم روزگاری کے نظام ترتیب میں تین امور کا لحاظ نہایت ضروری ہے ۔

(۱) ملک کی طبعی حالت (۲) وہاں کے باشندوں کی معاشی حالت (۳) ان کا مطمح نظر ۔

ملک کی طبعی حالت ریاست حیدرآباد جس کا رقبہ (۸۲۶۹۸) مربع میل ہے، سطح مرتفع دکن کا بیشتر حصہ گھیرے ہوئے ہے یہ سطح سمندر سے اوسطاً ۱۲۵۰ فٹ بلند ہے ۔

اس کے شمال اور مغرب میں پہاڑوں اور چٹانوں کا سلسلہ ہے ۔ تو جنوب مغرب میں مورم، کنکروں کے خطے ہیں شمال و مغرب میں پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں، عمیق وادیاں، بہتے چشمے، اقسام کی لکڑی کے ہرے ہرے جنگل، دلکش منظر ہیں ۔ وہاں کی زمین حقیقت میں سونا اگلتی ہے ؛ لیکن جنوب و مشرق میں کچھ رنگ ہی اور ہے یہاں پہاڑ بے سبزہ و گیاہ، زمین ریتلی، چشمے جلد خشک ہونے والے ہیں اس ریاست کے سینہ میں قارون کا خزانہ دفن ہے ہیرے یاقوت کوئلے کی کانوں، سنگ مرمر اور ابرق وغیرہ کی بہتات ہے اس کو چھوٹے بڑے دریا مثلاً، انجراین گنگا، گوداوری تنگ بھدرا ۔ اور کرشنا ..... سیراب کرتے ہیں ۔

باشندگان کی معاشرتی حالت ملک کی طبعی تقسیم کی مناسبت سے باشندے بھی دو بڑے اور ایک چھوٹے گروہ میں منقسم ہیں ۔ شمال مغرب میں مرہٹے آباد ہیں جنوب و مشرق میں تلنگے اور بالکل جنوب میں کنڑے بادی النظر میں ان تینوں گروہوں میں بہت فرق معلوم ہوتا ہے ؛ لیکن حقیقت

یہ ہے کہ یہ سب کے سب رسم ورواج اور مذاہب کی جکڑ بندیوں کے باعث کم وبیش ایک سی معاشرت رکھتے ہیں۔ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے اعداد وشمار کے لحاظ سے اس ریاست کی کل آبادی ۱۲۴۷۱۷۷۵ ہے جو ڈھائی ہزار گاؤں میں پھیلی ہوی ہے اگر کسی گاؤں کی آبادی پر تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ تو ظاہر ہوگا کہ برہمن دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:۔

(۱) ایک تو ہندو اقوام اور اپنے ذات والوں کی پوجا پاٹ کا کام انجام دیتا ہے چنانچہ سرکار سے اس کے لئے کوئی انعام بھی مقرر ہوتا ہے۔

(۲) دوسری پٹوارگری کرتا ہے یہ اچھا زمیندار ہوتا ہے۔ اور نوکروں سے کاشت کراتا ہے۔

ویش یہ چھوٹی موٹی تجارت کرتے اور قرضہ وغیرہ دیتے ہیں۔

کنبی یہ بالکل زراعتی پیشہ ہیں اور اپنی اراضی پر خود ہل چلاتے ہیں ان میں سے بعض بلحاظ قدامت خاندان موروثی پٹیل ہوتے ہیں۔

مانگ اور کولی۔ بالکل مزدوری پیشہ کرتے ہیں۔

کمہار یہ مٹی کے برتن تیار کرتا ہے اور کویلو بناتا ہے۔ اسی طرح دھوبی بڑھائی لوہار اور یہ سب اپنی خدمات کے معاوضہ میں غلہ پاتے ہیں جسکو بلوتہ کہتے ہیں دھیڑ ادنیٰ قسم کے کام کرتے ہیں بھوئی مچھلی پکڑتے ہیں مزدوری کرتے ہیں مرہٹواری میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

درزی۔ مزدوری پر کپڑا سیتے ہیں۔ بنیا، مارواڑی، تجارت کرنے اور قرضہ دیتے ہیں نمری یہ باجا بجاتے ہیں۔ رنگاری۔ کپڑے وغیرہ رنگتے ہیں۔ سناری، دھوبی وغیرہ اپنا اپنا پیشہ انجام دیتے ہیں۔

مسلمان بہت کم کاشت کرتے ہیں اکثر ملازم پیشہ ہوتے ہیں ان سے ساہوکار حفاظت اور قرضہ وصول کرنے کا کام لیتے ہیں اور ان کی شہرت یہ ہے کہ اپنے مالک کے لئے مارکوٹ کرنے تیار رہتے ہیں ان میں سے بعض بھیک بھی مانگتے ہیں اور کوئی ایک حلیہ بنا کر پیرین بیٹھتے ہیں یہ سب لوگ آپس میں نہ شادی بیاہ کر سکتے ہیں نہ کھا پی سکتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ اپنی ذات کے

باہر انسان کا وجود ہی نہیں سمجھتے۔ بالعموم مٹی کے جھونپڑوں میں کھیتوں سے گھرے ہوئے زندگی کے دن گذارتے ہیں۔ یہ وہ عناصر ہیں جو دیہی زندگی کی جان ہیں اور قدیم نظام تمدن کا افتادہ نمونہ ہیں۔

اب تمام باشندگان ریاست کو بلحاظ پیشہ دیکھا جائے تو ان کی تقسیم یوں ہوتی ہے۔

کاشت	٦١٦٥٧۴۴
صنعت و حرفت	١٧١١٨٣٧
تجارت	١٢١٨٦٩٦
ملازمت سرکاری	٧٦٣٠٩٢
فقیر و آوارگان۔	١٦٥۴٦۴

یہ اعداد بتلا رہے ہیں کہ ہماری ریاست میں سب سے بڑا ذریعہ معاش زراعت ہے اس کے بعد صنعت و حرفت ہے۔ پھر تجارت اور سب سے آخر میں ملازمت سرکاری۔ لیکن اس کے ساتھ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے دیہاتوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے اور پیشوں کا مذہبی رنگ لئے ہوئے ہونے کے باعث تقسیم کار اچھی نہیں ہوسکتی۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے ہمارے صناعوں کو مفلس بنا رکھا ہے۔ پیدایش دولت کے لئے تفصیلی تقسیم کار ضروری ہے۔ اور ہر شخص کا کسی ایک کام کے لئے وقف ہوجانا لازمی ہے۔ لیکن دیہات میں محدود بازار ہونے کے باعث کسی صناع کو یہ ترغیب نہیں ہوتی کہ وہ کسی خاص کام یا صنعت کا ماہر بنے کیونکہ مقامی ضروریات پورا کرنے کے بعد اس کی محنت کا ثمرہ نہیں ملتا یہی وجہ ہے کہ دیہاتی بڑھئی ہر قسم کا لکڑی کا کام کرتا ہے گنڈریا اور کمبل باف ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ موچی بھی چمڑا کماتا، رنگتا، چپل، مشک اور ڈول بناتا ہے۔ اس خصوص میں اڈم اسمتھ نے جو لکھا ہے وہ ہمارے دیہات کے حسب حال ہے۔ دیہاتی کاریگر تقریباً ہر جگہ مجبور ہوتے ہیں کہ صنعت و حرفت کے ان مختلف شاخوں کو سرانجام دیں جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب کا تعلق رکھتی ہیں کہ ان میں ایک ہی قسم کی اشیا ر کام میں آتی ہیں ایک دیہاتی بڑھئی ہر قسم کا کام کرتا ہے جس کا تعلق لکڑی سے ہوتا ہے اور دیہاتی لوہار لوہے کے متعلق تمام قسم کا کام انجام دیتا ہے اول الذکر صرف بڑھئی ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ نجاری اور فرنیچر بنانے اور لکڑی پر کھدوائی کا

کام بھی کرتا ہے اور اسی کے ساتھ ہل اور چھکڑے اور گاڑیاں بھی بناتا ہے۔
اسی ضمن میں گونڈ، بھیل اور لباڑوں کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ بھی اپنے نیم وحشیانہ زندگی کے باوجود پیدائش دولت کے فرائض انجام دیرہے ہیں۔ گونڈ بھیل، شہد اور اسی قسم کی اشیاء فراہم کرتے ہیں۔ تو لباڑے افزائش جنس چوپایہ اور باربرداری کا کام کرتے ہیں ان کا مطمح زندگی بھی یہی ہے اگر کسی انگریز سے پوچھو کہ اس کی زندگی کا کیا مقصد ہے تو وہ بلا تکلف کہیگا "دن میں دولت کمانا اور رات کو عیش اڑانا اور جو ذرا تعلیم یافتہ ہے وہ اسی مقصد میں نظام عالم کی اصلاح کا اضافہ کردیگا۔ چنانچہ پوری قوم دنیا کو کچھ کرنے اور کر دکھانے کی جگہ خیال کرتی ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں بھی جی لگاتی ہے۔ دن بھر کام کی دھن میں رہتی ہے رشام میں اپنے وطن کو تفریح گاہ بناتی ہے جدہر دیکھو لوگ دن بھر کلفت دور کئے خوش خوش پھر رہے ہیں، کلب اراکین سے بھرے ہوئے ہیں تماشا گاہیں مردعورتوں سے پر ہیں کہیں رقص وسرود ہے تو کہیں علمی تذکرہ ہے کہیں احباب کے جلسے کہیں دوسرے شغلے ہمارے ہم وطنوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے برہمن ہیں تو اپنی ذات پات میں گرفتار اور اپنی اعلیٰ حیثیت کو برقرار رکھنے میں سرگرداں مسلمان ہیں تو دین کے نہ دنیا کے۔ ہر وہ چیز جو ادبار کا باعث ہوسکتی ہے اس کو جزو مذہب تصور کرتے ہیں اور جنت کے خواب دیکھتے رہتے ہیں پست اقوام کا حال نہ پوچھئے صدیوں کی پستیوں نے ان کے دل سے یہی خیال نکالدیا ہے کہ وہ انسان ہیں جب ہم دنیا کے عناصر زندگی پر غور کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے حواس ایسے منتشر ہیں کہ کھیں جمائے سے نہیں جمتے۔ ہاتھ پاؤں گرے سے جاتے ہیں دل میں نہ کوئی جوش ہے نہ ولولہ محبت مفقود ہے سینوں میں رشک وحسد اور نفاق کی آگ دہک رہی ہے بزم خوشی میں مجلس غم کا سماں ہوتا ہے ہر طرف مایوسی ہی مایوسی دکھائی دیتی ہے قوائے جسمانی اور قوائے دماغی پر ایک مردنی سی چھائی ہوی ہے ان کی ہر تعمیر میں بھی خرابی کی ایک صورت مضمر ہے مختصر یہ کہ دیہات کی زندگی موت کا نمونہ بن گئی ہے۔

مروجہ تعلیم | ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ موجودہ تعلیم جس کا مقصد مکمل انسان بنانا اور اس کو کارآمد زندگی کے لئے تیار کرتا ہے۔ کس حد تک

عناصر دیہات کی اصلاح و ترقی کے لئے موزوں و مناسب ہے مروجہ تعلیم کے متعلق ماہرین تعلیم
اختلاف رائے رکھتے ہیں ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ موجودہ تعلیم بالکل لٹریری یعنے ادبی ہے دوسرے
گروہ کا یہ خیال ہے کہ مروجہ تعلیم محدود قسم کی فنی تعلیم ہے کیونکہ وہ محض منشی اور بابو تیار کرتی ہے
تھوڑی دیر کے لئے اول الذکر ہی رائے کو تسلیم کریں تو ہم دیکھتے ہیں تقریباً پچاس سال کی
ادبی تعلیم کے باوجود اتبک کوئی ایسی جماعت کی بنیاد نہیں پڑی ہے جو علمی ذوق وشوق
رکھتی ہو اور علم کو محض علم کی خاطر حاصل کرتی ہو اگر یہ نہیں تو کم از کم اتنے عرصہ کی تعلیم کے
بعد ہم اتنی توقع ضرور کر سکتے ہیں کہ اس نے دماغوں کو روشن کر کے تباہ کن رسم و رواج اور
مذہبی توہمات کو تھوڑا بہت دور کر کے انسانی برادری کا خیال پیدا کر دیا ہوگا لیکن آپ
دیہات تو دیہات شہروں میں بھی ڈھونڈیں تو مشکل سے ایسے آدمی نظر آئیں گے جو ہماری
تعلیم گاہوں کے سب مدارج پورے کرنے کے بعد اپنے عادات واطوار رسم و رواج اور مطمح
زندگی میں اپنے جاہل بھائیوں سے کسی قدر بہتر ہوں گے۔ ثانی الذکر کی اس رائے میں
کہ مروجہ تعلیم منشی و بابو تیار کرتی ہے حقیقت کی بو آتی ہے۔ سند دار ندہ امیدواروں
کی کثرت نے نتیجہ تعلیم پر کافی سے زیادہ روشنی ڈالدی ہے ہم آغاز تعلیم جدید کو ٹٹولتے
ہیں تو دیکھتے ہیں کہ میکالے کی اپنی تاریخی یادداشت میں جو مروجہ تعلیم کا جز لاینفک ہے
لکھا ہے کہ ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ایک گروہ ایسے تعلیم یافتہ ہندیوں کا تیار کردیں
جو ہمارے اور ہماری کثیر التعداد رعایا کے درمیان ترجمان کا کام انجام دے سکے یہ نئے
تعلیم یافتہ رنگ اور خون کے اعتبار سے ہندی اپنے ذوق۔ افکار اور اخلاق کے لحاظ
سے انگریز ہوں۔ سرسید علیہ رحمۃ نے جب مسلمانوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا تو انہوں نے
اپنی تقاریر اور تحریرات میں نئی تعلیم کے جاری کرنے کی بڑی وجہ یہ بتلائی کہ اس کے ذریعہ
ملازمت سرکاری ملنے میں آسانیاں ہونگی اور نئے تعلیم یافتہ دیوبند اور اسی قسم کے دیگر
مدارس کے فارغ التحصیل اشخاص کیطرح روٹی کو محتاج جوتیاں چٹخاتے نہیں پھریں گے مختصر اً یہ
تاریخ اور نتائج سے یہ باور کرنے میں تامل نہیں ہوتا کہ مروجہ تعلیم منشی و بابو ساز ہے لیکن یہ
بھی ایک قسم کی تعلیم روزگاری ہے اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہ معلوم کریں۔

(۱) کہ یہ کس قسم کی تعلیم روزگاری ہے اور کس حد تک کار آمد ہے۔
(۲) دیہات پر اس کا کیا اثر پڑا ہے۔

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہمارے ملک کے باشندے چند طبقوں میں منقسم ہیں اور ہر طبقہ نے کوئی نہ کوئی پیشہ مخصوص کر لیا ہے اس ریاست میں مسلمان اور برہمن اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں انکی روزی کے دو طریقہ ہیں جن کے پاس زمین یا روپیہ ہے۔ وہ پاؤں ہلائے بغیر پیٹ بھرتے ہیں جو مفلس اور نادار ہیں وہ نوکری کرتے ہیں نوکری کرنے کی وجہ صرف مروجہ تعلیم ہی نہیں ہے بلکہ روایات ملک اس کے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ از منہ قدیم سے ہندوستان میں حکومت کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے اراکین حکومت عزت و آبرو رکھتے ہیں ہندوستان جیسے مفلس ملک میں مستقل آمدنی چاہے وہ کتنی ہی کم ہو نعمت غیر مترقبہ ہے چنانچہ دوسرے پیشے کے لوگ بھی ملازمت سرکاری میں داخل ہونے کے کوشاں رہتے ہیں انکو موجودہ تعلیم نے سہولتیں بھی دیدی ہیں۔ اس طرح نوکری پیشہ طبقے تو دوسرے پیشوں میں نہیں جاتے ہیں لیکن دوسرے پیشے والے نوکری پیشہ طبقہ میں بھرتے چلے جاتے ہیں یہ امر تعجب خیز بھی نہیں ہے ہندوستان تو ایسا ملک ہے جہاں انگریزوں جیسی تجارت پیشہ قیام تجارت کرنے آئی لیکن تجارت کرتے کرتے ملازمت پیشہ ہوگئی۔ مسلمان و برہمن حکومت سے وابستہ رہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں طبقوں میں ملازمت سرکاری آبائی پیشہ ہوگیا ہے ہم یہ کیسے بھول جائیں کہ کچھ ہی عرصہ قبل تک ہمارے تعلیم گاہوں کی ہر سند تقرر کا حکم رکھتی تھی ہمارے ملک میں اس وقت ۱۲۸۷۶۸ برہمن اور ۶۶۴۰۲۲ مسلمان ہیں گذشتہ دس سال میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور انکی تعداد سرعت سے بڑھ رہی ہے لیکن اس کے باوجود کہ قائم شدہ محکموں میں توسیع ہوئی جدید محکمہ جات قائم ہوئے ہیں نوکری پیشوں کی تعداد کھپ نہیں سکتی موجودہ تعلیم گاہوں کے تعلیم یافتہ نوکری کے لئے ہاتھ پھیلانے پر مجبور رہیں مگر ان سے کہا جاتا ہے کہ افسوس کوئی جگہ خالی نہیں ہے کوئی اور پیشہ اختیار کرو۔ زراعت کرو تجارت کرو۔ صناع بنو۔ لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ مروجہ تعلیم تقسیم کار کے لحاظ سے اس طبقہ کے لئے محض بے سود ہی نہیں بلکہ مضرت رساں ہوگئی ہے

جو اپنی تعداد کے مدنظر ملک کے جملہ طبقوں میں چوتھے درجہ پر ہے اور وقت آ گیا ہے کہ ٹراونکور کی طرح جس نے دکلار کی زیادتی تعداد کے مدنظر کالج بند کر دیا ہمارے موجودہ طرز کے مدارس میں کمی کی جائے۔

موجودہ تعلیم یافتوں کا نوکری سے رجحان بدلنے کے لئے مینول ٹریننگ کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے خیال یہ کیا جاتا ہے کہ اگر مینول ٹریننگ جاری کر دی گئی ہے تو ہمارے تعلیم گاہوں کی پیداوار دوسرے پیشوں کی طرف راغب ہونے لگے گی میں اس سے تفصیل سے بحث نہیں کر سکتا اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ جس طرح مذہبی تعلیم کے اضافہ سے مذہب کے پابند طلبار تیار ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے اسی طرح ورزش جسمانی سے طلبار کی صحت درست ہوئی ہے اور نہ ہو گی اس طرح مینول ٹریننگ سے اور پیشوں کی طرف رجحان ہو گا اور نہ نوکری کا خیال چھوٹے گا میں اپنے مطلب کو ورزش جسمانی کی تعلیم کی مثال سے اور واضح کرتا ہوں۔ ہمارے مدارس میں طلبار کی جسمانی اصلاح کے لئے نہ صرف کھیل کود کا انتظام ہے بلکہ اس کے لئے خاص معلمین کا تقرر بھی کیا گیا ہے لیکن کیا آپ کسی کی جسمانی حالت درست کر سکتے ہیں جبکہ اس کو پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو بھلا بغیر کافی اور اچھی غذا کے ورزش جسمانی موثر ہو سکتی ہے جبتک اور پیشے باوقعت وباوقار نہ بنائے جائیں اور مستقل ووافر آمدنی کا ذریعہ نہ بن جائیں نوکری کی جھمکا ہٹ کم نہ ہو گی۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ دیہات پر ہماری تعلیم کا کیا اثر ہوا۔ ہمارے مدارس نقش برآب ہیں دیہاتی زندگی کے کسی شعبہ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے اور یہ جو خیال ہے کہ ان مدارس کی وجہ سے لوگوں نے زراعت چھوڑ نوکری کرنی شروع کر دی ہے وہ محض حقیقی حالات سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ چنانچہ میں زراعتی تعلیم کے ذکر میں اس غلط فہمی کو دور کروں گا اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے مدارس تحتانیہ کا نصاب تقریباً وہی ہوتا ہے جو یورپ یا انگلستان کے مدارس میں رائج ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ یہاں وہی نتائج مترتب نہیں ہوتے واقعہ یہ ہے کہ ہر مدرسہ کی کامیابی کا انحصار مدرس پر ہوتا ہے۔ اور ہمارے ہاں کے دیہات کے مدرسہ کے لئے تو غیر معمولی مدرس کی ضرورت ہے دیگر ممالک جو معراج پر پہنچے انہوں نے اس راز کو سمجھا۔ ڈنمارک میں مدرسوں کی تعداد کو بڑھانے سے قبل

استادوں کی تیاری پر نظر رکھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں پہلے مدارس قائم کردئے جاتے ہیں پھر مدرسین کی تلاش ہوتی ہے۔ اور ان کی ماموری کی مدت بعد کہیں ان کی تربیت پر غور کیا جاتا ہے حالانکہ ہندوستان میں بالخصوص ان معاشرتی حالات کے مد نظر جن کا ذکر کیا گیا ہے قبل از قبل مدرس کی خاص تیاری از حد ضروری ہے۔ برخلاف اور ممالک کے ہمارے مدرس کو اپنے طلبا کو صرف درسی کتب ہی نہیں پڑھانا ہے بلکہ اس سے گھر کی روایات رسم و رواج و توہمات کو بھی دور کرنا ہے انسانیت کا سبق دینا ہے۔ اور یہ تبلایا ہے کہ ہر ایک اپنے کو قوم کا ایک جزو خیال کرے قوم کی دولت میں اپنی ذاتی محنت سے اضافہ کرے اور متمدن زندگی بسر کرے۔

موجودہ تعلیم کے نقائص کو محسوس کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ باشندوں کے پیشوں کی تعداد معلوم کیجائے اور اس بات کی نگرانی رکھی جائے کہ پیشوں کے مدارس میں ضرورت سے زیادہ تعداد تعلیم کی غرض سے شریک نہ ہوسکے سرکاری ملازمت کی تیاری قانون۔ طب۔ نجاری کیطرح ایک پیشہ کی تربیت سمجھی جائے۔

تعلیم نسواں دیگر ذرائع روزگاری کی شرح کرنے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طبقہ پر ایک اجمالی نظر ڈالوں جو ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے لیکن پس پردہ ہونے کے باعث ہمارے خیال سے اوجھل ہوگیا ہے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت بیوی اور ماں بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے اس لئے اس کی تعلیم روزگاری، خانہ داری کی تعلیم ہوسکتی ہے۔ ہمارے موجودہ تعلیم یافتوں کا خیال ہے کہ عورت کی تمام دلچسپیاں گھر کی چہار دیواری سے وابستہ رہیں اور وہیں کی وہیں ختم ہوجائیں۔

مروجہ نظام تعلیمی میں بھی عورتوں کی ضروریات کا بالکل خیال نہیں کیا گیا ہے اس سے جو کچھ نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کی صراحت سے میں احتراز کرتا ہوں کیونکہ موجودہ مدارس کی تعلیمیافتہ لڑکیوں نے اپنے شوہروں، بچوں اور گھروں کی جو گت بنائی ہے۔ اس سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم مدارس اناث میں حساب ریاضی، تاریخ و جغرافیہ اور ادب کا معیار کم کرکے ایسے مضامین کا اضافہ کردیں جن کا جاننا

ہر بیوی کے لئے ضروری ہے مثلاً تیمارداری، موسیقی، کاشت ترکاری، پکوان وغیرہ اور اختیاری مضامین میں کپڑے دھونا، انگریزی پکوان، مغلائی پکوان، حفظان صحت، مصوری، موسیقی وغیرہ رکھ دیں۔ ایسے مضامین میں جب امتحان ہونے لگیگا تو لڑکیوں کی قدر بڑھ جائے گی۔ ماؤں کی فکر کم ہو جائے گی اور بلا طلب بیسیوں درخواست گزار آموجود ہوں گے۔

گو اس ریاست میں عورتوں کی جملہ تعداد بھی مردوں کی جملہ تعداد سے خاصی کم ہے لیکن ان کی بڑی تعداد عضو معطل نہیں ہے۔ وہ پردہ کی بندشوں سے پاک ہے اور غیر مردوں سے ملنے جلنے اور ان کے دوش بدوش کھیت اور کارخانوں میں کام کرنے کے باوجود اخلاقی حالت میں اپنی پردہ نشین بہن سے کسی طرح کم نہیں ہے کوئی ایسا دیہات نہیں جہاں عورتیں حقیقی معنوں میں مردوں کی شریک غم وخوشی اور شریک کار نہیں ہیں لہذا ان کی تعلیم کے انتظام میں کوئی خاص مشکل حائل نہیں ہے۔

ذرائع روزگاری: پیشوں کی زیادتی متمدن ممالک کی خصوصیت ہے۔ انگلستان کے پیشوں کی لغت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہاں سولہ ہزار قسم کے پیشے ہیں۔ گو زمانہ قدیم میں وہاں کے پیشوں کی تعداد ہندوستان کے پیشوں کی تعداد سے ملتی جلتی تھی لیکن ہماری ریاست میں فی الوقت مشکل سے ساٹھ مختلف پیشے ہیں ان میں سے بڑا پیشہ زراعت ہے

زراعت: خواہشمندان ملازمت سرکاری کی کثرت کے باعث یہ خیال ہو چلا ہے کہ مروجہ تعلیم کے اثر سے زراعت سے بے توجہی ہونے لگی ہے اس لئے زراعتی مدارس قائم کئے جائیں موجودہ مدارس میں زراعتی تعلیم کا انتظام کرکے باشندوں کو زراعت ہی کے پیشہ میں لگا رہنے دیا جائے۔ لیکن یہ خبر نہیں کہ زراعت کی اب وہی حالت ہے جو ملازمت سرکاری کی ہے۔ موجودہ زرعی زمین موجودہ زراعت پیشہ لوگوں ہی کے لئے کافی نہیں ہے مرہٹواڑی میں رقبہ کا اوسط فی کس ۱۵ ایکر ہے اور تلنگانہ میں تقریباً ۳ ایکر یہ مشکل سے ایک خاندان کی پرورش کے لئے کافی ہے۔ اوّل تو صدیوں کے بے تکے استعمال سے ان اراضیات کی روئیدگی میں انحطاط ہو چلا ہے۔ دوسرے جدید طرز کاشت کا مطلب یہ ہے کہ کاشتکاروں کی تعداد میں اور بھی کمی ہو یہی وجہ ہے کہ کاشتکار معاش کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کرنے پر

مجبور ہوتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے عادل آباد کا ایک ایسا ضلع ہے جہاں بے روزگاروں کی بڑی تعداد کھپ سکتی ہے۔ اگر بے روزگار تعلیمیافتوں کے لئے ایک ادارہ قائم کرکے ان کو جدید ترین طریقہ زراعت کی تعلیم دیجائے امداد باہمی کے ذریعہ اصولوں سے واقف کردیا جائے اور اس کے بعد ضروری اشیا اور کچھ رقم دیکر ۱۵ یا ۲۰ ایکر زمین کے قطعات دے جائیں تو میرے خیال میں بڑا کام ہوگا، زراعت کو فروغ ہوگا بے روزگار روزگار سے لگ جائیں گے اور ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

آبائی کاشتکاروں کے لئے ابتدائی تعلیم تو ایسی ہی ضروری ہے جیسے کھانا، کپڑا، مگر اس کے بعد زراعت کی تعلیم کے لیے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو ڈنمارک میں رائج ہے۔ طلبہ ابتدائی تعلیم کے بعد زراعت میں مشغول ہوجاتے ہیں چند سال کے بعد جبکہ وہ زراعت کے علمی پہلو سے واقف ہوجاتے ہیں مرکزی مدارس میں زراعت کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اس تعلیم کے بعد وہ پھر کھیتوں کو چلے جاتے ہیں اور کچھ وقفہ کے بعد پھر ان مدارس میں جمع ہوکر مزید زراعتی معلومات حاصل کرکے عمدہ کاشتکار بنتے ہیں۔

سنا جاتا ہے کہ زراعتی کالج کا قیام زیر غور ہے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے کاشتکاروں کو کالج سے زیادہ متذکرہ قسم کے مدارس کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں زراعتی کالج ہیں وہ اس میں شک نہیں بڑا کام کررہے ہیں لیکن کاشتکار ان سے مستفید نہیں ہوتے۔ ان میں اس وقت جملہ تعداد طلبہ ۹۶۷ ہے مگر زیادہ تر ایسے ہیں جو بعد ختم تعلیم محکمہ زراعت میں ملازم ہونگے پہلے تو یہ قلیل تعداد ہی شرمناک ہے اور جب یہ معلوم ہے کہ اس میں کثرت ان کی ہے جو ملازم ہوجائیں گے تو یہ تعداد اور بھی شرمناک ہوجاتی ہے۔

صنعت و حرفت | یورپ کے بھونچال نے ہمارے قدیم نظام تمدن میں رخنے ڈالدئے ہیں۔ ہماری بہت سی صنعتیں معدوم یا مردہ ہوگئی ہیں۔ تاہم ۲۵ فیصدی آبادی دستکاری سے پیٹ پالتی ہے اس سے ثابت ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن ابھی کے ساتھ رفتار زمانہ کے مدنظر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ پرانی صنعتیں پرانے طریقہ پر ہی زندہ رہیں میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ڈھال اور تلوار سے کلدار بندوق کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے چرخہ گرنی سے زور آزمائی کرسکتا ہے۔

دیہات کی تنہائی پسندی اور علیحدگی کے دن ختم ہو چکے ہیں اب ضرورت ہے کہ جس طرح چھوٹے چشمے ملکر دریا بناتے ہیں دیہات ملکر شہر بنائیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکلئے کہ میں گھریلو صنعتوں کا مخالف ہوں یا ان کو بے حقیقت تصور کرتا ہوں۔ گھریلو صنعت تو کاشتکار کی لونڈی ہے۔ جب تک کاشتکار کو قدرتی اسباب کے باعث بیکار رہنا پڑیگا گھریلو صنعتیں اس کے پیٹ پالنے میں مدد دین گی۔ ہماری ریاست روئی اور روغنی تخموں کے اعتبار سے دنیا کے بازار میں اہم شمار ہوتی ہے سنہ ۱۳۳۶ف میں اس ریاست سے ۵۲۵۵۰۰۰۰ (سوا پانچ کروڑ) روپیہ کی روئی باہر گئی اور ۲۴۵۰۰۰۰۰ (ڈھائی کروڑ روپیہ کا کپڑا) غیر ممالک سے آیا۔ اگر خام روئی کے بجائے کپڑا بن کر جاتا تو ظاہر ہے کہ کتنے ایک پیٹ پلتے اور کتنا روپیہ ملک میں آتا چند گرنیاں قائم و جاری ہیں لیکن ان میں وسعت دینے کی بہت گنجایش باقی ہے۔ کیا یہ کفران نعمت نہیں ہے کہ جس چیز سے کپڑا بنتا ہے اس کو ہم اپنے استعمال تک میں نہ لائیں اور باہر سے تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ کا ہر سال کپڑا خریدیں؟ یہی حال روغنی تخموں کا ہے۔ سنہ ۱۳۳۶ف میں ایک کروڑ سے زیادہ روپیہ کے روغنی تخم غیر ممالک میں تیل بنانے کے لئے بھیجے گئے۔ ارنڈی کے تخم کی پیداوار میں ہمارا کوئی مدمقابل نہیں ہے لیکن کیا آپ نے کہیں ارنڈی کا تیل بھی دیکھا جو یہیں بنایا گیا ہو؟ ہمارے اس سے ہر سال نصف کروڑ کے چمڑے باہر جاتے ہیں لیکن ایسی حالت میں کہ دوسرے لوگ ان کو کما کر رنگ دیکر بیچتے اور فائدہ کماتے ہیں اور ان کے خریدار ان سے چمڑے کی چیزیں مثلاً، بیگ، زین، لگام، جوتے وغیرہ بنا کر اور زیادہ منافع حاصل کرتے ہیں۔ میں نے محکمہ کروڑگیری سے یہ معلوم کرنیکی کوشش کی کہ ہم چمڑے کی بنی ہوی چیزوں پر کتنا روپیہ صرف کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہاں اب تک اس مواد کے جمع کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا ہے بہرحال میرا یہ اندازہ غلط نہ ہوگا کہ ہم نصف کروڑ روپیہ چمڑے کی بنی ہوئی چیزوں پر ہر سال صرف کرتے ہیں اگر ہم اپنی ہی ضروریات اپنے ہاں کے چمڑے سے ہی پوری کریں تو کتنے لوگ روزی سے لگ جائیں۔ ہمارے یہاں موچی موجود ہیں اگر ان کو تربیت دیجائے تو وہ یقینی یورپ کے موچیوں سے ہمسری کر سکتے ہیں۔

ہم میں سے بہت کم یہ جانتے ہیں کہ ہماری ریاست تقریباً سوا چار لاکھ کی مرغیاں باہر بھیجتی ہے اور ایسی گئی گذری حالت میں، جب کہ نہ کوئی باقاعدہ مرغی خانہ ہے اور نہ لوگ ہی اس کی باضابطہ تجارت کرتے ہیں اگر تربیت یافتہ لوگ مرغی خانوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تو اس میں بہت کچھ توسیع ممکن ہے ہم بمبئی، مدراس تو کیا چین کی طرح یورپ تک کو مرغی کے انڈے کی سربراہی کر سکتے ہیں۔ کوئلہ، لکڑی، ریشم، مٹی کے برتن، ابرق، دھات وغیرہ کے کاموں کے متعلق بھی اسی قسم کی تفصیل کی جا سکتی ہے۔

گھریلو صنعتوں کے فروغ دینے میں سیاحوں سے مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ایسے صنعتی مقامات پر خصوصاً جب کہ وہاں مناظر یا تاریخی عمارتیں ہوں، ہوٹل بنا کر سیاحوں کے آرام و آسایش کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ بیدر، اجنٹہ، ایلورا وغیرہ جیسے مقامات پر ہوٹل بنا دیئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ اشتہار دیئے بغیر امریکنوں کے غول آنے لگیں گے اور یورپ کی طرح ہم بھی ان کے بے ٹھکانے دوست سے مستفید ہوں گے۔ جاپانی حکومت نے چھوٹے چھوٹے مقامات تک پر ہوٹل تیار کئے ہیں اور جب یہ کامیابی سے چلنے لگتے ہیں تو حکومت چند شرائط کے ساتھ ان کو غیر سرکاری اشخاص کے حوالہ کر دیتی ہے۔

تجارت | بحالت موجودہ ۱۴ فیصدی لوگ تجارت پیشہ ہیں صنعت و حرفت کی ترقی کیساتھ تجارت پیشہ لوگوں میں اضافہ لازمی ہے لیکن اس وقت تجارت چند مخصوص فرقوں کا آبائی پیشہ ہے اور یہ تنگدل ایسے ہیں کہ کسی باہر کے آدمی کو کار آموزی کا موقع نہیں دیتے پیشہ وری مدارس میں تعلیم اسوقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جبتک کہ عملی کام کا موقع نہ ملے تجارت کی تعلیم کے انتظام میں اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے

ہندوستان میں یہ عجیب بات ہے کہ جب کبھی کسی کام کے لئے کہا جاے تو حکام کہتے ہیں کہ تنہا حکومت نہیں کر سکتی رعایا کو از خود کرنا چاہئے۔ رعایا کہتی ہے کہ ہم بے دست و پا ہیں حکومت کو چاہیے کہ وہ سب کچھ کرے بہر اس قسم کی لفظی تکرار میں قیمتی وقت ضایع نہ کرنا چاہئے۔ فرض کیجئے کہ حکومت قصوروار ہے تو کیا ایسی صورت میں متمول و ذی اثر اشخاص کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود کے خیال سے وہ از خود اسی کام کو شروع کر دیں جب حکومت، متمول و ذی اثر اشخاص بھی کچھ نہ کریں تو آپ کیلئے انجمن امداد باہمی کا راستہ کھلا ہوا ہے پس کام کیلئے کمربستہ ہو جائیے آپ کا مقصد آپ کو حاصل ہو جائے گا

تعلیم و تدریس

(۵)

یہ مختصر مضمون "راہ نو" جلد دوم، باب اول، صفحہ ۲۶ تا ۲۵
کا ترجمہ ہے۔

فاضل مصنف نے، مذکورہ باب میں، اس موضوع پر
روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم و تربیت سے عموماً کیا مراد لی جاتی ہے
اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہونا چاہیے؟ نیز آخر میں اس دعویٰ
کی دلیل بھی پیش کی ہے کہ "تربیت کامل" بغیر "تعلیم و
تدریس کامل" کے ممکن نہیں۔

(ابو المحاسن متین)

اگرچہ تعلیم و تدریس کے اصلی معنے قریب قریب ایک ہیں چونکہ تعلیم سیکھنے سکھانے اور
تدریس درس دینے کو کہتے ہیں۔ بلا شبہ درس دینے میں سکھانا بھی داخل ہے اور خود سکھانا
بھی ایک نوع سے درس دینا ہے، اگرچہ ان کی الگ الگ حدیں قائم کرنا ذرا مشکل کام ہے
لیکن، پھر بھی ہم ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق پاتے ہیں۔ اسی خیال کے مدنظر، ہم
کہتے ہیں کہ تعلیم سے، عموماً و مطلقاً ہر اس راستہ اور ہر اس طریقہ سے جس طرح ممکن ہو، سکھلانا
مراد ہے اور تدریس سے بعض مخصوص شرائط و قواعد کے مطابق سکھانا مراد ہے۔ تعلیم و تدریس
کے درمیان ایک اور طرح سے بھی فرق بتایا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم عمل، مثال
اور نمونے کے ذریعہ سکھلانے کا نام ہے۔ تدریس سے عقل اور تدبیر کے ذریعہ سکھلانا
مراد ہے یعنے تدریس میں زیادہ تر ہمارے قوائے ذہنی و عقلی سے کام لیا جاتا ہے اور تعلیم میں
سب سے زیادہ ہمارے جسمانی اعضا و قویٰ بعض حرکات و اعمال (مثلاً تقلید،

تکرار اور تجربہ) کے ذریعہ نشو نما پاتے ہیں، لیکن ان کے نشو و نما پانے میں ہماری عقل اور فکر کا کچھ دخل نہیں۔ تعلیم میں، ان کاموں کے اسباب وعلل سے ہمیں واقف نہیں کرایا جاتا مثلاً: ماں کا اپنے بچہ کو تعلیم دینا، راہ چلنا، کھانا، بولنا، منہ دھونا وغیرہ کو تعلیم کہا جا سکتا ہے تدریس کو نہیں چونکہ یہ وہ کام ہیں جنھیں ماں بتاتی اور ان کا عادی بناتی ہے لیکن بچہ ان کی لم سے ناواقف ہوتا ہے اس لیئے وہ ان کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اس نشوونما میں، یا یہ، تقلید، تکرار اور اعتیاد لازم ہے، لیکن جس وقت بچہ دار د مدرسہ ہوتا یا کتابیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو وہ اس وقت ہر ایک چیز کو سکھتا ہے یہاں تک کہ ان کے اسباب اور قاعدوں سے ایک حد تک واقف بھی ہو جاتا ہے اور یہاں اعضائے جسمانی سے زیادہ، اس کی فکر اور عقل و ہوش کام کرتے ہیں اسی وجہ سے اس کے قوٰی تیزی کے ساتھ ترقی کرتے ہیں چونکہ اس کو حادثات عالم کے تمام اسباب وعلل کا تدریج درک ہوتا ہے اسی باعث وہ اپنے گنجینۂ دماغ کو دنیا کے قاعدوں، قانون اور مختلف علوم و فنون سے بھر دیتا ہے۔

ایک اور پہلو کے اعتبار سے جیسا کہ ہم نے کہا ہے، تعلیم ـــــ عام طور پر سکھلانے سے مراد لی جاتی ہے ـــــ جس طرح بھی ہو، ہوتی ہے لیکن، تدریس میں ایک قسم کے خاص طرز اور قواعد کی جن کو فن تدریس کے علماء نے وضع کیا ہے، رعایت رکھنی پڑتی ہے۔

مثلاً ماں کا اپنے بچہ کو تعلیم دینا، اور وحشی اقوام کا اپنی اولاد کو شرائط زندگی سکھانا اور اسی طرح بعض حیوانوں کو بعض کاموں کی تعلیم دینا، اس کا بھی تعلق تعلیم سے ہے نہ کہ تدریس سے۔ اسی طرح اگر ایک گھوڑے کو بعض کاموں کی (مثلاً دوڑنا، خمیدہ ہونا اور ہاتھ پاؤں کا بلند کرنا، یہاں تک کہ بیانڈ کے ساتھ ناچنا جیسا کہ یورپ کے ممالک میں دیکھا جاتا ہے) تعلیم دیتے ہیں تو اسے تعلیم کہیں گے نہ کہ تدریس اس اعتبار سے کہ اہل یورپ نے اس صورت میں، اس حیوان کو بعض کرتب اور اعمال کی تعلیم دی ہے نہ کہ ان کے قاعدوں اور حکمتوں کی۔ اس میں شک نہیں کہ حیوان بھی شعور و ادراک رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ہوش و ذکاوت پر قادر ہوتے ہیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے واسطے گھونسلے اور گھر بناتے ہیں، ایک دوسرے کو ڈھونڈھتے ہیں۔ خوف کے موقع پر اپنے آپ کو چھپاتے

ہیں یا بھاگتے ہیں، سنتے ہیں اور سونگھتے ہیں کے بھر اس کی تلاش کرتے ہیں، کھیلتے ہیں، حسد اور کینہ رکھتے ہیں خصومت و عداوت کا اظہار کرتے ہیں، پیار اور محبت کرتے ہیں اپنے بچوں کی تربیت پرداخت اور نگہداشت کرتے ہیں، قسم قسم کے حیلوں اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر، غذا حاصل کرتے ہیں، مادہ کی تلاش کرتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں۔ اسی قبیل سے یہ اوصاف (جو تمام تر شعور حیوانی کے نتائج ہوتے ہیں) دراصل موروثی ہیں، اکتسابی نہیں۔ لیکن انسان حیوانوں کے ذکاوت و ہوش کو کام میں لگا کر، دوسرے کاموں کی بھی ان کو تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے یورپ میں بعض ذی ہوش حیوانوں مثلاً: کتا، بندر اور گھوڑے کو دیکھا ہے بعض ایسے عجیب و غریب کاموں کی تعلیم دیجاتی ہے۔ جو نہایت حیرت انگیز ہیں۔ جیسے بندروں کا سیکلوں پر سوار ہونا، کتوں کا میدان جنگ سے مقتولوں کی خبر لانا، زخمیوں کی تلاش کرنا، چھاونی کو خبر لیجانا، بچوں اور قیمتی چیزوں کے باہر لے آنے کے لئے آگ میں چلے جانا، چوروں کا پیچھا کرنا اور یہاں تک کہ حساب کا یاد رکھنا وغیرہ۔۔۔۔۔۔

ان میں سے بعض عجیب و غریب کام جن کی جانوروں کو تعلیم دیجاتی ہے میں نے خود دیکھے ہیں اور ان کی یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں آئے دن نمائش بھی کیجاتی ہے۔ ہم یہاں بطور نمونہ عبرت اور حیوانوں (خاصکر کتوں، بندروں اور گھوڑوں) میں تعلیم و تربیت کا پتہ چلانے کے لئے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ شہر اسٹاکہلم کے ایک تماشہ گھر (تھیٹر) میں، مجھے اس چیز کے دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ ایک بندر سیکل پر سوار ہو کر ہوٹل میں آیا اور سیکل سے اُتر کر نہار کھانے کے کمرے میں میز کے قریب بیٹھ گیا اور نہار طلب کیا۔ ہوٹل کے ایک خادم نے چند قسم کے کھانے کی رکابیاں چھری اور کانٹے کے ساتھ لاکر میز کے قریب رکھدیں اور چلا گیا۔ بندر نے ادھر اودھر نظر دوڑائی۔ اس طور پر کہ وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ پھر گھنٹی کو۔ جو میز پر دھری تھی بجائی خادم آکر میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بندر نے خاص حرکات کے ذریعہ ظاہر کیا کہ تولیہ جو کھانا کھانے کے وقت ہر مہمان کو دیا جاتا ہے۔ وہ بھول گیا ہے۔

۲۔ چند بندروں کو لاکر تماشہ کاروں نے انہیں سیکلوں پر سوار کیا اور اس کے بعد چند کتے لائے۔ ان میں سے ہر ایک اُلانگ کر ایک ایک بندر کی پیٹھ پر سوار ہو بیٹھا اور بندروں نے سیکلوں کو نہایت تیزی کے ساتھ چلانا شروع کیا اور چند دفعہ چکر بھی لگائے بغیر اس کے کہ وہ آپ یا کتے زمین پر گریں۔

۳۔ بیس سال پہلے ولاڈی قفقاز کے شہر میں، میں جس گھر میں ٹھیرا ہوا تھا۔ اس کا مالک اس کثرت سے مرغیاں رکھتا تھا کہ مقررہ وقت میں روزانہ دوبار ان کو دانہ ڈالتا تھا اور اس سے مراد جوار کے دانے ہیں جن کو چند گھنٹے پہلے ہی سے پانی میں بھگو لیا جاتا ہے۔ اسی گھر میں دوا فروشوں کا دلال بھی رہتا تھا جس کی عورت کے پاس ایک مرغی تھی جو صاحب خانہ کی مرغیوں کے ساتھ رہتی تھی لیکن روزانہ صاحب خانہ اپنی مرغیوں کو دانے کھانے کے لئے آواز دیا کرتا تھا۔ دلال کی عورت کے پاس کی مرغی ان کے ساتھ نہیں آتی تھی اور اسی طرح کچھ وقت گزرنے کے بعد جب دلال کی عورت اپنی مرغی کو آواز دیتی تھی تو وہ چلی آتی تھی اور دوسری مرغیاں نہیں آتی تھیں۔

۴۔ ابھی ابھی برلن کے عجائب خانہ میں دیکھا گیا ہے کہ شاہین کو کبوتر کے ساتھ ایک جگہ تربیت (پرورش) کر کے ایک ہی پنجرے میں رکھا گیا تھا۔

۵۔ میں نے برلن کے ایک تماشا گھر میں دیکھا ہے۔ ایک بڑا ٹوکرا چھت سے لٹکایا گیا۔ جس میں ایک کبوتر بیٹھا ہوا تھا۔ جب ٹوکرا زمین سے لگنے کو گز بھر باقی تھا اس وقت پانچ چھ بلیاں اچانک آگئیں اور پھاند کر ٹوکرے میں کبوتروں کے پاس جا بیٹھیں۔ پھر بہت سارے کبوتر باری باری سے اطراف سے آکر، اسی ٹوکرے میں بلیوں کے پاس جمع ہو گئے اور اسی حالت میں ٹوکرے کو اوپر کھینچا گیا۔

۶۔ ہاتھیوں نے اپنی سونڈھوں سے باجے کو، جو اس کام کے لئے بنایا گیا ہے، بجا کر اس سے موسیقی کی ایک لے کے موافق آواز نکالی۔

۷۔ گھوڑے سازہائے موسیقی کی آوازوں کے مطابق جو بجائے جاتے ہیں اپنے ہاتھ اور پاؤں کو منظم حرکت اور انتظام کے ساتھ رقص میں لاتے ہیں۔

۸۔ کتوں نے عددوں کے درمیان سے جو مقوی یا لکڑی سے کاٹے گئے تھے، ہر اس عدد کو جسے لوگ چاہتے تھے ڈھونڈکر نکالتے اور جس وقت دو عددوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں رکھا گیا تو ان کا حاصل جمع دریافت کرکے اس کے نیچے رکھدیا۔

۹۔ برلن میں ایک رات تماشا گھر میں کتوں کے شہر کو دکھلایا گیا، جہاں پچاس کے قریب چھوٹے بڑے کتے رکھے گئے تھے۔ اور تمام کو رنگ برنگ کا لباس پہنایا گیا تھا، ایک دروازے کے پیچھے سے، جس پر "مدرسہ" لکھا ہوا تھا، گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت ایک اور دروازہ سے چھوٹے کتے داخل ہوے مدرسہ کے سامنے آکر دروازہ کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑے کتے نے چھوٹی سی گاڑی میں کتوں کو بٹھاکر سیر کرایا۔ ایک نشہ میں چور ہوکر گلی میں گر پڑا کتوں کا پولس آیا اور اس کو پکڑکے لے گیا۔ علاوہ اس کے چند ایسے حیرت انگیز کام بتائے جو حقیقت میں اعجوبہ خیز تھے۔

اس قسم کی اور بھی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں اور ان سے آئے دن عجائب وغرائب میں نت نیا اضافہ کیا جاسکتا ہے جن کے ذریعہ حیوانوں میں تعلیم وتربیت کے اثرات دریافت کئے جاسکتے ہیں لیکن یہ وہی اعمال وحرکات ہیں جن کو تقلید وتکرار کے ذریعہ سکھلاتے ہیں، تفکر وتعقل کے ذریعہ نہیں۔ اسی طرح انسان بھی پہلے پہل جب دنیا میں آیا تو اس نے بہتیری چیزوں کو شعور حیوانی کے ذریعہ سیکھا مثلاً: مینہ، برف، ہوا، طوفان، اور سرما وغیرہ کو دیکھ کر، حیرت زدہ ہوگیا اور اس نے انہیں سے تجربے حاصل کئے لیکن ان کے اسباب وعلل کا پتہ نہ چلا سکا اسی طور پر بچہ اپنی ماں سے بہت سی چیزوں کو معلوم کرتا اور اس کی تقلید کرتا ہے۔ دنیا کے اولین دور میں انسان نے بھی حیوانوں اور پرندوں کی بہت سی باتوں میں تقلید کی یہانتک کہ بولنا بھی حیوانوں ہی کی آوازوں کی تقلید سے شروع کیا۔ ضروریات زندگی کو رفع کرنے کے لئے روزبروز نئے نئے کام مثلاً، گھر بنانا، کپڑے جانوروں کے پوست سے تیار کرنا اور لکڑی سے اسباب بنانا اور کشتیاں تیار کرکے دریاوں اور نہروں کو عبور کرنا۔ میووں کا توڑنا غاروں میں رہنا آگ جلانا، علاوہ ان کے اور بھی کاموں کا سیکھنا اور اب تک بھی بہتیرے

آدمی اسی قسم کی زندگی رکھتے ہیں۔

پھر کچھ تجربے حاصل کر کے بعض چیزوں کے اسباب و حکمت کو سمجھنے لگے انکی عقل روز بروز بڑھتی اور قوی ہوتی گئی اور بعض بعض قاعدے اور گر بھی دریافت کئے اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو تعلیم دی یہاں تک کہ وہ ایک منہ سے دوسرے منہ میں منتقل ہوکر، ہمارے اجداد تک پہنچی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بنی آدم کا اوّلین معلم خود فطرت یعنے زندگی رہی ہے اور یہ تمام چیزیں جو ہم رکھتے، سمجھتے اور پڑھتے ہیں وہ تمام تھوڑا تھوڑا اور قطرہ قطرہ جمع ہوکر مہیا ہوئی ہیں یعنے اتنے ہزار سال پہلے ہمارے اسلاف نے کوشش کی، زحمت اٹھائی اور خون کے گھونٹ پیکر، اپنی جانیں قربان کردیں تو جب کہیں ہمارے لئے یہ اسباب راحت فراہم ہوے اور آئے دن بھی نت نئی اور مفید چیزیں اختراع کیجا کر دنیا کی ترقیات کو اور آگے بڑھا رہی ہیں۔ ہم ان کے پیدا کرنے کی اطلاع ان کے سیکھنے اور بنانے کے سوا کچھ اور زحمت نہیں اٹھاتے اور اس صورت میں انسان سے آسان اور چھوٹے سے چھوٹا راستہ حصول مقصد کے لئے تعلیم و تدریس ہی ہوسکتا ہے۔

ہم نے پچھلے اوراق میں بیان کیا ہے کہ تعلیم، تدریس پر مقدم ہے تعلیم ایک عملی وجسمانی اندازہ کا نام ہے اور تدریس ایک نظری وعقلی درجہ کا۔ اس مسئلہ کے یہاں اعادہ کی ضرورت ہے کہ تعلیم و تدریس دونوں کے دونوں ایک دوسرے کے لئے لازمی ہیں یعنے اگر ہم تعلیم و تدریس سے فائدۂ عظیم اٹھانا چاہتے ہیں تو دونوں کے قواعد کی رعایت رکھنی چاہئے یعنے ہر ایک چیز جس کو ہم سکھلانا چاہتے ہیں، جہاں تک ہوسکے اس کی نظری وعملی دونوں صورتوں کو سکھنا چاہئے چونکہ اس میں اولاً نہ صرف ہمارا بدن بلکہ ہمارے دماغی قویٰ بھی شریک ہیں اسی لئے دوران تعلیم میں یہی ایک چیز (یہی اصول) خواہ وہ اخلاقی ہو یا علمی پیش نظر رہنی چاہئے اور بقدر امکان مثالوں اور نمونوں کے پیش کرنے کے علاوہ اس کے قواعد و اصول بھی بیان کردینے چاہئیں۔ اگرچہ زندگی کے اولین دور میں، بچہ کے قوائے دماغی اتنی قوت نہیں رکھتے جس سے وہ ہر ایک چیز کی حکمت کو سمجھ سکے اور بچہ کے دماغ میں مقدار سے زیادہ ٹھونس ٹھونس کر نہ بھرنا چاہئے۔ لیکن اس کے سوا

اور طریقوں سے یعنے اوہام، خرافات اور بے اصل چیزوں کے ذریعہ بھی بچہ کے دماغ پر بار نہ ڈالنا چاہیئے۔ بلکہ حقائق بھی بچے کے اندازۂ فہم کے مطابق بتانے چاہئیں۔

اگر ہم تربیت میں، صرف عملیات پر اکتفا کریں گے اور علم و عمل کے قواعد و اصول نہ سکھلائیں گے تو۔ (۱) اولاً بہت سا وقت ضائع ہوگا اس وجہ سے کہ ہر ہر بات کے لئے ایک ایک تجربہ کی ضرورت پڑیگی۔ (۲) ثانیاً بہم لغزشیں اور بڑی بڑی فروگذاشتیں سرزد ہوں گی اور بچہ کا حال بھی ایک بےحس مشین یا ایک بے عقل و ارادہ حیوان کی مانند ہو جائے گا۔

یہاں اس مثال کا ذکر کرنا، جو میرے مشاہدہ سے متعلق ہے۔ بیفائدہ نہو گا۔ سال عیسوی ۱۹۱۳ میں بلجیم کے پایۂ تخت شہر بروکسل سے مجھے پیرس جانے کا اتفاق ہوا ریل گاڑی میں ایک عورت اپنے خورد سال بچہ کے ساتھ میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ بچہ کھڑکیوں کے شیشے کی اندر سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا، یکبارگی اس نے اپنی ماں کی جانب متوجہ ہو کر کہا "امی جان دیکھو نا درخت اور مکان کس طرح رستہ چل رہے ہیں"! اس کی ماں نے جواب دیا "نہیں پیارے بچے، درخت اور مکان راستہ نہیں چل رہے ہیں، ہم راستہ چل رہے ہیں اور تمہاری آنکھوں کو اس طرح دکھائی دیتا ہے۔ شاید تم نے سوار ہونے سے پہلے نہیں دیکھا ہوگا کہ درخت اور مکان ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر ایستادہ تھے اور اگر وہ راہ چلتے تو گر پڑتے، ٹوٹ کر خراب ہو جاتے اور اب جب کہ گاڑی ٹھیرے گی تم دیکھو گے کہ وہ بھی ٹھیرے ہوئے ہیں! ماں نے چند منٹ تک اسی قبیل سے باتیں کر کے بچہ کو قانع کر دیا؛ اگرچہ بچہ واقعی قانون حرکت اور اس کی نفس الامری حقیقت کو نہ سمجھ سکا لیکن ماں سوائے اس طریقہ کے اور کچھ نہ رکھتی تھی اور فن تعلیم و تربیت بھی اسی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اُس وقت میں نے سوچا اگر بجائے اس کے ایک ایرانی ہوتی تو کیا جواب دیتی؟ اس کو آپ ہی غور فرما سکتے ہیں!

اس خیال کے مدنظر، مائیں، باپ، معلم، دایائیں، خادمات جو بات کہ بچہ کو سکھاتی ہیں انہیں چاہیئے کہ بچہ کی استعداد کے موافق چیزوں کی حقیقت و حکمت بھی سکھائیں

مثلاً: جس وقت بچوں کو صاف ستھرا رہنے کی تعلیم دیں تو انھیں حکم ہی نہ دیں اور نہ دھمکائیں اور نہ وہ آپ بھی ہمارے خوف کے مارے اپنے ہاتھ اور منھ کو پاکیزہ رکھیں بلکہ کہنا چاہیئے کہ اگر تم صاف ستھرے نہ رہوگے تو بیمار ہوجاؤگے اور مرض آگھیرے گا۔ کوئی شخص تمکو دوست نہ رکھے گا اور کھلونہ نہ دے گا .... اسی طرح کی اور بھی باتیں۔

نیز اسی طرح، جب ہم مدرسوں یا گھر میں بچوں کے بعض اخلاق و عادات کی اصلاح کرنا، یا بعض نئے نئے آداب اور فنی معلومات ان کو سکھانا چاہیں تو ہم کو صرف کہنے اور حکم دینے پر قناعت نہ کرنی چاہیئے؛ اس وجہ سے کہ صحیح اخلاق زبانی پند و نصائح کے ذریعہ نہیں سکھائے جاتے بلکہ عمل کے ذریعہ اخلاقی بُرائی یا اچھائی کو ثابت کر دکھائیں نہ یہ کہ اقسام کی ڈراونی شکلوں یا لکڑی کے ذریعہ، یا تہدید، یا عذاب جہنم سے اور، یا جنت میں ثواب و مکافات کی امید پر ان کو ڈرائیں، یا امیدوار رکھیں، یا ڈراونی آواز نکالنا اور ہوّا، یا دال چپاتی نیکر ڈرانا... اور بچہ کے ہاتھ میں نقل و شیرنی دینا اس میں فلان عادت کے چھوڑنے یا فلاں خصلت کے اختیار کرنے کی عادت پیدا کرنا۔ بلکہ ہر خصوص میں دونوں قاعدے ملا جلا کر استعمال کرنے اور افراط و تفریط سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اصولی اعتبار سے تعلیم و تدریس ایک دوسرے سے الگ نہیں کیونکہ ایک کامل فن معلّم و مربّی کے لئے ایک طرف سے فن تربیت و تعلیم کے قوانین اور نظریوں کو استعمال کرنے اور تجربہ کرنے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف سے اُن تجربوں کی بھی جانچ اور چھان پھٹک کرکے فنی قواعد و نظریات کی تصحیح و توسیع کرے۔

اسی اعتبار سے تربیت و تعلیم اور تدریس کی تعریف اور ان کی معنوی تشریح و توضیح اور ان کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق نیز فن تربیت کے پایہ و درجہ کی نسبت چند باتیں کہی جائیں گی جیسا کہ گزشتہ بیانات سے واضح ہوتا ہے: کسی ایک قوم کی تعلیمات کی غرض و غایت، اس کے اپنے افراد کے درمیان تربیت کی نشر و اشاعت ہے اور تعلیم و تدریس فن تربیت کے وسائل تصوّر کئے جاتے ہیں اس لحاظ سے تربیت کے درجہ کو علم سے بالاتر اور علم کو تربیت کا خدمت گزار تصوّر کرنا چاہیئے۔ اسی رو سے تربیت یافتہ شخص نیز

(اس معنی کے لحاظ سے، جس کو ہم نے بیان کیا ہے اور نہ اس معنے کے اعتبار سے، جسے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے) نرے تعلیمیافتہ شخص سے شریف تر ہے۔ اکثر و بیشتر اشخاص تعلیمیافتہ تو ہیں مگر تربیت سے محض بے بہرہ ہونے کے سبب بدترین اخلاق کے حامل ہوتے ہیں دراں حالے کہ وہ علوم اور ان کی صنعتیں ممکن ہے کہ ان کے اور ان کی اپنی قوم کے لئے زیاں و بدنصیبی کا سرمایہ فراہم کریں۔ اس قسم کے تعلیمیافتہ اشخاص کے نمونے ہر جگہ موجود ہیں۔

اسی طرح قوموں کے درمیاں وہ لوگ، جنہوں نے علوم و فنون میں بہت کچھ ترقی کی ہے متمدن نہ شمار کئے جانے چاہئیں۔ بلکہ ان میں کا ہر ایک جو کمال اور تربیت کے درجہ کے قریب تر ہے وہ متمدن تر ہے۔ اسی سبب سے تمدن و ترقی کا باہمی فرق معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ میں وہ افراد دملل جو تربیت صحیح کے فیض سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یعنے اخلاقی فضائل (مثلاً متانت، خود اعتمادی، شجاعت، صحت، ورزش، استقامت اور کوشش) کے حامل ہوتے ہیں وہ دوسروں سے زیادہ زندہ، مقصدور، خوش قسمت اور متمدن ہیں۔ قرن موجودہ، قرن عمل و کوشش ہے، جو فرد یا جو قوم کہ اس اکسیر سے بے بہرہ ہے وہ زندگی و حیات کی حقیقت سے بھی بے بہرہ رہے گی۔

جو چیز اس ستیزہ گاہ زندگی میں، اقوام کو فتحمند و کامیاب رکھتی ہے، جو شئے اقوام کے پژمردہ دلوں اور افسردہ روحوں کو حرکت و قوت بخشتی ہے، بلا شبہ وہی تربیت کامل ہے جو قوم "تربیت کامل" کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہے اس کے افراد بھی، قوی و آہنین جسموں، صحیح و سلیم فکروں اور حسن اخلاق سے آراستہ ہوتے ہیں اور انہی نیکبختی و سعادتمندی کے فرشتوں کی رہنمائی میں اس منزل مقصود کے قریب، جس سے انسانی جمال و کمال مراد ہے، پہنچتے ہیں اور تربیت کامل، سوائے تعلیم و تدریس کامل کی راہ کے، میسر نہیں ہوتی۔

از ابو المحاسن محسن خان متین

مدرس فارسی وسطانیہ دار الشفاء

ورزش جسمانی

ہمارا بحث نہایت ہی اہم ہے جس پر بقائے نسل اور زندگی کی کامیابی کا انحصار ہے اور جس پر باوجود انتظامات کے ہمارے مدارس میں زیادہ توجہ نہیں دیجاتی ہے اس سے میرا مطلب ورزش جسمانی ہے۔

ہمارا نقطہ نظر راقم کو اس مسئلہ سے گہری دلچسپی اور دلی لگاؤ ہے چنانچہ میں جہاں کہیں رہا اس تحریک میں عملاً حصہ لیتا رہا ہوں۔ میرے ناچیز خیال میں کھیل اور ورزش خواہ دیسی ہو یا انگریزی دونوں فائدہ بخش ہیں اور ان کا امتزاج مفید و کارآمد ہے (جیسا ہم آگے ثابت کریں گے) غرض کہ ہر قسم کے کھیل اور عمل جس سے کسی فرد کی قوت و توانائی اور صحت و تندرستی کی ترقی ہو اور قوت تحریک بھی ترقی و تربیت پائے اس کو ہم ورزش جسمانی میں شمار کریں گے اور ہمارا نقطہ نظر یہی ہے۔

اہمیت ورزش جسمانی ورزش جسمانی کی اہمیت بحیثیت مجموعی ذہن نشین کرنیکے لئے حسب ذیل امور ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں۔

الف جو طلبا اثنار تعلیم میں ورزش جسمانی کی طرف راغب نہیں رہتے انکے قوائے جسمانی میں انحطاط آجاتا ہے دوران خون خاطر خواہ نہیں ہونے پاتا۔ ہاضمہ نہایت کمزور ہوجاتا ہے اور وہ ایک صحت خراب کرکے ہزار نعمتوں سے محروم رہتے ہیں چنانچہ ایسے افراد جب تعلیم سے فارغ ہوکر دنیا میں آتے ہیں تو کسی کام کے نہیں رہتے۔ بلکہ بعض اوقات کبھی اثنائے تعلیم ہی میں اور کبھی بعد کو عملی دنیا میں آکر اپنی جان شیریں کو اسی تعلیم کی دیوی کے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ جس کے لئے عمر عزیز گنوائی تھی بس مکمل تعلیم وہ ہے جو جملہ قوائے جسمانی کو نہایت باقاعدگی و تربیت و موزونیت کیساتھ نشو و نما بخشے اس لئے ہمارا تعلیمی نصب العین یہ ہے کہ ایک صحیح القوی جسم میں صحیح الدماغ

انسان پیدا کریں۔ A sound mind in a sound body.

ب۔ آج کل ہمارے لئے دنیا میں ایک سرسبز و کامیاب زندگی بسر کرنا نہایت مشکل ہو گیا ہے اور زندگی کی کشاکش روز بروز سخت ترین ہوتی جا رہی ہے جس سے قوی ترین انسان بھی کمزور و پسپا ہو رہے ہیں اور اس کا اثر لازمی طور پر ان کی اولاد اور آنے والی نسلوں تک جاری و ساری رہے گا۔ ہم جو گذشتہ زمانے کے ممی اہرام مصری اور تواریخ میں اس قدر قوی ہیکل انسان دیکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ اب ویسے کہاں ہیں؟ اور اب جیسے ہیں آئندہ ویسے بھی نہ ہوں گے۔ ماضی قریب میں یعنے آج سے تخمیناً پچاس سال قبل حیدرآباد میں ایک ساٹھ سال کا آدمی ساٹھا پاٹھا کہلاتا تھا۔ اس کی اوسط عمر سو سال کی ہوتی تھی مگر اس نصف صدی کا انقلاب ملاحظہ ہو کہ اب ہماری اوسط عمر پچاس سال کی ہو گئی ہے اور اگر حسن اتفاق سے کوئی ساٹھ برس کا بھی ہو جائے تو وہ سٹھیا جاتا ہے (الا ماشاء اللہ)۔ اس لئے ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اس اٹھتی کونپل کو کامل و صحیح تعلیم اور تربیت جسمانی [illegible] بنائیں کہ وہ زندگی کی کشاکش کا اچھی طرح مقابلہ کرسکے اور آئندہ نسلیں [illegible] حالتوں میں موجودہ نسلوں سے [illegible]

ج۔ ہمارے زمانہ میں مختلف امراض جیسے ملیریا [illegible] اور کالرا [illegible] [illegible] ہو رہے ہیں۔ قدرت کا [illegible] قانون ہے کہ قوی ضعیف کو [illegible] انسان [illegible] [illegible] حملہ سے [illegible] راغب [illegible]

[illegible] Victory goes to the strong and [illegible] only the strong live long. [illegible]

بھی [illegible]

اور سوما بن سمجھتے ہیں جو قوی ہوں اگر ہم کو دنیا میں پنپنا اور ابھرنا مقصود ہو تو ورزش جسمانی کی طرف ضرور متوجہ ہو جانا چاہیئے۔

۵ اکثر لوگ اپنے محبوب پالتو جانوروں اور مویشیوں کی جتنی پرداخت کرتے ہیں اتنی توجہ اور وقت جسمانی حالت کے لئے نہیں دیتے حالانکہ یہ ترجیح بلا مرجح ہے۔ لارڈ آمیری امریکہ کے مشہور و ممتاز مصنف کہتے ہیں کہ "یہ تعجب خیز امر ہے کہ ہم سادیانہ فکر سے اپنے جسم کی حفاظت و نگرانی نہیں کرتے جس کی حالت پر ہماری زندگی اور خوشی کا اسقدر دار و مدار ہے"۔ علاوہ ازیں جسمانی ترقی و تربیت کا انسان کی سیرت پر بھی بہت کچھ اثر پڑتا ہے دماغی ترقی کا دار و مدار بھی جسمانی ترقی پر ہے۔ ایک صحیح رائے کی توقع ناقص یا بیمار جسم والے انسان میں نہیں ہو سکتی۔ بھارت ماتا کے سورما بھیم ارجن رام سیواجی وغیرہ عرب کے بے نظیر شجاع حضرت علی شیر خدا خالد سیف اللہ رض اور طارق اعظم وغیرہ۔ اور مشاہیر عجم محمود غزنوی بابر اکبر اعظم وغیرہ ہی کو لے لیجئے ہمیں اس تحریک کی طرف مائل کرانے کے لئے ایسی نامور ہستیاں کیا کم سبق آموز ہیں۔

قدرت بچپن ہی سے انسان کو ورزش جسمانی کی ترغیب دیتی ہے چنانچہ اپنی اولین منزل یعنی شکم مادر ہی سے حرکت شروع کر دیتا ہے اور جب پیدا ہوتا ہے تو ہاتھ پاؤں کی ورزش کرتا ہے پھر گھٹنا کھیلتا ہے چلتا پھرتا اور دوڑتا ہے۔ فروبل کا قول ہے کہ بچے کی تعلیم بھی کھیل کے ذریعہ ہونی چاہیئے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مشہور مقامات مثلاً دہلی لکھنو۔ میسور بمبئی اور کلکتہ۔ لاہور ڈھاکہ۔ حیدر آباد۔ علی گڈھ وغیرہ میں ہاکی فٹ بال کرکٹ ٹینس وغیرہ کے ٹورنمنٹ قائم ہوتے رہتے ہیں اور دوستانہ مقابلے بھی ہوتے رہتے ہیں کئی سال سے بلدہ و گلبرگہ میں بھی انٹر مڈل اسکول ٹورنمنٹ اور اسپورٹس ہوتے ہیں اور ہر سال شرکا میں اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی رفتار سست ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس نے اس کی اہمیت پر غور نہیں کیا عملی طور پر جیسا کہ پیش کیا جاتا ہے یورپ میں اکسفورڈ اور کیمرج وغیرہ مشہور مقامات

پر ان کھیلوں کے علاوہ کشتی اور پیراکی وغیرہ کے خوب جانبازانہ مقابلے ہوتے ہیں لیکن امریکہ اس تحریک میں سب سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں ورزش جسمانی کی تعلیم ہر یونیورسٹی کے طالب علم کیلئے لازمی ہے تاوقتیکہ کوئی طالب علم ورزش جسمانی کے امتحان میں کامیاب نہو اس کو ڈگری نہیں دیجاتی۔ نیز اصلی درسگاہوں میں طلبہ کو داخلہ کیوقت جسمانی توانائی کا امتحان دینا پڑتا ہے اور اسمیں کامیابی نہو تو بعض اوقات داخلہ نامنظور کیا جاتا ہے۔ مزید براں امریکہ میں خاص خاص مدارس ورزش جسمانی کے لئے مقرر ہیں جہاں بلحاظ اعلیٰ قابلیت وکارروانی بیس ہزار ڈالر (جس کے ۶۲۵۰۰ معاول سکہ کلدار ہوتے ہیں) تنخواہ پانے والے ڈرل ماسٹر متعین ہیں ہمارے مدارس میں کم مواجب وکم لیاقت ڈرل ماسٹر قدیم فوجی ورزش کی کچھ مشقیں کراکے اپنے فرائض کی کامل انجام دہی تصور کر لیتے ہیں اور غالباً صدر مدرسین یہ خیال کرکے کہ وہ اہل فن ہیں ان کے کام کی ایسی نگرانی نہیں کرتے جیسا کہ چاہئے نتیجہ یہ ہے کہ وہ جمناسٹک تو بالکل ہی نہیں کراتے دیسی جمناسٹک جیسے ملکھم۔ مگدر۔ لیزم وغیرہ سے تو نہ معلوم کیوں دلچسپی نہیں لیجاتی۔ جس طرح ایک طبیب کو جدید ترین وبہترین علاج سے واقف ہوکر اپنے مریضوں کو فائدہ پہنچانا چاہئے۔ اسی طرح ہمارے ڈرل ماسٹر صاحبان کو بھی جدید ترین اصولوں سے واقف ہوکر فائدہ پہنچانا ضروری ہے انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جدید ڈرل ایک باقاعدہ نظام میں محض روزمرہ زندگی کی فطرت حرکات اور کھیل کا اصطفاف اور ترتیب ہے، تاکہ وہ مدرسہ کی مصنوعی فضا میں زیادہ تعداد طلبہ سے کرائی جاسکے۔ جمناسٹک ایک بلند ومخصوص تعلیمی کام ہے اور وہ مشاغل تعلیمی کی بنیاد دینے میں اپنی جگہ کبھی نہیں کھو سکتی اور تعلیم جسمانی کا کوئی نصاب اس کو نیچا نہیں دکھا سکتا اس ضمن میں ڈرل ماسٹر صاحبان سے التدعا ہے کہ براہ کرم وہ اپنے فرائض کو زیادہ محنت وانہاک اور حسن خوبی سے انجام دیں مستحکم اور قابل تعریف کیریکٹر رکھیں اور طلبہ میں ضبط کو قائم رکھتے ہوئے خود بھی شریک ہوکر بہترین نمونہ و مثال پیش کریں۔ غالباً یہ نامناسب گذارش نہ ہوگی اگر میں یہ تحریک کردوں کہ وہ صاف پانی کے حوض یا کنوؤں کی اجازت حاصل کرکے طلبہ کو تیرنا بھی

سکھائیں۔ کیونکہ یہ ایک نہایت مفید وصحت بخش ورزش ہے۔

گھر کے باہر کے کھیلوں کی اہمیت | ہاکی فٹ بال کرکٹ وغیرہ مردانہ کھیل ہیں گو بظاہر کھیل معلوم ہوتے ہیں مگر فی الحقیقت بیک کرشمہ دو کار نہایت فائدہ مند اور سبق آموز ہیں۔

الف۔ دن بھر کام کرنے سے جو بار دماغ پر پڑتا ہے وہ دور ہو کر پھر سے کام کرنے کی قوت زندہ دلی اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے بقول غالب۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام	مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

جب طلبہ گھروں سے باہر نکل جائیں تو تازہ ہوا میں تنفس کا عمل اور میدان کا سماں انکے دلوں میں کشادگی اور ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو انہیں نئی زندگی اور توانائی بخشتا ہے انسان مثل درختوں کے زیادہ تر ہوا پر جیتے ہیں بڑی بستیوں کی ہوا صاف نہیں ہوتی اس لئے وہاں کے باشندوں کو یہ اصول مد نظر رکھنا چاہئے کہ جسقدر وقت گھروں کے باہر گذرے وہ ہرگز ضائع نہیں ہوتا بلکہ ہر لحاظ سے نفع بخش ہے۔ لارڈ اوبری کہتے ہیں طلبہ میں گیمس کا شوق فی الواقع ایک صحت بخش جذبہ ہے۔ اگرچہ ہمارے بعض مدارس میں ان پر بہت زیادہ وقت دیا جاتا ہے تاہم کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، پیراکی اور کشتی رانی نہ صرف خوش ترین مشاغل ہیں بلکہ وہ طلبہ کے لئے بہترین دوا اور ان کے امراض کے علاج ہیں۔ چنانچہ بہ تقاضائے اہمیت محکمہ نظامت تعلیمات نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ایک علحدہ صیغہ ڈی حیدر آباد ایتھلٹک ایسوسی ایشن قائم کی ہے نیز اس کی اہمیت اس امر سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر انگریزی اخبارات میں دی ورلڈ آف اسپورٹس یعنے اسپورٹس کی دنیا کے زیر عنوان اکثر ممالک کے گیمس اور اسپورٹس کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔

ایضاً ان کے فواید | گھر کے باہر کے کھیلوں کے فواید حسب ذیل ہیں۔

الف ان کھیلوں سے قوائے ذہنی کی خاطر خواہ تربیت ہوتی ہے۔ بدنما اور بھدے طلبا پھرتیلے اور مستعد اور وضعدار ہو جاتے ہیں۔

ب ۔ نیز ان سے سماجی (Social) اور اخلاقی بہت سے سبق حاصل ہوتے ہیں طلبہ آپس میں دوستی ملنساری اور رواداری سے پیش آنا سیکھتے ہیں اور تحمل مساوات وضبط کی تعلیم خاص طور پر عملی پیرایہ میں ذہن نشین ہوتی ہے۔

ج۔ طلبہ یہ سیکھتے ہیں کہ شکست خاموشی کے ساتھ کیونکر برداشت کریں کیونکہ جو شخص شکست کی حالت میں شرافت سے نہ پیش آئے تو گویا وہ شرافت سے کوسوں دور ہے نیز وہ یہ بھی سیکھتے ہیں کہ کامیابی صرف باتوں اور The man who is not a gentle man in defect is never a gentle man -

د ۔ بزدل وشرمسار لڑکا موقع سے فائدہ اٹھانا سیکھتا ہے اور لڑاکا اپنی طبیعت پر قابو پاتا ہے۔

ہ۔ گیمس کے قواعد کی پابندی کرنے سے طلبہ اخلاقی اور ملکی قواعد کے احساس کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں۔

دیسی کھیل | ہمارے دیسی کھیل مثلاً ایک ہاتھ ملا جھاڑ پھاند گڈ گڈ، کبڈی نون باٹ آنکھ مچولی بھی کم مفید نہیں کیونکہ وہ اتنے پرخرچ نہیں ہوتے جتنے انگریزی کھیل اس سے طلبہ بخوبی واقف ہوتے ہیں بالخصوص یہ کھیل ہمارے آب وہوا کے موافق بھی ہوتے ہیں کاش ہم انہیں حالت کس مپرسی سے نکالیں اور ضروری اصلاح وترمیم کے ساتھ انمیں نئی روح پھونک کر رواج دیں تو مناسب ہے۔ اس باب میں مولوی عبدالسلام صاحب ناظر مدارس بیدر قابل مبارکباد ہیں کہ موصوف نے ہماری کانفرنس کے اجلاسوں کے موقع پر عملی طور پر دیسی کھیل بتانے اور کھیلنے کی کوشش کی چنانچہ وہ اس تحریک میں کامیاب بھی ہوئے۔

انگریزی اور دیسی کھیلونکا امتزاج | جس طرح ہم کسی جماعت میں صرف جماعتی یا صرف انفرادی سوالات کر کے سبق کامیاب نہیں بنا سکتے یا جسطرح صرف راست طریقۂ تعلیم سے یا صرف طریقہ ترجمہ سے انگریزی تعلیم کے کامیاب نتائج نہیں پیدا کر سکتے بلکہ ان دونوں طریقوں کا اختلاط و امتزاج ضروری ہے اسی طرح مدارس میں بھی دیسی اور انگریزی کھیلوں کا امتزاج واختلاط ضروری ہے اور بلحاظ عمر و توانائی وتمول طلبہ کو ان کھیلوں سے مستفید کرایا جا سکتا ہے۔

ان سے ان معترضین کا اعتراض بھی رفع ہوجاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مفلس ہندوستانی روٹی اور چٹنی یا دال بھات کھا کر دشوار اور محنت طلب کھیلوں میں شرکت کے قابل نہیں رہتے دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ جو کچھ کھایا کریں گے اس کے ذریعہ ہضم کامل حاصل کریں گے۔ علامہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں ؎

تیری راکھ میں ہے اگر شرر تو خیال فقر وغنی نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

نتیجہ | ہمارے ملک کی اصلی کمزوری خرابی صحت ہے اس کا بہترین علاج ورزش جسمانی ہے جس سے نہ صرف قوی درست ہو کر صحت ہی درست ہوجاتی ہے۔ بلکہ شریفانہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جس کو انگریزی میں اسپورٹنگ اسپرٹ کہتے ہیں۔ ہر کھیل چاہئے وہ دیسی ہو یا ولایتی کامیابی میں انکسار اور شکست میں تحمل و بردباری کا عملی سبق سکھلاتا ہے پس ہمارا فرض ہے کہ ہم ورزش جسمانی پر پوری توجہ کرکے طلبہ میں کھیل کی اسپرٹ پیدا کریں تاکہ ہر شخص تنگ خیالی و رکیک عادات سے پاک رہ کر امن و امان کی زندگی بسر کرے

از محمد عبدالسلام صاحب ذکی

مددگار مدرسہ وسطانیہ یادگیر

شذرات

نوجوان لڑکیوں کی عملی تعلیم

میڈم روز تھال نے، جو پیرس کے سب سے بڑے موتیوں کے سوداگر کی بہن ہیں۔ ایک بے نظیر مدرسہ دریائے سین کے جنوبی طرف قائم کیا ہے جس کا مقصد صرف یہی ہے کہ نوجوان لڑکیوں کو خانہ داری کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ شادی کے بعد سلیقہ شعار بیویاں اور مائیں بن سکیں۔

اس درس گاہ میں ۱۷ سال سے ۲۵ سال کی عمر تک لڑکیاں شریک کی جاتی ہیں۔ اس کے لئے نہ کوئی نصاب مقرر ہے اور نہ کسی قسم کی جماعت بندی بلکہ تمام لڑکیاں ایک ہی جگہ بیٹھتی ہیں۔ پہلے انہیں زبانی تعلیم دیجاتی ہے اور اس کے بعد عملی۔ اس درسگاہ کی لڑکیاں مختلف قسم کے پکوان سے واقف ہیں انھیں اس بات کا سلیقہ ہے کہ کم آمدنی میں کیسے گذر بسر کی جائے اور آمدنی کی تقسیم کسطرح پر ہو کہ تمام ضروریات پوری ہو سکیں۔ لڑکیاں اس سے بھی واقف ہیں کہ کم مصارف میں چھوٹے سے چھوٹا کمرہ کس طرح سجایا جائے کہ گنجایش کافی نکل آئے۔ وہ پرانے فرنیچر پر روغن کرنا جانتی ہیں۔ اور چھوٹے بچوں کی نگہداشت دودھ پلانے اور چھاننے کا طریقہ غرض کہ خانہ داری حفظان صحت اور سائینس کے کوئی اصول ایسے نہیں ہیں جن کو وہ نہ جانتی ہوں۔

جب کوئی نئی لڑکی داخل ہوتی ہے تو ایک ایسے فرضی گھر کا انتظام اس کے تفویض کیا جاتا ہے جس کی آمدنی بہت کم ہے۔ لڑکی کا کام ہے کہ کفایت شعاری سے کام لے۔ اور اس فرضی گھر کو کامیابی کے ساتھ چلائے۔ حال ہی میں اخبار کے ایک نمایندے نے میڈم روز تھال سے ملاقات کی وہ اس وقت اپنے شاگردوں کو کھانا پکانے کا سبق دے رہی تھیں اور چند نئی لڑکیوں سے سوال بھی کر رہی تھیں کہ اگر ڈیڑھ شلنگ تمہیں ملے اور کہا جائے کہ اپنے شوہر کے لئے دو وقت کھانا تیار کرو تو کیا کرو گی۔ لڑکیاں جواب دیتی ہیں جنھیں بورڈ پر لکھ کر اصلاح خیال کے لئے بحث مباحثہ کیا جا رہا تھا۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ نئی لڑکیوں کے بیانات سے اسے بے حد حیرت ہوی۔ لڑکیوں کو مطلق اس کا اندازہ نہ تھا کہ کتنی مقدار گوشت کی کافی ہوگی

اور نہ یہ معلوم تھا کہ اشیاء کی کیا قیمتیں ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم خانہ داری خصوصاً عملی تعلیم کی کس قدر ضرورت ہے۔ ازدواجی زندگی کے دل خراش واقعات اور موجودہ نکبت و اسباب ایک حد تک اسی عملی تعلیم کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔ جب میڈم روزنتھال کے مدرسے طاق ہو کر لڑکیاں نکلتی ہوں گی تو ان کی زندگی کیا ہی خوش گوار اور کامیاب ہو گی!

نظام کالج کے اسپورٹس | ۳۰ آذر ۱۳۲۹ف کو دن کے ۲ بجے سے نظام کالج کے اسپورٹس شروع ہوئے مہمانوں اور دیگر عمائدین سلطنت کے استقبال کی شاندار تیاریاں کی گئی تھیں حضور اقدس و اعلیٰ نے شرکت ہمایونی سے حاضرین کو مفتخر اور ممتاز فرمایا اور طلبہ کے کرتب پر شاہ جمجاہ نے اظہار خوشنودی فرمایا بعد چائے نوشی مراجعت عمل میں آئی۔

حضرت ولی عہد شہزادہ اعظم جاہ بہادر نے انعامات تقسیم فرمائے یہ شاندار اجتماع ہپ ہپ ہرے کی صداؤں کے ساتھ منتشر ہوا۔

ایرانی طلبہ اور رضا شاہ پہلوی | اواخر شہریور میں ایرانی طلبہ کی ایک جماعت کو بغرض تعلیم یورپ روانہ کرتے ہوئے اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی نے طلبہ کو مخاطب کر کے ایک پُر مغز اور نصیحت آمیز تقریر کی۔ دوران تقریر میں ان کے لائحۂ عمل کو سمجھاتے ہوئے شاہ کج کلاہ نے فرمایا کہ طلباء کو اپنے فرائض سے غافل نہ ہونا چاہئے۔ اور نہ تعلیم کے سوا ان کا کوئی اور مطمح نظر ہونا چاہئے۔ طالب علم ایک سپاہی کی مانند ہے۔ سپاہی کا اقتدار اس کے اسلحہ سے ہے اور طالب علم کا اقتدار اس کی تعلیم میں پوشیدہ ہے اگر طالب علم اپنے فرائض سے غفلت کرے اور تعلیم سے جی چرائے تو حقیقتہً وہ اس سپاہی کے مانند ہے جس نے اپنے ہتیار ڈال دئے ہوں۔ ہر خدمت گذار خواہ وہ سپاہی ہو یا طالب علم رنج و محنت برداشت کرے تاکہ وہ نیک بختی اور ترقی سے بہرہ مند ہو سکے تمہیں اس نکتہ کو اپنا نصب العین بنانا چاہئے۔ تم آرام و آسائش کے لئے یورپ نہیں جا رہے ہو۔ بلکہ تحصیل علم و ادب کے لئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ علمی و اخلاقی سرمایہ سے مالا مال ہو کر اپنے ملک کی خدمت انجام دو۔

میں آرزومند ہوں اور اپنے خدا سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اتنی عمر دے کہ تمہاری مراجعت کے بعد تمہاری تعلیم کے نتائج کو ملکی خدمات کی انجام دہی میں ملاحظہ کر سکوں۔

تقریر کے رامانجا چاری۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی بتقریب جلسۃ الوداع | میں آپ حضرات کی اس عزت افزائی

جس کا اظہار اس تقریب کے ذریعہ فرمایا گیا ہے نہایت شکر گزار ہوں۔ آپ نے میرے کام اور قابلیت کی جو تعریف کی ہے اس کا میں ہرگز مستحق نہیں۔ میں ان ہستیوں میں سے ہوں جن کا قلب ہمیشہ تشنہ کام ہی رہا میں نہیں سمجھتا کہ میں اپنے پیشہ میں کامیاب رہا۔ جو کچھ کامیاب رہا۔ جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی اس کا سہرا آپ ہی کے سر ہے اور محکمہ متعلقہ کی سرپرستی پر منحصر ہے میرا حصہ اسی قدر ہے کہ میں نے اپنے فرایض حتی الامکان اپنے اطمینان کی حد تک بجا لانے کی کوشش کی۔ زندگی کے معنے خوشی اور خوش نمائی کے نہیں ہیں۔ بلکہ زندگی حقیقت میں فرائض کی انجام دہی ہے جسے میں نے اپنی بساط کے مطابق بلالحاظ حیلۂ سچائی اور آزادی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی۔

میرے عزیز طلبہ! جن محبت آمیز الفاظ میں آپ نے میرے متعلق خیال ظاہر کیا ہے اس کا گہرا نقش میں اپنے دل پر لے جاؤں گا۔ میں نے اکثر آپ کے ساتھ سختی کی ہے مگر آپ نے اس کو محسوس کرلیا۔ کہ اس میں آپ ہی کی بہبودی ملحوظ تھی۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ اخلاق پسندیدہ و محمودہ کا نمونہ بنے۔ اگر کوئی طالب علم اس معیار تک نہ پہنچے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی تعلیم محض تضیع وقت ہے۔ اخیر میں میں اساتذہ صاحبان سے خواہش کرونگا کہ وہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خواہش کریں گے اور روحانی ترقی کو کبھی فراموش نہیں کریں گے استاد کو ایک صناع کی طرح بے جان اشیا سے سابقہ نہیں پڑتا ہے بلکہ اس کے ہاتھ میں جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں جن کی قسمتوں کا سنوارنا یا بگاڑنا اس کے ہاتھ میں ہے۔

یوم الکشافہ۔ یہ سالانہ تقریب ۴ راکتوبر ۱۹۲۹ء کو نظام کالج کے بازی گاہ پر منائی گئی مطلع صاف اور موسم خوش گوار تھا مستقل ناظم صاحب بائے اسکاؤٹ بھی جو ولایت سے کچھ دنوں پیشتر آچکے تھے، موجود تھے، موصوف نے اپنی خدمت کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس لئے معزز ناظم صاحب نے صدارت کی۔ اس اجتماع کی یہ نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ سابقہ نظام العمل کی پابندی کی گئی، وعدوں کی تجدید ہوی مستقل ناظم صاحب کا استقبال کیا گیا، تقریریں ہوئیں اور خان فضل محمد خاں صاحب ایم اے ریگلو ناظم تعلیمات کا پیام جو خاص اس تقریب کے سلسلہ میں وصول ہوا تھا پڑھ کر سنایا گیا اور چھپے ہوے پرچے اضلاع پہنچے اور حاضرین میں تقسیم کئے گئے۔ افسوس ہے کہ جناب ناظم صاحب تعلیمات اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے مگر موصوف کے پیام سے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اہل

سے ظاہر ہے کہ اس تحریک سے ممدوح کو کس درجہ دلچسپی ہے
شام میں کیمپ فائر اور فینسی ڈریس کے مظاہرے ہوئے اور جلسہ برخاست ہوا۔

جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم اے (کینٹب)
ناظم تعلیمات سرکار عالی کا پیام
(سال آیندہ کے لئے جمیع کشافوں کے نام سلام و برکات)

کشافی (اسکاوٹنگ) ایک عالم گیر تحریک ہے۔ ہر منفرد کشاف (اسکاوٹ) کا نمونۂ نیک پیکر کشافی بہترین متحرکہ قوت ہے۔

(فضل محمد خاں)

مولوی سید علی اکبر صاحب منصرم ناظم بائے اسکوٹ پیام بالا کے ارسال کیساتھ تحریر فرماتے ہیں کہ مذکورۂ بالا پیام مختصر مگر معنی خیز ہے کشاف کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی اخوت کا فرد ہے جو تمام دنیا میں بلا لحاظ قوم و ملت پھیلی ہوی ہے۔ اور جن میں ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ قومی انبساط اور مفاہمت کو ابھارنے کے لئے اس سے بہتر کوئی تحریک نہیں ہے۔ بچوں کی سیرت سازی میں یہ تحریک بے حد مفید ہے۔ اس لحاظ سے ہر کشاف کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنا چاہیئے اور روزمرہ زندگی میں قواعد اسکاوٹ کی پابندی کرکے اس تحریک کے نصب العین کی تائید و ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے۔

تقریر مس آمنہ پوپ بمقام جنیوا ۔ ذیل میں مس آمنہ پوپ پرنسپل زنانہ کالج نامپلی کے اس مضمون کا اقتباس درج ہے جس کو انہوں نے ورلڈ فیڈریشن آف ٹیچرس ایسوسی ایشن کے اجلاس میں بمقام جنیوا پڑھا تھا۔ "آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشن کی متفقہ قرارداد کہ "ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا وسیلہ ہر صوبہ کی مروجہ زبان ہونی چاہیئے اور گورنمنٹ پر لازم ہے کہ جہاں کہیں ضرورت ہو دارالترجمہ قائم کرے تاکہ سائینس اور ادب کی کتابوں کا ترجمہ ہو سکے۔" کا حوالہ دیتے ہوے مس پوپ نے فرمایا: یہ بین فرق اس امر کی دلیل ہے کہ ماہرین تعلیم آرزو مند ہیں کہ ہندوستان کا نظام تعلیم صحیح بنیاد پر قایم ہو پچھلے ساٹھ سال سے ہندوستانی طلبہ ایک

غیر زبان کے حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر حل مشکلات اور لغات میں جو وقت ضائع ہورہا ہے اس کا لحاظ کرتے ہمارے نتائج شاندار نہیں ہیں۔ ریاست حیدرآباد کے بادشاہ جمجاہ نے ابتدا ہی سے اس جانب توجہ مبذول فرمائی اور اس کو پالیا کہ خیالات جدید کی ترویج بسرعت اور بلا تضیع وقت و محنت اپنی ہی زبان میں بجائے کسی غیر زبان کے بآسانی ممکن ہے۔ لہذا ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر حیدری کی تحریک پر عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری بارگاہ خسروی سے صادر ہوئی اور اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیتے ہوئے انگریزی زبان لازمی کی گئی۔

یہ تحریک اپنی نوعیت کی اعتبار سے پہلی اور سب سے اہم تھی جس کی کامیابی قطعی طور پر اب تسلیم کیجا چکی ہے۔ اسی یونیورسٹی کے طلبہ نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور اس قلیل مدت میں ایسے نتائج بیحد امید افزا ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ سب انتظام ذکور کے لئے ہے۔ ابھی اناث کی اعلیٰ تعلیم کا معقول انتظام نہیں کیا گیا۔ ہائی اسکول یا امتحان کیمبرج کامیاب طالبات کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دوسری یونیورسٹیوں میں جانا پڑتا ہے۔ کسی ملک کی عورتیں بالخصوص ملک ہندوستان کی مقدس روایات کی محافظ و پاسبان ہیں۔ مگر ہندوستانی عورتیں مغربی خیالات سے بالکل بے بہرہ ہوتی ہیں۔ ان کی جس قدر بھی معلومات ہے وہ مذہبی کتب اور دیسی زبان کے ادب پر مبنی ہوتی ہے اور مغربی روشنی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پس عورتوں کی خالص مشرقی تعلیم اور مردوں کی مغربی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر دو صنف کے خیالات کی ہم آہنگی مفقود اور تعلیم و تمدنی مغائرت روبترقی ہے۔ سخت ضرورت ہے کہ لڑکیاں زیور علم سے آراستہ ہو کر اپنے شوہروں کی بہتر رفیق بنیں اور آپس کے تعلقات خوش گوار ہوں۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ ایسی مائیں بنیں، جن کے ہاتھوں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت اسکول جانے کی عمر تک اچھے طریقہ پر انجام پائے۔

انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں تضیع وقت کا جو لحاظ ذکور کے لئے کیا گیا وہ اناث کی تعلیم میں زیادہ قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کی شادی مقابلۃً جلد ہوجاتی ہے۔ اس لئے ہر دو صنف کے معیار قابلیت کو برقرار رکھنے کے لئے ازبس ضروری تھا کہ اناث کے لئے بھی اردو کو ذریعہ تعلیم کیا جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے زنانہ کالج نامپلی کا قیام

عمل میں آیا۔

موزوں اسٹاف کا سوال اہم تھا۔ مگر اسے یوں حل کیا گیا کہ اسی کالج کی دو مسلمان طالبات کو ولایت بھیجا گیا اور آئندہ بھی اور طالبات کو بھیجا جائے گا۔ جن کی واپسی پر یقین ہے کہ وہ مغربی علوم و فنون اصول حفظان صحت وغیرہ سے آراستہ ہوکر اپنی بہنوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دقیانوسی رسم و رواج، قدیم توہمات اور سب سے زیادہ جہالت کے دور کرنے میں انتہائی کوشش سے کام لیں گی۔

اردو کے حروف ہجا کے متعلق ایک جدید تحقیق

سالنامہ رہبر دکن بابتہ ۱۳۳۹ف صفحہ ۲۲۳ پر جو ایک طویل مضمون "اردو کے حروف ہجا" کے عنوان سے شایع ہوا ہے اس کے ملاحظہ سے ہمیں یہ مسرت بخش علم ہوا کہ ابوالمحاسن محسن خان صاحب متین نے جو ہمارے گروہ مدرسین میں سے ہیں اور اس وقت صوتیات کے محققانہ مطالعہ میں مصروف ہیں اردو کی ہجا کی نسبت تحقیق کرکے ثابت کر دیا ہے کہ اس زبان کی ہجا میں ۲۴۲ آوازیں ہیں چنانچہ اس اہم تحقیق کی اطلاع ہم ناظرین کی معلومات کے لئے انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں،

"یہ امر مسلمہ ہے کہ جو زبانیں متعدد السنہ سے مخلوط ہوتی ہیں وہی عالمگیر مقبولیت بھی حاصل کرتی ہے اس اعتبار سے تعجب نہیں کہ اردو ہجا بھی، بلحاظ کثرت حروف جس میں دنیا بھر کی زبانوں کے حروف کے ادا سے مخارج کی قوت موجود ہے، اپنی وسعت و ہمہ گیری کا لوہا منوا دے۔

تعداد حروف کے اعتبار سے سنسکرت کا درجہ چینی حروف کے بعد مانا گیا ہے۔ لیکن اردو زبان کے حروف ہجا، جن کی تعداد ہم نے پچھلے اوراق میں بیان کر دی ہے، مولوی عبدالحق صاحب کے بیان کے مطابق پچاس (۵۰) ہے اور فتح محمد خان جالندھری کی تحریر کے بموجب ۵۱ ہے۔ اور مولف فرہنگ آصفیہ کی تحقیق کے لحاظ سے ۵۵ ہے۔ لیکن راقم الحروف کی نظر میں اردو کی ہجا میں حروف کی تعداد ۲۴۲ ہے جس طرح سنسکرت زبان بلحاظ تعداد حروف دنیا کی زبردست ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے، اسی طرح ہمارا یہ دعوی ہے کہ اردو زبان بھی دنیا کی زبردست ترین زبانوں میں تصور کی جاسے گی"۔

جلسہ الوداعی مولوی احمد حسین خاں صاحب بی اے صدر مدرس فوقانیہ دار العلوم بلدہ

یہ شاندار تقریب بتاریخ ۲۲ مہر ۱۳۴۳ف زیر صدارت مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے نائب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ منعقد کی گئی۔ اس روز مدرسہ بیرقوں اور گملوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ مدرسے کے پھاٹک کے پاس اساتذہ صاحبان استقبال کے لئے ایستادہ تھے اور اسکاوٹ گارڈ پھاٹک کے دونوں جانب صف بستہ موجود تھا۔

جلسہ کی ابتدا قاری فضل علی صاحب نے قرات سے کی، جس کے بعد مسٹر پرکاش راؤ اور مولوی عبداللطیف صاحب نے صدارت کی تحریک اور تائید کی عالیجناب صدر مہتمم صاحب بلدہ نے کرسی صدارت کو زینت بخشی۔

سب سے پہلے مولوی سعادت اللہ خاں صاحب مولوی کامل نے جامعیت اور خوش اسلوبی کے ساتھ مولوی احمد حسین خاں صاحب کی انتظامی قابلیت، تدبر، اشاف کے ساتھ مساوات کا سلوک اور طلباء کے کام کا بروقت معائنہ وغیرہ مثالوں کے ذریعہ بیان کیا اس کے بعد مولوی تصدق حسین صاحب صادق جائسی نے اپنے دلچسپ مضمون اور دلکش نظم کے ذریعہ جو سچے اور مخلصانہ جذبات سے مملو تھی حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ طلبہ نے بھی تقریریں کیں جن سے ان کے جذبات اور خیالات کا پورا پورا اظہار اور صدر صاحب موصوف کی قابل تقلید کارگزاری کا سچا اعتراف ہو رہا تھا۔ طلبا اور مدرسین کی تقریروں کے بعد صدر صاحب موصوف نے اظہار تشکر اور اشاف کی کارگزاری کا اعتراف فرماتے ہوے جو بیش بہا خیالات ظاہر فرمائے، ان کا ایک جز جو مقصد تعلیم سے متعلق ہے حرف بحرف درج ذیل کیا جاتا ہے۔ سب سے آخر میں صدر جلسہ نے پرمغز تقریر فرماتے ہوے پرنسپل صاحب کی کارگزاری اور دار العلوم کی قابل مبارکباد ترقی کا ذکر کیا نیز فرمایا کہ حین معائنہ میں نے مدرسے کے تمام کل پرزوں کو ہمیشہ مستعدی کے ساتھ سرگرم عمل پایا۔ صدر جلسہ کی تقریر کے بعد پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور مع اشاف فوٹو لیا گیا۔ اس رسم کے بعد بادل پرنم معزز مہمان کو رخصت کیا گیا۔

تقریر مولوی احمد حسین خان صاحب

تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ لڑکے نوشت وخواند سے واقف ہو کر اپنا پیٹ

پالنا سیکھ جائیں بلکہ مقصد تعلیم اس سے کہیں بالاتر ہے۔ قدما کا خیال تھا کہ مقصد تعلیم حصول علم ہے اگر طالب علم نے کسی علم و فن میں دستگاہ حاصل کرلی تو تعلیم کی غرض و غایت پوری ہوگئی مگر آج کل جس طرح کل علوم و فنون میں نئے نئے انکشافات ہوئے اور ہوتے جارہے ہیں اسی طرح فن تعلیم میں بھی حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے اور اصول تعلیم کے متعلق نئے نئے نظریے معرض ظہور میں آرہے ہیں زمانہ حدید کے ماہرین فن تعلیم جن میں اہل امریکہ کا حصہ غالب ہے تعلیم کو روز مرہ زندگی اور طرز معاشرت کے مطابق بنانے میں کوشاں ہیں اُن کے خیال میں تعلیم کا مقصد نرا حصول علم نہیں بلکہ انسان کے قویٰ اور ذہنیت کی نشوونما ہے، ایسی نشوونما نہیں جو کسی بیرونی اثر کی کارگزاری ہو بلکہ وہ نشوونما جو انسان کی اندرونی اُپج سے عمل میں آئی ہو اور جس میں بہ نسبت معلم کی کوششوں اور محنتوں کے فطرت کا ہاتھ زیادہ کام کررہا ہو۔ تعلیم کا مقصد زمانہ حدید کے نظریوں کے مطابق یہ ہے کہ لڑکے کے لئے عملی زندگی میں حصہ لینے اور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بنانے کے ایسے مواقع پیدا کئے جائیں کہ اس کی اندرونی اپج اور قویٰ کی خودبخود نشوونما ہوتی رہے اور ماحول کے ہر ایک پہلو سے واقفیت حاصل کرکے وہ اپنے کو زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب بنانے کے ذرائع خود ڈھونڈھ نکالے۔ انہیں ذرایع سے کام لے کر ان کو اپنی زندگی کے لئے مفید و کارآمد بنانا تعلیم کہلاتا ہے۔ لہذا موجودہ خیال کے مطابق کتابوں کی معلومات کو اپنے دماغ میں ٹھونس ٹھونس کر بھرنا دوسروں کے تجربات و مشاہدات کو بلا ذاتی تحقیق اور عملی کوشش کے اپنا رہنما بنانا، تعلیم کے مقاصد میں داخل نہیں ہے بلکہ عملی زندگی کے ہر ایک شعبے میں حصہ لینا، اخلاقی و معاشرتی ماحول سے مطابقت پیدا کرنا ہر ایک چیز کو اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی مدد سے سمجھنا استقرائی اصول تعلیم کو استخراجی اصول پر ترجیح دینا، اکتساب معیشت کی بہ تمام و کمال اہلیت پیدا کرنا، فنون لطیفہ سے مس حاصل کرنا، قدرت کی دلچسپیوں اور ادبیات کی خوبیوں سے لطف انگیز ہونے کی استعداد بہم پہونچانا تعلیم کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ لہذا درس و تدریس کے علاوہ مدرس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ طالب علم کو ان تمام صفات سے متصف کردے جو اوپر بیان ہوچکی ہیں۔ وہ مدرسہ جو بچوں کو محض کتابوں کے کیڑے بنادے سوسائٹی اور مکتب کے لئے ایک بار گران ہے۔

ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ سائمن کمیشن کی مقرر کردہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ، جو ہندوستان کی تعلیمی ترقی سے متعلق ہے، حال ہی میں شائع کر دی۔ یہ کمیٹی کُل چھ افراد پر مشتمل اور اس کے صدر سر فلپ ہارٹوگ چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی تھے تعلیمی امور میں جملہ اراکین کمیٹی بجز راجہ زید ناتھ کے جنھوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور ان کے لیے مدارس میں نشستیں مختص کر دینے کے مسئلہ پر سخت اختلاف رائے ظاہر کیا ہے متفق ہیں۔

تعلیم عام کرنے کے مسئلہ کو خاص اہمیت دیتے ہوئے، کمیٹی نے اس کی ذمہ داری اور مختلف طبقات اور رقبوں میں اس کا انتظام، گورنمنٹ پر عائد کیا ہے۔ جو بالکلیہ مقامی عہدہ داروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ موجودہ نظام تعلیم کو نہایت شد و مد کے ساتھ غیر موثر اور تضیع وقت و محنت قرار دیتے ہوئے یہ سفارش کی گئی ہے کہ اُن تمام ڈھائی کرور طلبہ اور طالبات میں سے جو زیر تعلیم نہیں ہیں، ۲۰ فی صدی استثنائی صورتوں کو نکال کر بقیہ اسّی فی صدی کو ساڑھے انیس کرور روپیہ کے مزید مصارف سے زیر تعلیم لایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کمیٹی کی رائے میں تعلیم عام کر کے جہالت کو دور کیا جا سکتا ہے۔ سفارشات کمیٹی کے نمایاں خط و خال یہ ہیں۔

تحتانی مدارس میں داخلہ کی کثرت سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ تعلیم سے جو قدیم الایام کی بے تعلقی اور منافرت چلی آ رہی تھی۔ بتدریج دور ہو رہی ہے۔ عورتوں میں سیاسی اور سماجی امور سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور ان کی طرف سے مطالبات بھی ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد زیر تعلیم میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ ادنیٰ طبقہ کی اصلاح کی بہت کچھ کوشش کی گئی ہے اور اب ان میں حصول علم کا شوق اور احساس نمایاں ہے۔ ہر طرف قائدین اور اہل الرائے مسائل تعلیمی کے حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ رقمی مطالبات اور مزید اخراجات کی تحریکات برابر پیش ہو رہی ہیں اور ان کی منظوری کونسلوں سے دی جا رہی ہیں۔ مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ پورے نظام تعلیم کے کل پرزے کچھ ایسے مچھے ہوئے ہیں کہ تعلیمی فائدہ رسانی کم اور تضیع وقت و محنت زیادہ ہے۔ پرائمری مدارس کی تعداد میں اب تک جو کثیر اضافہ ہوا ہے اس کے مطابق جہالت میں کمی نہیں ہوئی۔ موثر تعلیم کا مسئلہ ذات پات کے جھگڑوں، باہمی مناقشوں اور زبان

کے اختلاف کے باعث نازک ضرور ہے۔ مگر تحتانی تعلیم کا یہ نصب العین کہ جہالت دور ہو اور پبلک تعلیم یافتہ ہو کر اپنے فہم و ادراک کے مطابق کونسلوں میں رائے دے، سرے سے مفقود ہے۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ صغیر جماعتوں میں طلبہ کی جتنی کثرت ہے اتنی جماعت سوم تک باقی نہیں رہتی۔ ایک صوبہ میں جہاں تحتانیہ مدارس بہت ہیں، تعداد طلبہ زیادہ اور اخراجات بڑھتے ہوئے ہیں یہ حال ہے کہ جماعت سوم کی تعداد ۱۹۲۷ء میں دس سال پیشتر کی تعداد سے دس ہزار کم پائی گئی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ موجودہ دیہی حالات کے تحت جب کہ دیسی زبان کا ادب نہ ہونے کے برابر ہے، طلبہ کو مطلق موقع نہیں ملتا کہ مدرسہ چھوڑ کر نوشت وخواند جاری رکھ سکے اور آگے چل کر اس کا شمار خواندہ اشخاص میں ہو حقیقت یہ ہے کہ خواندہ طلبہ بھی مدرسہ چھوڑنے کے بعد تھوڑی ہی عرصہ میں جاہل بن رہے ہیں۔ اس قسم کی رجعت ذکور تک محدود نہیں بلکہ اناث میں شدت کے ساتھ ہے نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں میں اختلاف تعلیم اور علمیت بجائے دور ہونے کے اور بڑھ رہا ہے۔ گو اناث کی تعلیم میں روزافزوں ترقی ہو رہی ہے مگر طریق چارہ گری ناکافی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ اناث کی تعلیم میں لڑکی کی تعلیم ہی نہیں۔ بلکہ ماں کی تعلیم مضمر ہے۔ لہذا ہندوستان کی ترقی کے مدنظر ہماری قطعی رائے ہے کہ ہر توسیع کی اسکیم میں طالبات کی تعلیم کو فوقیت اور ترجیح دیجائے۔ غرضکہ پڑھ لکھکر طلبہ و طالبات کچھ ہی عرصہ میں جاہل بن رہی ہیں۔ خانگی مدارس اور مکتب خانوں کے طالب علم جن میں صرف ایک ہی استاد کام کرتا ہے اسطرح جہالت کا شکار ہو رہے ہیں بعض گواہوں نے اپنی شہادت میں یہ بیان کیا کہ اس کا فوری انسداد جبری تعلیم کے نفاذ سے ممکن ہے۔ اس کو ضروری تصور کرتے ہوئے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی لگا ہوا ہے کہ جبری اسکیم کے نفاذ سے بعض حصوں میں ناقابل برداشت مالی مشکلات پیش آئیں گی ایسی حالت میں کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ صحیح اصول پر دیسی زبانوں میں قومی تعلیم کو رواج دیا جائے۔ پرائمری تعلیم کی اصلاح کے لئے ٹرینڈ اساتذہ کافی تعداد میں مہیا کئے جائیں اور ان کی تنخواہیں معقول ہوں جماعت صغیر کے لئے بہتر سے بہتر مدرس کا انتظام ضروری ہے تعلیمی نگرانی کے لئے انسپکٹروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہونا چاہئے۔ اضلاع کے

مدرسین ہمدرد ہونے کے علاوہ مقامی حالات سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ ان اصلاحات کے ساتھ ساتھ نصاب میں ایسی ترمیم اور تبدیلی کی جائے جو دیہی ماحول کے عین مطابق ہو۔

ثانوی تعلیم میں بلحاظ تعلیم و تدریس چند حیثیتوں سے ترقی ہوئی ہے اور مدارس کے سرگرمیوں اور دلچسپیوں کو خاصی وسعت دیگئی ہے مگر سارے نظام میں صرف ایک نصب العین اب بھی کام کر رہا ہے وہ نصب العین کامیابی امتحان ہے۔ اس کے علاوہ نصاب ادبی نوعیت کا ہے جو جامعاتی تعلیم کے حصول میں طلبہ کا ممد ہونے کے بجائے خود ان طلبہ کے لئے ناکافی اور غیر مفید ہے جو درمیان ہی میں تعلیم کو خیرباد کہتے ہیں۔ لہذا نصاب ایسا ہو جو مضامین کے اعتبار سے مختلف النوع اور طلبہ کو مختلف مضامین اور فنون کا چسکا دے سکے۔ زراعتی تعلیم بجائے مدارس تحتانیہ کے مدارس وسطانیہ میں دیجائے اسی طرح فنی تعلیم کا انتظام بھی اضلاع کے مڈل اسکولوں میں ہونا چاہئے نہ کہ تحتانیہ میں غرضکہ جملہ طالب علم جن کا مقصد زندگی کچھ ہی کیوں نہ ہو سب پہلے عام تعلیم یعنی لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سیکھیں مگر بعد کے مدارج میں ایسا انتظام ہو کہ طلبہ مدارس صنعت و حرفت یا فنی تعلیم کے مدرسوں میں شریک ہوسکیں اور ان کے حاصل کرنے میں سہولتیں ہوں اکثر جامعات اور کالجوں میں بلحاظ تعلیم و تحقیقات و اکتشافات نمایاں ترقی ہوی ہے اور بعض میں اجتماعی زندگی کی عملی تعلیم پہلے کے مقابلہ میں بہتر ہے مگر یہ نظریہ کہ یونیورسٹی کا قیام اس لئے ہے کہ طلبہ کو امتحانات میں پاس کرائے اب بھی عام ہے۔ نیز طلبہ کی کثرت سے بعض مقامات پر کام میں خلل واقع ہو رہا ہے اور ایسے لڑکوں کا اجتماع موجود ہے جو جامعاتی تعلیم کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں اگر انہیں کسی دوسرے شعبہ کی تعلیم دیجاتی تو کامیاب رہتے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی جامعات، طلبہ میں رواداری اور وسعت نظر کی تربیت نیز ان کو مفید شہری بنانا اپنا مقصد خاص سمجھیں۔

تعلیمی امور میں گورنمنٹ کی بے توجہی افسوسناک ہے اور اس کو قومی خدمت سمجھتے ہوے ہم سفارش کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کی حیثیت ایک مرکزی "بیرو" کی ہونا چاہیے جو مختلف صوبوں کے علمی تجربوں کو مربوط کرنیکا ذریعہ ہو۔ گورنمنٹ کے فرایض اس سے بھی زیادہ ہیں۔ ہم اس نقطہ نظر کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ گورنمنٹ کو تعلیم عام کرنے کی ذمہ داری سے بالکلیہ سبکدوش کیا جائے۔

تنقیدیں

سالنامہ رہبر دکن مولوی سید احمد محی الدین صاحب کا مرتبہ ہے۔ موصوف آج کئی سال سے ہر سال فصلی کے آغاز میں انگریزی روزناموں کی طرح اعلیٰ پیمانہ پر سالنامہ نکال رہے ہیں۔ یہ سالنامہ ۱۳۳۹ ف کا ہے۔ بلحاظ اپنے ظاہری اور باطنی اوصاف کے اردو صحافت میں لاجواب ہے۔ اس میں جو مقالے شائع کئے گئے ہیں وہ مختلف علمی تعلیمی۔ ادبی عنوانوں پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ تحقیقی مقالوں میں "اردو کے حروف ہجا" اور "دیوان خاکی" قابل ذکر ہیں۔ تصاویر بھی کافی تعداد میں شائع کی گئی ہیں جن میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کا ایک کئی رنگی فوٹو، سلاطین آصفیہ قطب شاہیہ کی قلمی تصویریں اور قدیم ہندو مناد ر کے فوٹو، نظام ساگر کے دلچسپ مناظر سالنامہ کی شان کو دوبالا کر رہے ہیں۔

عظیم الدین بلاک ساز کی پیش کردہ تصویروں میں سے اگرچہ بعض غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں تاہم اس سے سالنامہ کی خوبی و سنجیدگی پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ غالباً اس کو بلاک ساز صاحب نے اشتہار کی نیت سے دیا ہوگا۔

سالنامہ بحیثیت مجموعی اچھا ہے۔ اس باب میں اس کے لائق مؤسس و مدیر قابل مبارکباد ہیں۔ کتابت و طباعت بھی بری نہیں۔ ضخامت (۱۰۰) صفحے ہے۔ پونیہ تقطیع قیمت عہ سید یوسف الدین صاحب منیجر رہبر دکن افضل گنج حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے۔

ایک جدید نمونہ کا کرہ ارض مشتاق احمد صاحب مدرس سررشتہ تعلیم سرکار عالی نے ایک جدید وضع کا گلوب تیار کیا ہے جس سے دن رات کا وقوع اُن کی درازی و کوتاہی اور انقطاع عالم کے اوقات وغیرہ آسانی سے تبلائے جاسکتے ہیں اس گلوب سے موجودہ کروں کی بہ نسبت جغرافیہ ریاضی کے اہم مسائل کی تفہیم نہایت خوبی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اگر ہمارے مدارس میں اس کا رواج ہو جائے تو یقین ہے کہ اس سے طلبہ کا بہت زیادہ فائدہ ہوگا اور ایک حد تک اس کے موجد و مخترع کی دل افزائی ہی نہ ہوگی بلکہ علی طور پر مدرسین میں آلات تعلیمی وغیرہ کے تیار کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱	۴	ضرورت	فوائد
۱۱	۱۸	اورکتب خانوں	تقاریر اورکتبخانوں
۱۲	۹	وہ	نہ وہ
۱۳	۴	وہ سینما اور طلسمی فانوس	تعلیم بالغان کیلئے لاسلکی سینما اور طلسمی فانوس
۱۴	۲۱	ددگار	مددگار
۱۵	۲۲	نوشت وخواند	نوشت وخوانداور
۱۶	۷	پنجاب	پنجاب میں
۱۶	۸	تقریر	تقرر
۲۰	۱۷	کو	طلبہ کو۔
۲۱	۶	ناخوانده	ناخوانده یا
۲۳	۸	دوسری	دوسرا
۲۴	۳	تم	تمام
۲۵	۲	اورلباڑدں	اورلباڑوں
۲۵	۹	دن بھر	دن بھرکی
۲۹	۶	تبلایا	تبلانا
۲۹	۶	اپنے کو	اپنے آپ کو
۳۰	۱۹	مرہٹواری	مرہٹواڑی اور
۳۱	۱۶	طلب	طلبہ
۳۵	۷	سکھتا	سیکھتا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۵	۸	اوریہاں	یہاں اور
۴۰	۲۰	ایرانی	ایرانی مان
۴۱	۸	بڑائی	بُرائی
۴۴	۹	ہوی	ہوتی
۴۴	۱۴	ہنیں	نہیں
۴۴	۲۳	بھی	بھی وہی
۴۴	۲۱	موقع	مقولہ
۴۵	۱	سوما	سورما
۴۵	۴	آمیری	آبری
۴۶	۴	اصلی	انہی
۴۶	۷	کارروانی	کاردانی
۴۶	۱۶	فطرت حرکات	فطری حرکات
۴۶	۱۸	بنیاد دینے	بنیاد رکھنے
۴۸	۸	صرف باتوں اور	صرف باتوں اورلین
			سے حاصل ہوتی ہے
۵۲	۷	حلیہ	صلہ
۵۴	۱۶	تعلیم	تعلیمی

ہم خرما و ہم ثواب

ملک میں علم و ادب کی خدمت اور ملک والوں کے فائدہ کے لئے ملک ہی کے مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر تجارتی کارروبار چلانے کی غرض سے انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ محدود کی بنیاد ڈالی گئی اور انجمن ہا امداد باہمی ملک سرکار عالی کے تحت رجسٹری ہو چکی ہے انجمن کے کاروبار تین شعبوں پر منقسم ہیں:۔

(۱) شعبۂ تجارت (۲) شعبۂ اشاعت (۳) شعبۂ طباعت۔ اس انجمن کو اتحادی طور پر کام کرتے ہوئے چوتھا سال ہے تین سال سے اپنے حصہ داروں کو سالانہ (۱۰) فیصدی نفع علاوہ زکوٰۃ کے تقسیم کر رہی ہے۔ انجمن کا مجوزہ سرمایہ ایک لاکھ روپیے کے (۱۰۰۰) حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک حصہ کی قیمت ایک سو روپیے ہیں اور ہر حصہ کی ادائی (۲۰) اقساط میں ہوگی اجرا شدہ سرمایہ (۵۰۰) حصص پچاس ہزار قیمت فروخت شدہ حصص تیس ہزار روپیہ شرکت فارم اور قواعد و ضوابط کیلئے نیچے کے پتہ پر درخواستیں آنی چاہئیں:۔

منتظم انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ محدود اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

رعایتی اعلان بتقریب سالگرہ مبارک اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی

سیرۃ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی الشیخ احمد سرہندی فاروقی قدس اسامی مقدس ہستی تعارف سے مستغنی ہے یہ کتاب آپکے سوانح زندگی مجددیت کمالات کیفیت مکتوبات کا صحیح اور مفصل مرقع ہے بزبان اردو قیمت ہے سکہ ۶ر

سیرت حضرت غوث اعظم رض یعنے محبوب سبحانی غوث صمدانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جامع اور مستند حالات بزبان اردو قیمت سعہ سکہ ۶ر

حکمت اسلامیہ تصنیف منیف حضرت محترم الحاج مولٰنا مولوی محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی القادری مدظلہ العالی صدر شعبہ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ (اس کتاب کی حالات زمانہ کے مدنظر سخت ضرورت ہے کہ ناواقف لوگ عام اسے خبردار ہو جائیں و جہل مرکب سے محفوظ رہیں اسمیں بڑے بڑے دقیق اور معرکۃ الآرا مسائل مختصر تقریر میں اس خوبی سے واضح ہوئے ہیں کہ گویا پہاڑ مٹھی میں آگیا اور دریا کوزہ میں بند ہوگیا ہے قیمت صرف ۱۰ر

پیغمبری دعائیں جن میں صحاح ستہ کے منتخب شدہ (جو حضور سرکار دوعالم نے اپنی زندگی میں زبان مبارک سے ارشاد فرمائیں۔ لکھائی چھپائی بہترین قیمت ۸ر

فن خطابت یعنے فن تقریر پر سب سے پہلی جامع اور مکمل کتاب (اچھا لکچرار بنا دیتی ہے قیمت ۸ر

قرآنی دعائیں یعنے ہر مراد کی کنجی ہر ایک مسلمان کو اپنی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے قیمت ۸ر

عملیات باقی حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی رض کے مستند اعمال اور ذی لعف اور جن کے عامل کیلئے کامیابی یقینی ہے قیمت ۸ر

سیرت باقی یعنے حضرت خواجہ باقی باللہ عرف خواجہ غریب النواز اویسی کے حالات زندگی اور مجرب اعمال و اشغال اور وظایف قیمت ۱۲ر

عطیات قدسی فی تفسیر و اعمال آیۃ الکرسی اعمال تفسیر آیۃ الکرسی کی مستند کتاب قیمت ۸ر

روح المعانی۔ یعنے تفسیر سورۂ فاتحہ لکھائی چھپائی بہترین قیمت ۸ر

درس معاشرت۔ اسم بامسمٰی (نومسلمان گھر کی صحیح حالت دکھائی گئی ہے قیمت ۸ر

اندلس کی شہزادی اور تائید غیبی۔ مصنفہ مولٰنا علامہ راشد الخیری صاحب مدظلہ العالی قیمت ۸ر

آہ مظلوم یعنے فسانہ سعید مصنفہ مصور غم علامہ راشد الخیری صاحب قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ سید عبدالقادر تاجر کتب و مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چارمینار حیدرآباد دکن

tions. In regard to the suggestion for commencing English earlier than in Standard III, he has advanced cogent arguments to prove that the step, if taken, would be retrograde. As reported already in the last issue of the *Hyderabad Teacher* the opinion of the Conference itself was divided on this question. We await the decision of the Committee of experts which the Director of Public Instruction has promised to appoint for considering the whole report.

The Direct method does not exclude translation and grammar. We believe it is the intention of the writer of the article to stress the need for translation and grammar in existing circumstances, where the Direct Method is employed under certain handicaps. When even in England there is a return to grammar, "Why not", he asks "in Indian Schools"? We should like to point out that the Committee has not overlooked the fact that grammar is often neglected and more frequently unsatisfactorily taught in our schools. We would refer the writer to the recommendations of the Sub-Committee on the teaching of translation and grammar.

The system of teaching English is really not so responsible for defective teaching as the teacher. Some of the teachers employed for teaching English are incapable of appreciating and working even a satisfactory system. Very often middle trained teachers are called upon to teach English in the primary classes. Small wonder then that the performance is disappointing. Therefore the Sub-Committee remark: "The teacher is the key to the position and unless there is an improvement here, we are moving in a vicious circle, and will get nowhere". It is not sufficient that the teacher should be a trained teacher, as the writer has shown quoting Madras; but he must be trained well, and the Sub-Committee have offered certain pertinent suggestions.

provinces in British India to maintain contact with one another on these matters.

We shall deal at some future date with the remaining portions of the Report dealing with the education of the Depressed Classes and other matters.

Sir William Barton.

We have published elsewhere the instructive address delivered by Sir William Barton, Resident at Hyderabad, on the occasion of the prize distribution of the Mahboob College. We are sorry that Sir Willam will shortly be leaving us. As we said in our issue of March 1927, Sir William takes a keen interest in education and has deep sympathies with the teaching profession. On more than one occasion he has given utterance to his ideas on the dignity of the teacher's occupation and pleaded for a better remuneration for his services. He has given practical proof of his interest in education by sanctioning liberal grants for the various schools in the Administered Area to enable them to improve their buildings, equipment and teaching staffs. He has also taken the initiative in supplying the long-felt need for a provident fund for teachers in aided schools. As a result of Sir William's sympathetic and liberal policy, education has made much progress in the Administered Area during his term of office. We are sure that the managers and teachers of schools in this area will long remember the valuable services rendered to the cause of education by Sir William Barton.

The Teaching of English.

Elsewhere appears under the above title an article containing certain observations on some of the recommendations made by the Sub-Committee on the Teaching of English to the Annual Confernce. The writer joins issue with the Sub-Committee on certain of their recommenda-

and commercial careers at the end of the middle stage. They also suggest that in the rural middle schools the curriculum should be adapted to rural requirements, while in other schools alternative courses should be provided preparatory to special instruction in technical and industrial schools. In view of the increasing unemployment among young men in India who have received a purely literary education and in view of the waste of energy involved in such boys receiving higher education as are not fit for it, it is to be hoped that early steps will be taken not only in British India, but also in our own State, to give effect to the above-mentioned proposals.

The questions which the Committee have raised in regard to university education also deserve serious attention. These questions are: "whether the recent expansion in the provision of university education has not made an educational system which was already top-heavy still more top-heavy; whether in the interests of university education itself and still more in the interests of the lower educational institutions which feed the universities and of the classes from which university students are drawn, the time has not come when all efforts should be concentrated on improving university work, on confining the university to its proper function of giving good advanced education to students who are fit to receive it, and, in fact, to making the university a more fruitful and less disappointing agency in the life of the community."

Finally, the Committee have suggested that the Government of India should serve as a centre of educational information for the whole of India and as a means of co-ordinating the educational experience of the different provinces. We hope that means will be found to include the Indian States in this useful scheme, for it is as necessary for the Indian States to be kept in touch with the experience and progress of other parts of India as it is for the different

Dealing with the curriculum of village primary schools, the Committee welcome the attempts which are being generally made in India to bring the courses of study and the methods of teaching into greater harmony with the needs and conditions of village schools. "The aim of every village school", says the Report, "should include not merely, the attainment of literacy but the larger objective, namely, the raising of the standard of village life in all its aspects". The Committee also recommend that "village teachers should be recruited from amongst persons who possess and are likely to retain a sympathetic understanding of rural conditions".

The importance of adult education as a means of removing illiteracy has not been sufficiently recognised in the Report. The example of the Punjab shows how quickly the percentage of literates can be increased by opening adult schools. Even if compulsory education is introduced immediately all over India, it will take at least half-a-century before India is freed from the reproach of widespread illiteracy. Government should therefore do its best not only to promote the education of boys and girls but also of illiterate adults.

With reference to the education of girls, while we agree with the Hartog Committee that "in the interests of the advance of Indian education as a whole, priority should now be given to the claims of girls' education in every scheme of expansion", we wish to point out that unfortunately owing to the lack of qualified women teachers, it is not possible at present to ensure that rapid progress in girls' education which the Report has in view.

The present system of secondary education in India has been rightly condemned by the Committee. As they have pointed out, this system is "still dominated by the ideal that every boy who enters a secondary school should prepare himself for the university". They recommend the retention in the middle schools of the boys intended for rural pursuits and the diversion of more boys to industrial

under compulsion. The Committee have laid down an important principle, the acceptance of which, in our opinion, is absolutely necessary for a speedy and widespread application of compulsion. This principle is that "the responsibility for mass education rests primarily with the State". But though the Hartog Committee fully recognise the need for compulsory education, they consider that financial difficulties do not make the immediate and universal application of compulsion possible. We are of opinion that the question of funds will not present the difficulty which it does at present if, as has been recommended by the Committee, the State takes upon itself the responsibility for primary education. Once the financial question is solved, not only will the introduction of compulsion be facilitated, but the danger of sacrifice of quality to quantity, which has led the Committee to propose that improvement should go in advance of expansion, will also be eliminated. Many of the defects pointed out by the Committee exist because the funds required for removing them are not available. These defects are unsuitable buildings, insufficient equipment, paucity of trained teachers, low salaries of teachers and inadequacy of the inspecting staff. There are two other defects to which the Committee have called special attention, *viz.* 'Wastage' and 'Stagnation'. The premature withdrawal of children from school cannot be stopped without compulsion, and therefore improvement in this respect cannot precede compulsion. As for stagnation, inasmuch as this evil is to be found chiefly in the lowest class of a primary school, the Committee recommends, in the first place, that the best teacher (and not the worst, as is the common practice in India) should be put in charge of this class, and secondly, that the school admission should be confined to a single month of the year. With the first recommendation every one will agree, but we fear that it will be difficult to carry out in practice the second recommendation, especially in regard to the Infant class.

Two other suggestions of a practical nature are offered: that universities should evolve on residential and tutorial lines: that they may play their part in the building of character; that Government should no longer insist on a university degree as a pass-port to service except for higher appointments, so that the pressure on colleges and universities may be relieved. The universities were exhorted to rouse and educate public opinion to realize the value of reform; else the reform will be short-lived.

It is hardly possible to convey in brief the meaning of a speech so pregnant with wise thought; it should be studied in full and it will well repay study as coming from so sincere and eminent a friend of India.

The Hartog Committee's Report.

One can scarcely overrate the importance and value of the report on the growth of education in India prepared by the Hartog Committee. Though they have dealt mainly with the educational problems of British India, many of their recommendations are equally applicable to Indian States, the social and economic conditions of which are not really very different from those of British India.

The most important problem which educationists and politicians alike have to face in India is the enormous volume of illiteracy in the country. The need for introducing compulsory education for removing illiteracy is now recognised everywhere in India. Nearly all the provinces have accepted the principle of compulsion, but owing to the inaction of the local bodies to whom the various legislative enactments have left the option of adopting compulsion, so far only 119 municipal and urban areas and 1571 District Board and rural areas in British India have been brought

of the land"? And for the solution of such problems, "there are few more important things in these days than universities".

Addressing himself to the function of a university, he says: "*The function of a university is to create and maintain standards*". First, the standard of learning and research which universities as the homes of scholarship owe it to themselves to preserve .... They must be human enough to fit into and join up with the various categories of man's activity". Secondly, the right standard of judgment "a knowledge of how much, for all his store of learning, there is yet for him to learn, and some instinctive sense of the mystery of the universe and the mystery of man's place in it. Nor need we fear that such breadth of mind and judgment as I should desire the universities to inculcate would result in a type of man halting in decision or uncertain of opinion. That is never likely to spring from foundations of thought and reflection securely laid. Rather, perhaps, will it teach a wide tolerance ....". "And third, the standard of conduct ....The time has come for him to put to the test the discipline he has learnt, and on his response to this demand will largely depend the success or otherwise with which he fills the position to which his education should entitle him".

These are inspiring ideals for a university to create and maintain. The speech also contains a polite criticism of the confusion that exists in many minds between the functions of a university and of educational institutions of a lower order, and in this connection he observes: "If a university must of necessity be concerned to prepare those it trains for work different in quality from that which falls to the bulk of the population, it follows that a university is bound to exercise selection not indeed on any class grounds but on grounds of ability and capacity to profit by its teaching, among those who may apply to be enrolled upon its books".

Khan, Director of Public Instruction and President of the Athletic Association, on the occasion of the final of the Shawcross Football Tournament, which was witnessed by nearly 5000 students on 23rd October, 1929. We have published in our Urdu section the full text of the instructive speech on the value of games which he delivered on the occasion. We hope that the students of the various schools in Hyderabad will take the Director of Public Instruction's advice to heart and that they will not only realise the importance of playing games but also of cultivating the spirit of true sportsmanship.

Editorial Notes.

The Viceroy's speech to the Inter-Universities Conference.

The grave issues of political and constitutional considerations on which His Excellency the Viceroy addressd the people of India after his return from India have tended to obscure from public attention the significant speech which he delivered at Delhi in opening the Inter-Universities Conference held in the last week of October. To the educationist and all those intereted in the problems of Indian education, the Viceroy's speech contains as inspiring a message as any. In his words: "Her (India's) problem is nothing less than the adaptation, without too violent jar or stress, of an ancient and organic structure of society to the dynamic forces of evolution that are driving the modern world. New forces are moving, letting loose new energies, kindling the imaginations and hopes of millions of the future citizens of India at their most impressionable age. Can this ardour of youth, this coursing of blood through the young veins of India, be utilised and and directed to constructive ends, or will it become an explosive force charged with incalculable danger to the future

young men from all parts of the Dominions, of whom 28 were teachers. Lectures were delivered on "Health, Efficiency and Happiness" by Mr. F. Weber, "Principles of of Scouting" by Professor Turner, "Citizenship" by Professor Hanmanth Rao and "Character Formation" and "Public Service" by Mr. Ali Akbar, Acting Director of Boy Scouts. Other features of the camp were a hike to Gundipet on foot, a vist to the Golconda Fort, a Fire Brigade demonstration organised by Mr. Rajwade and instruction in swimming, life saving and boxing by Mr. Weber. The Boy Scout Head-Quarters not only provided free boarding and lodging for all the campers, but also paid the travelling expenses of teachers from the district schools. The investiture ceremony, which was held on the last day of the Camp, was presided over by Mr. Khan Fazl Mohamed Khan, M. A., Director of Public Instruction. After distributing the badges, Mr. Khan Fazl Mohamed Khan made a neat little speech. He said that character was the most important thing in scouting. He thought that the fact that the members of the various patrols were cheerful in spite of the inconvenience caused to them by bad weather during the period of the camp was an indication of the efficient training which they had received. In the end, he expressed the hope that on returning to their respective schools the campers would start troops and endeavour to produce real scouts who would work in order to increase the happiness of this State.

The Scout Day.

The Scout Day was celebrated on the 4th October, 1929. The Acting Director of Boy Scouts as well as the permanent Director addressed the gathering. The former also read out the message sent by Mr. Khan Fazl Mohamed Khan, Director of Public Instruction, who could not attend the function owing to his absence from the station. The message ran as follows:—

To ALL SCOUTS Greetings and Good Wishes for the next year. Scouting is a world movement. The example set by each individual scout is the motive power behind it".

The camp fire which was held after the renewal of scout promise and award of warrants and charters was a great success.

H. E. H. the Nizam and the Princes Azam Jah and Moazum Jah witnessed the annual sports of the Nizam College on 4th October. Prince Azam Jah Bahadur gave away the prizes.

The Hyderabad Athletic Association.

We congratulate the Chaderghat High School on its carrying away this year trophies for all the inter-school foot-ball tournaments except that for Middle B. The Inter-Collegiate Football Tournament and the Inter-school Cricket Tournament were won by the Osmania College and Madrasae Aliya respectively. The prizes for the various events were distributed by Mr, Khan Fazl Mohamed

Again, "The ink of the scholar is more holy than the blood of the martyr." "Seek education even unto China."

Then, "A virtuous wife is a man's best treasure."

. And lastly, "Heaven lies at the feet of mothers." And thus she is enveloped in a spirit of Wisdom, devotion to duty and Love.

Ladies and Gentlemen, on behalf of the State of Hyderabad, I bring a message of goodwill and hearty co-operation with the work and interests of this Federation, and I trust I may take away with me inspirations and renewed stimulus to carry on the work of education entrusted to me in Hyderabad, with the hope that the educational and cultural gulf now existing between the men and women of that State may be bridged and that all over India men and women may work side by side for the uplifting of their country by the spread of education, since it is the only way by which a true understanding may be established between India and the outside world."

Mr. Zahoor Ali, B. A., B. T., and Mr. G. N. Chandararkar will represent the Hyderabad Teachers' Association at the 5th Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations to be held in Madras at the end of December 1929.

The Hyderabad Boy Scout Association.

Government have approved the nomination of the following gentlemen as members of the provisional Executive Committee:

Messrs. Khan Fazl Mohamed Khan (Chairman), Syed Mohamed Husain, P. F. Durand, S, M. Azam, Sajjad Mirza, Ali Akbar, Gopal Reddi and S. M. Hadi, (Secretary).

Mr. S. M. Hadi has returned from Europe and resumed the duties of Director of Boy Scouts. The Scout Masters' Association presented a Thanks Badge to Mr. Ali Akbar on the occasion of his handing over charge to the permanent Director. Mr. W. Turner presided over the meeting, which was attended by the scout-masters of nearly all the Balda troops. While expressing his appreciation of the honour done to him, Mr. Ali Akbar emphasised the need for co-operation in scouting—for co-operation between the members of each troop, between them and their scout-master, between the varicus scoutmasters and the Head-Quarters and between the organisation as a whole and the public. He also said that the work which had recently been done for co-ordinating the activities of the various troops was a healthy sign of development.

The 4th Scouter's Training Camp.

The 4th Hyderabad Scouters' Training Camp was held at the Golconda Tombs from 6th September to 15th September, 1929. The course of training, which was conducted mainly by Messrs. Ali Musi Raza and Varananasi, Assistant Directors of Boy Scouts, was attended by 33

seclusion of the women. To bridge that gulf and bring about the harmonious relationships which are indispensable in the building up of a true home, I felt it was necessary that the girls should become more companionable wives to their educated husbands, and the mothers, in whose hands was the entire training of both boys and girls till they reached school-going age, should be educationally more fitted to carry out the duties incumbent on them. But the time wasted by boys over the language question was doubly precious in the case of girls who are married at an earlier age than boys and it seemed that the desired educational level could only be reached if their vernacular were used as the first medium of instruction.

Finally, in accordance with proposals which I made for the opening of a College in conection with my school, the First Arts classes were started in 1924 and this College is today the only college in India for girls where Urdu is the first medium of instruction with English as the second compulsory language.

The difficulties in beginning such a college arose from the want of competent trained women teachers who were able to teach in Arabic, Persian and Urdu, for the observance of seclusion precluded the employment of men lecturers. I am glad to say that the Hyderabad Government have taken the first conscious step to overcome this difficulty by sending this year for the first time two Mohammadan girls of my College to study in Cambridge for three years. These girls will return to serve the State as teachers and as each year I trust more will be sent, in the course of time the crying need will be met for the education of Indian women by their own educated women. Who can be as competent as they are to understand the educational needs of their own sisters ?

We need as teachers women with the training of the West, with modern ideas of education and sound notions of hygienic reform to combat the long years of close confinement and unhealthy living, but at the same time we need women who belong to the soil, who love India because it is their country, who are proud to be Indians, women to whom the names of Shri Lakhsmi and Sita are not mere empty titles but whose very mention fills them with enthusiasm, women to whom the Himalayas stand as the symbol of Unity, power and lofty purpose, women imbued with eastern ideals to train the youth of their land.

And you women of the West are wondering, perhaps—what are some of the ideals of the eastern woman ? Let me quote to you a few of her household precepts. From her infancy she hears these words.

"Acquire knowledge; it enableth its possessor to distinguish right from wrong. It lighteth the way to Heaven, it is a friend in the desert, a companion when friendless; it is an ornament amongst friends and an armour against enemies."

communicated to you by the constituted authorities of this University, working under my guidance, you will make me a happy man, for I shall then know that the future of my community and therefore of my country will be a great one.

But if, God forbid, I find that I have to work alone and unaided in the task that I have set to myself, even then I shall not hesitate, but I shall then know that yet another source of happiness has been denied to me, and this time by the young men of my own community.

I have come to you without any personal prejudices and I look upon you all and shall continue to look upon you as the members of one family, my own family,—a family that will be second to none in the sincere love that binds it together.

With the help of God we are going to make it impossible for any one to speak of our University with that disrespect with which, alas! only too often during the last few years its name has been uttered throughout the length and breadth of our vast country. By following the highest ideals and by respecting others we shall compel the whole world to respect us.

Now before I conclude I want to tell you students that no one is more anxious than I am that whilst you are here you should have a happy time, and that in days to come when you will have left us you should be able to look back on your student life with the same pleasure with which I look back on mine. This you will be able to do only if you make up your mind to see that no rule laid down by those who are responsible for your physical and moral well-being is broken, and that the greater part of your time here is devoted to the pursuit of true knowledge for which purpose this University was created."

Hyderabad Representatives at the Geneva Conference: Miss Amina Pope's speech.

Miss Amina Pope, Principal of the Zenana Nampalli College, and Mr. S. M. Azam, Principal of the City College represented the Hyderabad State at the Conference of the World Federation of Teachers' Associations held at Geneva last August. We give below extracts from a speech made by Miss Amina Pope at the Conference:—

"The women of any country are the rightful gaurdians of their sacred traditions and this is especially true of the Indian women. Not being in touch with western ideas, whatever knowledge they possess is derived from the study of their religious books and the works of their vernacular prose and poetic writers. But their continued study of eastern thought and the education of the men along western lines had brought about disunity and disharmony of thought, that further emphasised and increased the educational and cultural gulf already existing between the two sexes, owing to the

judgment to such an extent that we can no longer distinguish that which is harmful from that which is beneficial. Had this not been my belief I would not have accepted the invitation of my community to come and take charge on its behalf of this University. This invitation came to me at a time when I was ill and suffering from much physical pain, and I assure you that had my faith in my community and in you—young men of my community—not been what it is, you would not have seen me here to-day.

I come to you full of hopes. I come to you filled with the most ardent desire to serve you to the best of my ability: and if I succeed with the help of God in being of some real service to you, at least one of my dreams will have been fulfilled.

These are days of struggle and competition, and only those will survive the strain that can put forth the most united effort. Let our University give to our harassed and only too divided country the great example of unity. Let us banish from at least within our walls all those frictions and petty hatreds which are doing such untold harm to the land of our birth, remembering that nothing that is durable can ever be erected on foundations of hate and intolerance.

In one sense a true University must be a small universe, and in another sense a mother with a heart big enough to love all those that come to her whether as students or as servants, irrespective of caste, creed or colour. If, God forbid, we fail to make the Muslim University such an abode of love and intellectual toleration, we shall have forfeited our right to live as self-respecting and honoured sons of India; and for this dire result we shall have only ourselves to blame.

It is my ambition to turn ourselves into the biggest, the most disciplined, the most educated and the most united army that my country possesses for fighting all those evils that have made India the laughing stock of the world, and this we can only do if we devote our energies to the fullest development of all those faculties with which God Almighty has endowed us. I want the students of this University to be the best young men in the whole world—best at work, best at games and best in courtesy and decency.

Remember that with me it is an article of faith that nothing that is second-rate should ever exist in an institution that has the name of Muslim attached to it; and I as your Vice-Chancellor tell you most solemnly that so long as I remain in your midst in the position to which my community has called me, I shall not tolerate anything, in whichever quarter it may exist, that I consider second-rate and therefore ugly and evil. In this matter alone I shall prove a bigot and the very worst of fanatics.

If you all share with me my ideals and as true soldiers with the fullest confidence in me carry out unflinchingly all that is

Notes and News.

——: o :——

We congratulate Dr. Nawab Masood Jung on his election as Vice-Chancellor of the Muslim University, Aligarh. We feel confident that under his able guidance the University will be raised to a high state of efficiency.

The New Vice-Chancellor of the Aligarh Muslim University.

The following are extracts from the eloquent speech which he delivered to the students and members of the staff of the Muslim University, Aligarh, on the 21st October 1929 on assuming charge of the Vice-Chancellorship of that University:—

"Standing as I do within a few yards of the tomb of the great founder of this institution, whose blood runs in my veins, and on the very spot from where he was accustomed to address those who, with implicit faith in him and in his wisdom, came here to be educated, it is impossible for me to describe to you adequately how the solemnity of this moment overwhelms me.

In coming to you I have only answered the call of my blood, and I have come not only to my own people, but also to the very environment in which I was myself nurtured. These buildings that surround us grew up with me. Almost the very first sounds that reached my ears when I came into this world were those of the masons busy building this great symbol of Muslim effort in the cause of education.

Thus, gentlemen, it is impossible for me to feel that you are strangers to me, and I trust and hope that it will be equally impossible for you also to feel that in me you have one who is a complete stranger to you. The dreams that you students are dreaming to-day are dreams that I too have dreamt, and like you I too have known that anguish of the soul which is the common heritage of youth in this world of ours.

Here let me tell you that I have always felt sorry for those who have denied to young men the right to dream, for such people have failed to understand the important part that dreams play in the process of achievement. Indeed this very institution is the result of the pious dream of a sincere man. Remember that a nation that sees no visions is a nation that has no imagination; and a nation that does nothing to make its visions a reality is a nation that is dead.

I refuse to believe, in spite of what is being said to-day and in spite of appearances, that my great community is dead. I refuse to believe that we, who have in us the blood of those who were makers of empires and givers of law to mankind, have lost our

the importance of the work of the teaching profession, he said that he was one of those who believed that teachers should be well paid. Sir William also emphasised the need for character building. He said, "There is a well-known epigram that education is what you have left when you have forgotten everything that you have been taught. This is only a half truth, still it enshrines the great principle, that development of character and conduct should be one of the main objects of education. Character is a thing which eludes definition. It is largely a question of outlook. You will have laid the foundations of it if you look on life as a great adventure: if you enter it with a high courage, in the spirit of old time chivalry: the spirit that helps you to control self: the spirit that inspires you to succour the weak, to fight against the social evils you see around you. If you begin the work of life with such ideals, you will achieve the kind of success best worth having, the esteem of your fellow men, whether you weigh out pounds of tea or make and unmake minstries". In conclusion, the Hon'ble the Resident exhorted the students to follow the example of those young men who after leaving the Mahboob College had found opportunities for social service and had made use of these opportunities. The Mahboob College, he hoped, would make a great contribution to the progress and unity of India.

---

men we require; and is it too much to expect this from the teachers of this school? I don't think so. Here, if anywhere, the conditions are favourable, for two great forces are working in conjunction; the high moral sense of the Church Mission and the practical sagacity of the British mind; and the result of their combined efforts should be such as I have indicated, provided good teachers are employed.

"But the essential condition is this; the good teacher must not be satisfied with imparting mere book knowledge to his pupils, neglecting the more important and far nobler duty of communicating to them out of his own heart all that is noblest and best in human conduct. The best teacher is he who is full of 'soul-force' as Mr. Gandhi would say, a sort of psychical magnetism—and will use it for this purpose.

The Mahboob College.

The annual prize distribution of the Mahboob College was held on the 12th October, 1929 under the distinguished presidentship of the Hon'ble Sir William Barton, Resident at Hyderabad. The opening ceremony of the Baboo Khan Memorial Block was also performed on the occasion. The school owes this block of new buildings mainly to the generosity of Mr. Abdul Kareem Baboo Khan, who gave a donation of Rs. 15,000 towards it. In his report on the progress of the school, Rao Bahadur C. V. Padma Rao, Secretary of the school, paid a fitting tribute to the Hon'ble the Resident for the liberal policy which he had followed towards education during the last three years and referred to the improvements effected in the various schools in the Administered Area during this period.

After giving away the prizes, Sir William Barton made an instructive speech. He congratulated the managers and teachers of the Mahboob College on the good progress which the school had made in various directions. Referring to

and unselfish, and his aspirations higher and nobler. Merely to pass an examination, in order to earn money, is not, and ought not to be, in our opinion, the direct object of education. It is important both for teachers and pupils to bear this in mind. There is another kind of instruction for enabling men to earn a living, namely, the vocational, for which adequate facilities have to be provided by the State and will be provided in due course. In fact, a scheme of technical instruction is before His Exalted Highness' Government now, and will probably be sanctioned before long by the Nizam, who fully realises the importance and need of it as a safety-valve.

"I am saying all this because I find that a false belief has taken hold of people's minds in this country regarding the object of education. They think of it only as a means of earning a livelihood, and the one object that attracts them is Government service, and a degree is believed to be a coin with which a post can be purchased! The teacher's duty is ever to be on the watch and to correct such notions in his pupil's minds whenever an opportunity occurs. I feel no hesitation in repeating what I am always saying, that the needs of the country demand a far different mentality and a more practical efficiency in its citizens.

"The conscientious teacher should therefore aim at turning out well-read and truly cultured strong men who will not be ashamed to work with their hands and whose delight it will be to raise themselves and their country to prosperity by industrial and commercial enterprise as the people of the West have done. We want practical men whose acquired learning and culture will be an accessory to enlightened endeavour and the surest means of keeping them on the path of honour and integrity in all their dealings, in whatever sphere of life they may be placed. We do not require helpless, machine-made academicians. Sound education given by good teachers will help us in getting the type of

In closing, Mr. Philip emphasised the truth enunciated by Mr. J. B. Stout, "Whatever we would have in our national life we must first put into our programme of education" and stated that the schools of India could well be the solvent for remedying some of India's present-day problems if this important but overlooked truth could be acted upon. St. George's Grammar School was doing what it could in that direction. "It is inspiring", he said, "to see boys of different nationalities all playing together on the football or cricket field under a captain elected irrespective of race, and all pulling together in the team work essential to a common end, and fills one with hope that somehow means may be found to continue that same "spirit of goodwill" which the League of Nations has emphasised as being the first essential in the solution of the race problem. To make our students "socially serviceable" and to give them some decent ideals of personal and civic righteousness is our aim; we can only hope that the efforts will bear fruit.

After presenting the prizes, Sir Nizamat Jung addressed the gathering. He remarked that the healthy signs of development which the school had shown in recent years were largely due to the personal attention paid by Mr. Philip to the minutest details of his responibility. Continuing, he said, "St George's Grammar School was the first institution of its kind in these Dominions nearly a hundred years ago and somewhat later it became a meeting place for young East and West. They met there and pretended to learn grammar, but they soon found that they could learn something better. They learned each other's ways, and each other's life, and the value of each other's friendship." He expressed the hope that Anglo-Indian boys would take as much advantage of the school as they had done in the past, so that the school might not lose its distinctive character. Dealing with the aims of education, he said, "True education has no other aim than to make a boy a good man at heart by making his heart purer, his feelings more refined

method' recognise now the value of translation in the higher stages of instruction". What we want to note here is that in advocating the Direct method it is incumbent on the authorities to purge it of the misconceptions attaching to it.

The recommendation of the Sub-Committee that teachers of English should be given more leisure periods for purposes of general reading and correcting exercises, deserves special consideration at the hands of the authorities concerned, as the English teacher is obliged to familiarise himself with a foreign tongue by a good deal of reading to make his work in the class-room effective.

School-Day Celebrations.

St. George's Grammar School.

St. George's School Prize Function was held on September 29th in the School Gymnasium, Sir Nizamat Jung, Kt., presiding.

After a display of drill and gymnastics which revealed something of the physical education imparted at the school, the Warden, the Rev. F. C. Philip, read the school report for the year. This being the 10th year since the coming of the C. M. S. Teachers to organise the school, a brief account of the improvements introduced during the past decade as regards building, equipment and staff was given. The science department and the department of oriental studies constituted a forward step on the academic side; the introduction of a Provident Fund was also a great advantage to teachers. First Aid courses had also been introduced and pupils had acquitted themselves very well in the public contests—the school team winning the St. John's Ambulance Shield given for the Residency areas. The Warden intimated certain projected extensions in the way of buildings, and an additional strengthening of the staff during the coming year to increase the efficiency of the school.

Considering that vernacularisation of studies is fast spreading in other provinces, we may rest assured that in a few years, we shall be on the same footing with the rest of India. In the light of these facts we are led to believe that we shall be able to achieve our aim better by starting English in Standard IV which will tend to a more intelligent and more intensive work to start with and by extending the Osmania High School course by one year which will bring the system in line with that prevailing in Madras and most other parts of India.

The next feature that requires some notice is the recommendation that teachers of special qualifications in English are needed for the earlier standards. The idea is, no doubt, very sound. But if we cast our eyes abroad, we shall find that even in that province where the percentage of trained teachers including specialists in secondary schools is as high as 76·7, there is widespread discontent with the system of English teaching, which goes to prove that there is something wrong with the system itself and even the specially trained teacher is a creature of the same system. The question before us then is how to rectify the system.

Let us then turn our attention to the Direct method which has been so much stressed by the Sub-Committee. One has to note that the Direct method as conceived and advocated in Indian schools is largely responsible for the fall in the standard of English and the Direct method readers have contributed their own share to the situation. The advocates of the Direct method generally condemn grammar and translation and some teachers who pose as strict followers of the method pride themselves on having given up grammar, while from the educated parents come repeated complaints of neglect of grammar. The place of grammar as a language factor is being realised in India as well as in the West, but without a clear notion of its nature and scope. The report of the recent Foreign Languages Committee in England says "Even the keenest devotees of the 'Direct

up the starting of English to a higher class. As regards the rest of India, English is commenced in Mysore in Standard IV. and in all North India and Bombay beyond the primary stage, the English course covering only seven years as in our State. The following lines from a contribution by Mr. Arthur Mayhew, I. E. S., being a summary of the recent investigations of the Foreign Languages Committee in England, will throw sufficient light on the question to enable us to follow the right course: "A late start in the learning of any second language is now advocated by most experts. Up to 11 or 12 years of age, pupils should acquire a firm grasp of their mother tongue and learn to think and express themselves clearly and precisely in that tongue. Foreign language teaching based on such foundation can proceed with greater certainty and speed than when the pupil's mind is undeveloped. This is a point that deserves careful consideration in India". We see, then, that expert western opinion and the general practice in India favour a later starting.

If we look into the actual English work done during the five years from Standard III to Form III, we shall find that it is miserably poor both in quality and in quantity, which will go to convince us that the period devoted to English is not inadequate and the admission by the Sub-Committee that "Faulty methods and inefficient teaching in the foundation stages were found to be the main cause of this weakness" confirms this truth and renders the recommendation superfluous. Further, the proposed change will prove a serious handicap to Hindu children who will have to grapple with three languages at a very tender age Perhaps it may be argued in support of the recommendation that some Indian children may be found with a sound knowledge of English even at seven or eight But it must be noted that it is a case of the conjunction of special innate talents with specially favourable environments, and that we are concerned with average abilities with poor environments.

6. Carpentry. It provides a fairly competitive market but has ample scope for skilled hands.

7. Tailoring.
8. Taxidermy.
9. Book-binding.
10. Weaving.
11. Rugmaking.

A vocational school in Hyderabad may prove to be a mere speculation and teachers who are alive to the needs of the time may do well to pioneer in their own way. It becomes incumbent on the government to move in the matter only when an appreciable amount of willingness and enthusiasm has been evinced by the people. Teachers who are anxious to start on Poultry, Goat-keeping and Vegetable-gardening may apply to the writer for suggestions.

The Teaching of English

BY

K. NARAYANA RAO, B. A., L. T.,

Assistant, Government High School, Medak.

As one interested in the problems of English teaching, I feel bound to make a few observations on some of the recommendations submitted by the English Sub-Committee to the Hyderabad Teachers' Conference held in July last. The first recommendation on the list is that English should be commenced earlier in the school course. Before accepting the recommendation at its face value, we have to examine how far the measure is justified by local needs and by precedents abroad and also how far it can stand the test of educational principles. English is started in our State in Standard III, and so it is in Madras. But of late the idea is gaining ground in Madras that "English must be commenced only when a pupil has gained a tolerable mastery over his mother tongue" and there are suggestions to push

Vocations. This list is in no way exhaustive but may need to be supplemented. It is based more or less on local market experience and careful investigation.

1. *Dairy Farming.* Dairy products will always find a market. Supply of purer milk at a cheap rate presents a vast field for both small and large-scale industries. Greater production or even over-production is welcome in order to lower the present high price of milk Comparatively the Indian price is higher than the European.

2. *Live-stock raising.* Goat-keeping and sheep-breeding may be found amply remunerative. Milk-breed goats will solve the problem of hygienic milk for the babies. Unlike cows and buffaloes, goats are free from tuberculosis, while their milk is identical with mother's milk when 5% sugar is added to it. See the Punjab Enquiry Committee's report on the economic value of goats. This breed will solve the question of cheap maintenance and provide us with, what Captain Flanders of Bombay calls, 'the poor man's cow'. The meat breed will find a ready market. Sheep will provide both wool and meat as the market may demand.

3. *Poultry-keeping.* Its industrial value has been amply proved in the West. Poultry products in the United States come well over the wheat crop in value every year. A large-scale co-operative poultry organisation can work wonderfully, as is being successfully tried in the United Provinces.

4. *Vegetable Gardening.* Probably intensive vegetable gardening is more paying than big-crop raising. A very interesting world-survey of farming, especially vegetable farming, appeared in the "Young India," the official organ of the Y. M. C. A., and may be found a helpful reference.

5. *Fruit-culture.* Experts approached on the subject declared that certain parts of Hyderabad were admirably suited for fruit-growing.

tunities and who can therefore help the boys to right placement. To further these objectives, an Advisory Committee of successful business and professional men will be of invaluable help to the director. These men will not only be able to give the fruit of their market-experience but may also employ skilled workmen in their own large concerns. The instructors of the school are to be picked as much for their professional skill as for their educational interest. Such interest in the teachers may be found to be a distant virtue and the director, therefore, should be careful enough to get full work-value for the hire.

Eligibility. In deciding eligibility to the school the condidate's aptitude for a particular vocation should be the primary test. Some definite proof of such an aptitude should be available. Family occupations are not to be overlooked. A farmer's son, for example, can more easily utilise his training on his family holdings. A certain standard of school education should again be insisted on as rudiments of banking, accountancy, correspondence and salesmanship, so necessary to the trader, cannot be taught otherwise.

Finance. While the common practice is to levy fees for the boys, a greater purpose can be served by letting them earn their own expenses. The boy's initiative can be more readily roused by turning him to early wage-earning than by putting him to a mere grind of work. This will indirectly ensure the efficiency of the school itself, in that its work has to be kept up to the market standard.

Post-training care. Finished students of the school will drift unless the question of placement is considered in its entirely. This can be avoided in two ways. A larger number of boys should be admitted on the express understanding that their parents will be able to furnish them with the initial outlay to start their own enterprises. Another way is to establish a Co-operative Fund which will advance loans to such students on reliable guarantees.

Vocational School: A Prospectus

BY

N. SHAW, B. A.,

Assistant, Methodist Boys' High School.

THE need for vocational education is now universally recognised. This article, instead of going over old ground, attempts to present a plan for a vocational school to suit local conditions. The data for many of the inferences may prove wrong, as investigations in this line are comparatively recent and much remains to be learnt by experiment and practice. A good deal of groundwork in the way of study and further investigation must, however, be done, before the public or the government can be led to any actual committment.

The School. Opening a 'playshop' in the ordinary school to create what is called the vocational bias is probably going halfway. The playshop in the school may create the intended bias but can never be a clearing-house for finisned products. An avowed vocational school, therefore, is a necessity, where boys will be equipped to a professional standard and will thus have greater confidence in making a start on their own account. Again, the vocational school can exist only on the needs of the community. Any fanciful occupation may find a slack market, while a one-sided production may result in overcrowding. The great number of commercial schools in Calcutta, Bombay and Madras have a larger out-put than the market demands. The result is a glut of short-hand typists. The success of the vocational school will depend very greatly on establishing a 'local contact,' so that the school may not only be a workshop but a safe clearing-house.

The Management. The head of the school should be a specialist who will not only act as a skilled work supervisor but will fully understand labour and industrial oppor-

is impossible to say how we should have fared had we not had the invaluable help of our Assistant Director, Mr. V. S. Varanasi, who came specially from Scout Head-quarters in Hyderabad, to share our camp with us and to help us with his presence and counsel. He proved himself a real expert in the deep waters of the villager's mind, and piloted many a floundering villager out of his difficulties to a firmer footing.

The most promising result of all our efforts remains still to be reported. We have left behind us in Sarjana a group of village youths, ranging in age from 14 to 30, representing three religions and five different castes, but united in a common loyalty to the scout ideal and bound together by a common enthusiasm for the service of others. They had been gathered together before we arrived by an old Medak Rover who took part in last year's Village Service Camps. They had formed themselves into an unofficial troop and had already started a campaign of social service. With the zeal of the uninitiated they begun by tackling the most difficult job first. They initiated a campaign against the open, insanitary drains which are a common feature of village streets. We were amazed at what they had acomplished. Within a few weeks they had completely changed one street from a festering cess-pool into a clean open thoroughfare with all the drains underground. In the evenings they had been meeting as a sort of self-improvement society, seeking to equip themselves for better and more effective service. They had created a conscience, such as exists in few places, against the evils of dirt, ignorance and indifference. They co-operated with us in all our activities and gave ample evidence that they are capable of carrying on the work we began. We went to Sarjana partly to encourage them in their efforts, but we left encouraged ourselves by the vision of the possibilities we had seen in them,—the hope of a new India, united in mutual service for the common good.

and he is willing to sit for hours listening—as these villagers did to us - with intense interest to a story represented in dramatic form. By such means we tried to teach the value of temperance and social righteousness. The reward of faithfulness and purity was set forth in the story of Joseph; and the nemesis of injustice and oppression in the story of Naboth and his Vineyard. The lively responses of the audience again and again gave evidence that the lessons were needed and that the moral had gone home.

We had our adventures and difficulties to encounter and overcome. Our very first bath tested our Scout-worthiness to its utmost. One of our strongest swimmers, after serving his turn as a swimming guard, swam out far beyond the rest and got entangled in the weeds on the far side of the village "tank". He exhausted all his strength in freeing himself from the weeds and there were still a hundred and fifty yards between him and dry land. Most of us were already tired and none were experts in the art of rescuing. It was only by co-operation and determined sticking at it that we were able to bring him back and land him safely ashore.

Once we launched out into our campaign we found the need of similar determination and co-operation in dealing with the entanglements which we discovered in the minds of the villagers. All sorts of questionings, prejudices and false ideas about our aims and activities were lurking under the surface. Were we trying to take away their age-long right to manage their village as they pleased, to undermine their ancient loyalties or usurp the authority vested in their acknowledged leaders? Was there some insult implied in the attention we were paying to them?- surely there were other places and villages equally dirty! Were we trying to break down their caste principles, turning them all into scavengers by asking them to undertake such low-caste work as cleaning dirty streets? To deal with such problems was a real test of resourcefulness, cheerfulness and patience. It

been held in the village of Sarjana, about six miles distant from Medak. All the Medak Troops were represented, Scouts and Rovers, Hindus and Mohammadans from the Government High School as well as Christians from the Mission Schools. It meant real comradeship in service, in which all took a full and equal part.

Our actual programme included the draining and repairing of a public road, the only entrance to the village, which is surrounded on all other sides by rice fields and a winding river. When we arrived it was a sea of sticky mud, but before we left the dry land appeared and many a humble farmer and cart-man stopped to tell us of the lasting benefit we had thus conferred upon them. We also drained and cleaned up a filthy patch of mud and refuse in the place where you would have expected to find the village green. The benefit of this was perhaps not so much apparent, but we hope that later it will be seen in fewer mosquitos and healthier babies. Assisted by the ladies of the Medak Hospital Staff we tried to meet immediate physical needs by dispensing medicines and good advice. We also showed lantern pictures which taught the cause and cure of many of their village ills. We had the assistance of the Medak Secretary of the Government Co-operative Banking Association, who spent a profitable hour explaining to the village worthies the great advantages to be derived from full use of their membership in that Society. Yet another visitor to the camp entranced his audience for the space of nearly two hours while he described the benefits of such enlightment as the presence of a village library and reading-room would make available.

By far the most popular part of our campaign was our effort to entertain and instruct the villagers at night with the aid of music and drama. Our audience on the last night must have numbered at least one thousand and included representatives of several surrounding villages. The humblest villager of our Telugu country has music in his blood

Camping with A Purpose.

BY

REV. F. WHITTAKER, M. A. (CANTAB).

District Scout Commissioner, Medak.

SCOUTING has played an important part, for many years past, in character-building at Medak. Its main purpose as training for service has never been forgotten. Two medals of Merit and twelve certificates of Merit have been awarded by the Chief Scout to our Medak Scouts and there are many other unrecognised deeds of service, which involved real courage and self-sacrifice, of which we are equally proud.

But for the most part the opportunities for such service came unsought. The need arose and Scouts had learned to "be prepared". In recent years, however, we have extended our ideas of the meaning of Scout service and its possibilities. We have discovered that it is not enough to sit and wait for the need to arise in our path; we are learning to go out on quest, seeking and finding ways of service.

To Mr. Bennett belongs the credit of blazing a new trail in applying Scouting to the service of others. Last year the Medak Scouts held two camps—as camps have often been held before. But these camps were different. They were camps with a purpose. They combined all the delightful freedom of camp-life with real usefulness to the villages near which the camps were situated. Scouting knowledge was given every concrete application in draining roads, cleaning up village streets and in many other efforts, to remove the physical, mental and spiritual evils of village life.

Whatever may have been the benefit to the villagers, these efforts have borne real fruit in the lives of the Scouts who took part in them. Th y proved to them the need and value of such social service, and consequently there was no lack of volunteers for a similar campaign which has just

they were working up Adult Education. I also obtained from them the promise of assistance in the selection of suitable films for the Magic lantern and the Cinema, and I would recommend that Adult Education, and especially Adult Education for women, be made a special feature in our departmental work. Thus not only will we help to bring colour into colourless lives, and substitute wholesome social intercourse for drab existence, but by educating the mothers, facilitate in no small measure in opening the way for extending the education of the future generation.

My report will show what a great incentive the conference must have proved in this very necessary line of work and what an intellectual treat must have been provided by it along entirely novel lines.

Nor was the social side neglected. Besides the reception on Thursday evening the 22nd and the daily opportunities afforded for individual intercourse, there were visits to several Colleges and an excursion to Ely. On Friday the 23rd, we attended a garden party at Sidney Sussex College, and were the guests of the Deputy Vice-Chancellor and Mrs. Weekes who entertained us on behalf of the University and a very enjoyable afternoon was spent.

On Monday 26th August the Dean of Norwich gave a lecture on Cambridge illustrated by magic lantern slides.

Before the close of the conference a group photograph was taken of all those who participated in it. On Thursday the 29th was held the concluding session, when we bade farewell to one another, and felt that a new link had been forged in the uplift of humanity.

illiteracy in India, since children would have to be brought to school, and that even if there were parts in which the people were less opposed to education, it was impossible to do much because of the dearth of qualified teachers.

Though at the time of attending the meeting, nothing was further from my thoughts than a speech, I felt I owed it to India and to Hyderabad to protest against this view of the Indian attitude to education, and to show how we in Hyderabad were overcoming the difficulty of securing properly qualified teachers for our schools. I pointed out that it was the duty of every State to provide education for its people, not only from utilitarian considerations, but also because it served to enrich life, and that India far from being opposed to education was clamouring for it. Then I mapped out the plan we had adopted in Hyderabad for the supply of qualified teachers.

I stated that our benign Government, bearing in mind that good work cannot in justice be expected from ill nourished workers, had ruled that the minimum living wage should be Rs. 30 a month, and that these teachers drew their full salaries while under going training.

I am glad to state that my speech made an impression on my hearers, and that after the meeting several came up to me and talked over the conditions in Hyderabad. Among them was Mr. Statham, delegate from the Government of India, who introduced himself to me and dicussed the conditions prevailing in North India.

We worked at the meetings even on Sunday, so great was our zeal, and what I consider most valuable was the interval to discuss problems that presented themselves. I made a special point of meeting woman workers from Holland, Poland, and Czecho-slavokia, and other more or less backward areas, the conditions in which were more akin to those prevailing in India, and discussing with them, through the medium of French, the various steps by which

(3) Adult Education and the Industrial Worker.

(4) The relation of humanistic to technical instruction.

(5) The problems of World Co-operation: the function of the world association.

The Sectional meetings dealt with.

(1) Methods of Instruction.

(2) Rural Education.

(3) Women's Problems.

(4) Settlements and Educational work.

(5) Adult Education and the Industrial worker continued from the general sessions.

(6) Residential institutions and Adult Education.

The group meetings dealt with

(1) Production of Special text books.

(2) Libraries and Adult Education.

(3) The place of radio in Adult Education.

(4) The education of sea farers.

(5) University extension.

(6) Parental Education.

(7) The abolition of illiteracy.

Besides attending all the general sessions, I selected "Women's Problems" and "Adult Education and the Industrial workers" from the sectional meetings and "the place of radio in Adult Education", together with "the abolition of illiteracy" from the group meetings. It was not possible to attend more than 2 meetings out of each Section.

The group in connection with the "abolition of illiteracy" was presided over by Mr. Strickland.

During the course of his presidential address, Mr. Strickland stated that it was well nigh impossible to abolish

In an adjoining room, copies of works bearing on Adult Education were shown, and opportunities were provided for a more than cursory glance at these. I have brought away with me the names of several that I consider suitable.

The proceedings began with an official reception by the Deputy Vice-Chancellor of the University (the Master of Sidney) on Thursday the 22nd August at 8-30 p. m. The chair was taken by Dr. Albert Mansbridge. Among those present were the President of the Board of Education, the Deputy Vice-Chancellor of the University and the Mayor.

After the Presidential address, the Mayor welcomed the delegates in the name of the town, and the Right Honourable Sir Charles Trevelyan Bart, President of the Board of Education, welcomed them in the name of His Majesty's Government. Then messages of welcome were read from the Prime Minister, the Archbishop of Canterbury, the Viceroy of India, the Secretary of State for the Dominions, the Right Honourable Lord Eustance Percy M. P. the Right Honourable H. A. L. Fisher M. P. and the Right Honourable Walter Runciman.

A vote of thanks to the speakers was proposed on behalf of the delegates by the President and seconded by Herr C. Hegermann-Lindencrone, and the proceedings of the evening terminated.

The programme consisted of general sessions, sectional meetings and group meetings. All were expected to attend the general sessions, but selection could be made of any one of the various "Section Meetings" and group meetings which were going on at the same time.

The General Sessions dealt with

(1) The Principles and Problems of Adult Education.

(2) Extensive (Popular) and intensive Adult Education.

World Conference on Adult Education
Cambridge, August 22nd—29, 1929.

BY

MRS. M. ENGLER, M. A., L. T.,
Chief Inspectress of Girls Schools, H. E. H. the Nizam's Dominions.

(The following report has been sent to us by the Director of Public Instruction, and we have pleasure in publishing it *in toto* Editor.)

THE 1st world Conference on Adult Education was held at Cambridge from August 22nd to 29th inclusive, and it was my great good fortune to attend it.

The idea and plan of the Conference was to bring together men and woman who are taking part in the development of Adult Education throughout the world," for the purpose of explaining and discussing the operation of basic principles in the light of knowledge gained from actual work and experience." Complete freedom of expression was allowed, even of opposing views, in the hope that the movement may receive both inspiration and guidance.

The University of Cambridge kindly provided accommodation for the Conference Sessions in the Examination Hall and Arts School. An invitation was extended to the Government of various countries to send representatives to attend the Conference, and with the exception of Italy, all the principal countries of Europe were offically represented, as were all parts of the British Empire. Delegates also attended from Egypt, Siam, Mexico and Persia, and from 15 of the States of America.

A fee of £ 2 was paid for admission to Conference and accommodation was provided for in Trinity College, and in lodging houses outside the College, as well as in hotels. The delegates were given small discs on which they had to enter their names and the work they represented.

The language used at the Conference was mainly English, though occasionally speeches were given in French and German.

Five—Physical education shall provide activities which satisfy the instinctive tendencies (natural impulses necessary for the preservation of the individual and society) of the growing child, the instincts which Nature has given the individual that normal growth of human powers may result, the instincts favourable to the progress of society and the race.

Six—Physical education shall aim to make its complete contribution to the education of the child for full participation in worthy citizenship.

Seven—Physical education must provide such a programme of satisfying activities for the child that by the fact of his responding as he does there will be valuable social results.

Eight—Physical education activities shall be so presented to the child that a superior type of thinking takes place.

Nine—Physical education shall develop habits and attitudes of good sportsmanship, good bearing and positive health.

Ten—Physical education shall make service for others so satisfying that it becomes a habit in childhood and grows into fullest expression in adult life. To this end the individual shall be encouraged to work for the good of the group and in this way come to realise that the fullest self-expression and highest satisfaction result from social service.

---

5. Playing team work.
6. Keeping training rules.
7. Obeying orders of the captain.
8. Doing one's best in all school work, (neglect of school studies is not consistent with true sportsmanship).
9. Giving opponents a square and honest deal.
10. Congratulating the victorious opponent and being modest and considerate toward the vanquished opponent.
11. Showing respect to the officials at all times.
12. Being true to one's highest ideals.

Good sportsmanship, as outlined above, is a ready product of morale.

The New Decalogue of Physical Education: Modified and Curtailed.

One—Physical education theory and practice shall not be static, but shall conform to the changed conditions of the time and place to bring the largest results.

Two—The physical education in any given country shall be appropriate to the nature of the people and planned to meet their racial, national, local and individual needs.

Three—Physical education shall be constantly tested by scientific knowledge and principles of education and medical practice, and unsuitable forms shall be discarded.

Four—Physical education shall consider the child as a unified whole of mental, social, moral and physical qualities, and shall provide for the development of all these through the activities furnished.

We know that no individual or nation can get on without morale; and those who have most of it live most, highest, best. The dictionary definition of morale is, "A state of mind with reference to confidence, courage, etc." But essentally morale is vitality, and vitality is health. It means wholeness or holiness, the flower of every kind of hygiene. Every man, every boy, every nation that is a winner has a high state of morale. The man or boy who faces his school examinations in a high state of morale need have little fear of failure. It means more than muscular energy. It means as well, nervous vigour. When the body is at its best—in its highest state of health—the mind is at its best. Morale is present wherever life is getting its best fill. In an athletic team, morale is the preparatory training which each individual member of the team undergoes conscientiously and willingly, and in the crisis, it is struggling with abandon, throwing everything he has into the game up to the last moment for the sake of the team. It is perpetual and general preparedness to act more efficiently in every emergency as it presents itself, where often to deliberate means to lose an occasion. It not only faces opportunities as they come but sallies forth to meet and even to make them. No person with flabby muscles, sluggish blood circulation, dull eye, torpid brain can be in a state of morale. Morale's first and fundamental edict is, "Get and Keep Physically Fit."

Sportsmanship.

A natural outcome of sound morale is good sportsmanship. The essence of sportsmanship is as follows:—

1. Playing fair at all times.
2. Playing hard to the very end of the game no matter what the score is, for or against one's team.
3. Keeping oneself in control.
4. Playing for the joy of playing.

tructive suggestions which may help to stimulate the pupils toward desiring and working for improved posture.

School Furniture.

One of the most important factors in the pupil's posture is that of the school seats. The back of the seat should conform to the contour of the normal back of the pupil. The front of the seat itself should be raised several inches higher than the back of seat. The whole seat should be adjustable so that it should be made to fit the length of the leg of the pupil, for no pupil should have to sit on a seat from which the feet could not reach to the floor. Both feet should rest flat and comfortably on the floor. The desk itself should have an incline toward the pupil. This incline helps not only his posture but also his eyes by relieving strain.

Morale.

The values that come to one as a result of taking part in wholesome physical exercises and activities go far beyond the limits of the physical body. Perhaps of equal importance are the assets and qualities developed in the whole life of the individual and the group. We believe the whole of the individual and society profit, and society as a whole believes so. The existence of the modern Olympic Games is witness to this fact. A list of qualities which result from the playing of games alone would be divided up under at least four different heads, *viz:*

Physical Qualities — body control, muscular strength, speed and endurance, vitality, resistance to disease.

Social Qualities — Co-operation, courage, loyalty, sportsmanship and leadership.

Moral Qualities — Initiative, originality, response to commands, and ability to form quick and accurate judgments.

Emotional Qualities — Enthusiasm, proper direction of excitement, control of temper.

direction of the feet will be adversely affected; the hips will assume a strained inclination and the hip joints will be affected; pains are apt to be present in the lower back. Many a thought-to-be serious lumbago case has been rectified by the simple process of acquiring a better postural habit among adults. The body in this position necessarily brings the chest into a lowered and cramped condition, the lungs are much less expanded than normal, and the abdominal organs are forced downward and forward. The stomach and liver cannot work rightly and with the general congested condition prevailing nutrition must suffer.

A few simple posture rules or suggestions may not be out of place at this juncture:—

1. Stand Tall.
2. Head Up, Chin In.
3. Chest High.
4. Abdomen Flat.
5. Toes straight to the front, Weight on Balls of Feet.

Be careful not to overcorrect the chest in bringing it too far forward. If you do so you will have the shoulders carried too far back and increase the hollow in the lower back, causing the body weight to fall on the heels. The chest should therefore be lifted and not brought forward. Always consider the whole body when correcting any one part. Departure from the normal poise brings abnormal strain.

"An erect posture, whether standing or sitting, deep breathing and exercises to improve the tone of the abdominal muscles will prevent much ill health". "Among the healthiest and happiest of men and women are those possessing erect carriages".

In teaching posture, make use of posture charts, posture maxims, posture ideals, and whatever other cons-

self in a legitimate, directed, healthful manner. Discipline, as well as posture and health, is improved.

These sets of exercises are never longer than one minute duration. The exercises are selected and arranged with the view to giving the greatest results in the shortest possible time, and aim for their effects at the trunk (shoulders, spine, abdomen, chest), head and feet. They are performed in the class room, beside the desks with the pupil in standing position. The leader, teacher or some selected pupil who does the exercises well, stands before the class and performs from where all pupils can see. Care must be taken on the leader's part to execute the movements correctly. He should inject enthusiasm and some humour into his leadership.

One could hardly overemphasise the need for development of the trunk muscles of the boy or girl in school. These are the muscles which suffer worst from lack of exercise yet require exercise most. Modern school conditions rob the child of its inherent desire for a natural development. The development which is stunted first is that which is most needed for good posture and sound health—the development of the trunk. The muscles of the abdomen, basic for good posture, and the upper back muscles, superarch of the structure, these are the first to suffer in the school child. Rounded shoulders and flabby abdominal walls are often associated with serious nervous disorders. The stomach and other abdominal organs suffer under cramping from undue pressure, resulting in dyspepsia, constipation and a train of ills. The ill effects of faulty posture are seen to reach the pelvic organs by the fact of the great downward pressure exerted at this place—the basement of the abdomen. The normal relations of the organs are disturbed and the proper circulation of the blood is prevented by faulty habits of walking, standing and sitting.

If the shoulders are so drooped that they drag forward and downward, the whole body suffers. The arches and

2. Development of the muscles and nerves for working together effectively and smoothly.

3. Development of social and moral qualities through such natural (instinctive) activities as play and recreation. Character training.

Posture.

The simplest definition of good posture is correct poise and control of the body so that every organ, nerve and vessel can do their work to the best of their ability.

The necessity of correct posture is so obvious and so accepted universally that it should be unnecessary to emphasise its importance for purposes of health and general well-being. Posture involves the position of the feet, of the trunk and of the head, the feet particularly in standing and walking, the trunk and head in sitting.

Posture as applied to the class room. Good posture should be constantly sought from the pupils, but the important point for the teacher to remember is not to call the attention of the pupil repeatedly to his bad posture. Rather would it be better to have the pupil do some constructive posture exercises, at the same time reminding him that the exercises would improve his posture. But as every growing boy or girl can well do with some posture exercises, it were better to have the whole class engage in a simple, sensible set of a few such exercises together. Such sets, affecting particularly the postural muscles of the body, have been arranged, experimented with and found to have produced the most beneficial results. In some cases these exercises have been gone through at the commencement of the class period. But in most cases they have been gone through half way through the period. The latter has proved in most places to be of more benefit. The exercises given at this time do more than improve the posture of the pupils. They rouse the child who has become torpid and they steady the child who is likely to burst out with energy to express him-

The Seven Cardinal Principles of Secondary Education.

According to Bulletin No. 35, United States Bureau of Education, the seven cardinal principles of secondary education are as follows :—

1. Health.
2. Worthy Home membership.
3. Character development.
4. Vocational training.
5. Citizenship training.
6. The Religious life.
7. The Constructive use of Leisure.

The framers of this set of principles gave the first place to Health, because they recognised that this was the foundation of the other six principles.

Health Education and Physical Education.

I have been asked to make a distinction between health education and physical education. In point of method, there is a real difference. In point of aim, both are set on bringing the individual and the group to the highest standard of well-being and usefulness possible. In point of method, the following outline will serve to show the difference.

Health Education deals with :

1. Cleanliness of the school and environs, ventilation, light, etc., of the class room. This subsection is known as Health Supervision.
2. Health exminations, protection against diseases, first aid service in the school, etc. This subsection is called Health Service.
3. Teaching of physiology, personal hygiene, sanitation, etc. This is called Health Instruction.

Physical Education deals with :

1. Improvement of the vital organs-heart, lungs, liver, kidneys, stomach, etc.

representations of all such stories that children love to hear. There will be exhibits to show scientific and healthful methods of feeding, dressing and caring of children. Its nursery will be full of toys of all kinds. The general atmosphere of this Children's Palace will create and develop aesthetic feelings. It will be in charge of a person possessing all the qualifications required of the kindergartner. She will study children and devise instrumentalities suitable to their aptitudes and in consonance with their characteristics; and like the banyan tree, this kindergarten will spread from Hyderabad to cover the length and breadth of the whole country.

Physical Education

BY

F. WEBER, M. A., B. P. E.,[1]

Director of Physical Education for Colleges, Hyderabad Deccan.

"He who can, does; he who cannot, teaches".

This is the remark of a contemporary philosopher.

Whether our philosopher intended this remark to be funny or disparaging does not matter. We know that teaching is one of the noblest of services to humankind. You men and women in this Conference would do well to remember what an earlier philosopher and sage said, "You can do greater good to humanity than to teach a child truths and facts about the world in which it lives."

1. A paper read at the Third Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association held in July, 1929.

and the intrigues of the household have for centuries combined to give her that training in practical psychology which no training college can ever aspire to give.

The need for a Model Kindergarten. To my mind, the real test of civilisation is the position of infant education in society If one surveys the civilised nations of the world, one will find that the education of the children is the first charge on the state. Only those nations are foremost whose system of infant education is excellent. But it is an irony of fate that in our own country, which is struggling to attain manhood, infant edcuation is in abeyance. Undue emphasis is laid on higher education, universities after universities are springing up in various places, but no attention is paid to infant education, the real foundation, without which the structure of the university can never stand. The multiplication of children like rabbits and their death like rats has added further importance to their early training. At present, India needs Kindergartens, not Universities.

Our time honoured State has already given a lead to India in the matter of higher education. Should it not give a lead in infant education also? The ever watchful eye of my reverend chief, Nawab Masood Jung Bahadur, detected the need, and he initiated the kindergarten movement here by making some provision for it in the Hyderabad city. I am confident that the far-sighted policy of Nawab Masood Jung Bahadur will gain more vigour and strength in, Sir, your worthy hands.

Ladies and Gentlemen, I dream of the day when a real kindergarten will be established in the Hyderabad city, with a nursery school attached to it. Its building will be a Children's Palace, it will contain an assembly room, a completely equipped gymnasium, a manual training room, a vast play-ground and a large garden of its own. The interior of the building will be decorated with pictures of child life and pastimes of children of all countries. There will be

Only one who understands children can be of service to them.

(2) The kindergartner must love children.

Love for children should not mean a liking for good or bright children alone. True love means a sympathetic attitude towards all, rich or poor, attractive or ugly, bright or dull, and a keen desire to help every little one entrusted to one's care. An atmosphere of love is an essential feature of the kindergarten.

(3) The kindergartner must be firm but of a cheerful disposition.

Children are born imitative. A cheerful person makes the children happy. Good mood is necessary for good work. A happy child is usually obedient.

(4) The kindergartner must be just and truthful.

Children are quick to feel and quick to judge. Generally, children are born good. It is only from their elders and olders that they learn deceit and falsehood.

(5) The kindergartner must have personality.

He must be properly dressed; he must be neat and tidy. The personal appearance has a soothing effect on the children and is reflected in them. The imitative instinct being strong, the dress of the kindgartner will induce the children to dress properly; his neatness and tidiness will inculcate good habits in them.

(6) Last, but not least, is the question of sex. A woman is a born psychologist of children. It is she who understands children. A good kindergartner may be a male born teacher, but the best can only be a woman. As psychology plays no small part in the making of a good kindergartner, I believe, an Indian woman, if properly trained, would be superior to one of any other country, because of her family life: the schemes of her mother-in-law, the moods of her father-in-law, the whims of her husband,

Just as no two children of the same parents are alike, no two nations are similar. Each has characteristics of its own. Child-study has brought out the importance of individual work; hence it is necessary to study the child of each country in order to add to or alter the materials devised by the great educators. This is really the work of normal schools and colleges, but, unfortunately, in India they have been barren of results. I am unaware of any institution in India where even an attempt has been made to study the Indian child in the light of modern psychology.

My conviction is that no school in India can be successful on Froebelian or Montessorian lines until the Indian child is thoroughly studied and games and materials adapted, modified or added to in the light of the knowledge thus obtained. In our schools especially we have to face a difficulty which is almost unknown in Western countries. Our schools are full of children of all sorts of people in different stations of life. I do not think even the most democratic country in the world can point out a single school in which boys of all castes, creed and culture mingle together and receive their education as in the schools of our country. This very feature of our school life, so beneficial to the national growth of India, is a hindrance to the mental development of our children.

The Minimum qualifications of a Kindergartner. As the success of any system mainly depends on the persons who work it, it is desirable to find out, if possible, the kind of person who should be put in charge of the Kindergarten. In my opinion the kindergartner should possess at least the following qualifications:

(1) The kindergartner must know the elements of child psychology.

At no stage of life is individual work so important and individual attention so essential as under the age of 5.

discovers defects and tries to remedy them. Froebel taught the children in groups, but Dr. Montessori insists on individual instruction, allows them free movement, freedom to choose their work within certain limits, and to take their own time over it. There is no forcing the pace or keeping back of anyone as is necessary in any form of teaching in groups. When the child gained new ideas, Froebel devised ways for their application, but Dr. Montessori does not give any encouragement to the child to apply his newly gained knowledge. She waits till the child does it on his own.

Thus it is evident that the fundamental idea of Froebel is intact to this day, but there are more than one opinion about the materials to be used by the children. The charge against Froebel's materials should not deter us, as nothing is inanimate or dead to a child, who is full of imagination and has the characteristic of endowing inanimate objects of his play with life and human feelings. It is not necessary to dilate on this point, as everyone has seen a child riding on a stick and calling it a horse, playing with toys, and treating them as living things.

But do Froebel's gifts really aid the child in his development? I believe they do so, but not to the extent which Froebel expected. Does Montessori's apparatus solve the problem? I think it is too early to answer this question. Montessori's apparatus has not yet passed the stage of experiment. A little incident which occurred in London in my presence may help to elucidate this. In 1920 the Montessori school teachers decided to request Dr. Montessori to come to London to inspect their schools and advise them about their work. On their invitation Dr. Montessori arrived in London. She inspected all the schools, and then met the teachers at a gathering in Tavistock Square. There she complained of misinterpretation of her ideas and condemned the teachers concerned. This caused a tumult. Dr. Montessori left the meeting in disgust, and the teachers dispersed in great uproar.

After the out-door work, the children played again with the organised materials, and the work of the day was closed by telling a story.

Froebel "lived with children": met them on their own plane and led them on to a higher one. His experiment was an immediate success. There is ample evidence to show that Froebel had impressed his contemporaries and awakened the teachers to the possibilities of a new system of education.

The difference between the methods of Froebel and Montessori. It is to the lasting credit of Froebel that since the establishment of the Kindergarten more than 90 years ago, though much progress has been made, knowledge has increased till child study has become an important subject, and in spite of the fact that his psychology has been disproved, the development of the movement started by him has been in application rather than in principle. For instance, his programme of exercises has been elaborated, more active games have been introduced, better stories and songs have been composed, and the size and quality of the materials have been improved, but without altering his principle in the least. Present-day criticism has chiefly been directed against his organised materials. It is urged that his materials are inanimate and dead. They are formless and changeless; hence there is a tendency to routine, which is contrary to the idea of the development of the child. Dr. Montessori, a gifted practical modern teacher, though agreeing with Froebel in the principle that the child is a living organism and that within him are forces which impel him to seek those activities that will best help him in his growth and development, has invented very different materials for the same purpose. Unlike Froebel, who laid stress on creative and expressive forms of hand work to vivify ideas, Dr. Montessori pays more attention to sensorial and muscular education; she tests senses and

It has been truly remarked that children do not play because they are young: they have their youth that they may play. Anything which interests a child is play to him; hence Froebel undertook the heavy task of the organisation of play instrumentalities in order to make complete use of the self-activity of the child. He devised dramatic games and games of skill to represent social activities of the society and to cultivate social qualities in them. He invented gifts to train their senses, and occupations to provide educative exercises for them. The set of balls gave ideas of colour; the three fundamental forms of form; cubes differently divided, of number and dimensions; and nature study, of the Universe. Thus by knitting together the material for play, Froebel thought that he had succeeded in linking the child with the means of his development, and thereby establishing the higher unity which was necessary in true educational effort.

Froebel's Kindergarten in Practice. Soon after the completion of his scheme, Froebel established his school for infants at Blankenburg in Germany in 1837 and conducted it himself. The place he selected afforded opportunities for gardening and nature excursions. He was unfortunate in the matter of a building, but as he regarded nature study the most important feature of his scheme, he had to be content with a disused powder-mill. He started the work of the day by forming the children into a circle, who then sang songs of greeting and thanksgiving. This over, they were given organised materials to play with. The experience of each child was closely watched in order to get the point of departure, and then it was given a meaning and relation by Froebel himself. After this, the children marched to the gardens, woods, or fields, or playgrounds, and here, both in games and observation, the children's immediate interests formed the starting point; and thus they were led to games or observations, supervised over by the teacher in charge.

experience teach, and that all development comes from within. He emphasised the importance of observation, and insisted that an atmosphere of love was necessary for the proper development of children. His own school which he conducted under great difficulties and privations was a success. Even the appearance of his children underwent a great transformation within a short period of their training. They looked cheerful, intelligent, and interested in their work. Friederick Froebel, a born teacher, having imbibed the educational philosophy of Comenius and Rousseau, sat at the feet of Pestalozzi and arrived at certain educational conclusions of fundamental importance. He discerned the necessity for the self-activity of the child, and made him the determining factor in the conception of any educational programme. He discovered the fact that both in body and in mind the child is restless and must have an outlet for his restlessness; and hence no system of education could be complete unless and until it provided for activity on the part of the child and direction, and mere direction on the part of the teacher. "Education" he said "consists in leading man as a thinking, intelligent being growing in self-consciousness to a pure and unsullied, conscious, and free representation of the inner Law of Divine Unity; and in teaching him ways and means thereto." He recognised the fact that development must vary according to the child. According to him, "all development must depend on the connectedness of humanity—we call heredity—,what the individual inherited from previous generations." Yet he thought it necessary that certain broad principles governing it might be accepted in order to guide one in educating children. "Man, gifted with divine, earthly, and human attributes, should be viewed as related to God, to nature, and to humanity, as comprehending within himself unity, diversity, and individuality, as well as the present, past, and future."

of his creative genius and a wonderful contribution to Education, but we cannot forget the fact that Froebel is indebted to others for the theories which embody the Kindergarten.

It was Comenius who first struck the keynote of modern education. His teaching was: "Never teach words without things; if these fail, try to make accurate representations of them, direct your attention to the body of the child, for on its healthy condition depends the mental development of the child." But Comenius, full of ideas much in advance of his age, failed to gain even the ear of his contemporaries. It was left to the fiery Frenchman to force the world to throw off the incubus and to march forward towards a new ideal. Rousseau, the precusor of world revolution, saw clearly that his political theories, to be transformed into realities, required a new type of men. So he turned his attention to the question of education, and his master-mind soon discovered both the weakness of the prevailing system and its remedy. He found that up to his day, while the methods of teaching and the subjects of instruction were receiving attention, the child—the main factor in education was being neglected. He focussed the attention of the educators on the educand—the recipient of instruction. His dictum was: "Begin by studying your pupil for certainly you do not understand him. We fill our own thoughts and do not see their effect on children." Rousseau's educational ideas were surprisingly sound and modern, but like most imaginative people he was not practical. He shook the placid world, disturbed the existing system, but failed to replace it with one of his own. The man to put theories into practice and to turn dreams into facts was Pestalozzi. His name will always be associated with infant education and remembered with feelings of gratefulness by every member of the teaching profession. He was a real teacher. He believed in deeds and not in words. He demonstrated the truth of all his ideas. His teaching was that life and

of the schools depends on their Infant classes, for which the age of admission fixed by the Department is 5 years; but to satisfy the rapacious demand of the higher authorities to increase the strength of the school, even though there may have been a decrease in births or an increase in deaths, children under five are admitted wholesale, and the clever Headmaster groups all the children under five into a separate class and gives it the dignified name of Kindergarten. Thus he not only succeeds in increasing the strength of the school, but also in giving it a distinct modern touch by putting the stamp of his training on his school. The Inspector is satisfied that his orders have been carried out and that everything is within the *zabitha* or rules. So are the parents—the mother especially, most concerned with the children, is thankful to the Headmaster for keeping away her little children during the day and for enabling her to do her domestic work without the constant botheration of her little mites.

The gradual development of the Kindergarten. Just as there is good in evil, even a grotesque form of the Kindergarten brings about a change of atmosphere in education. It shows dissatisfaction with the existing conditions: a break from the old system and a search for the new. It paves the away for a better understanding of the Kindergarten.

It was not till the 19th century, when industrialism had shaken family life, utilitarianism had spread its gospel of "the greatest happiness of the greatest number", and nationalism had established the value of 'man', that Kindergarten came into existence, with the avowed object of training "brave, upright, and industrious citizens for the State."

The Kindergarten is the product of Friederich Froebel's deep thinking and 25 years' teaching experience. The founder himself regarded it as the greatest achievement of his life, and there is no doubt that it is the supreme effort

The games were grouped round a song either of nature or of family or of some vocation or trade, but the idea of dramatisation for the sake of self-expression was absent. Nothing would emanate from the child: everything originated with the teacher. The children's games were thus turned into rythmic exercises, and all that can be said in their favour is that it was a welcome change for children from sitting still.

The stories told in the Kindergarten were uninteresting and beyond the comprehension of the children. Nature study, so fascinating to the children of industrialised countries, was a dry theoretical lesson cut off from activity of any kind.

Since the influx into our own schools of trained teachers, who are being produced by our Normal Schools with as much rapidity as the cheap German goods after the Great War, it is not uncommon to come across a newly trained Headmaster who will gushingly tell his Inspector-on-tour that he has opened a Kindergarten class in his school soon after his arrival there. The Kindergarten he talks of is usually located in a narrow, dark, and damp room, with no equipment and no material, not even sand and pebbles. It is put in charge of an old fossil who is infirm, ignorant, and ill paid, but adept in gathering children from all the nooks and corners of the village (the only qualification which keeps him on the staff of the school). The children thus rounded up are almost naked and covered with filth,—their noses flowing, their eyes full of mucus, their nails stuffed with dirt, their mouths besieged by flies—stick in hand, the teacher keeps them still. He does not mind if they go to sleep, but in no case will he allow them to laugh or play or even to cry.

But how is this parody of the Kindergarten system looked upon by the authorities and the public? With the dubious exception of Secondary schools, the main strength

The Kindergarten.*

BY

SAJJAD MIRZA, M. A., (CANTAB), C. T. (LONDON.)

Principal, Chadderghat High School, Hyderabad (Deccan.)

Misconceptions about the Kindergarten. It is not very long since an English Headmistress of 35 years' professional standing is reputed to have said, "We have kindergarten on Wednesday afternoons and then it is over for a week." This is a very significant and interesting remark. In fact, we should be thankful to the English Headmistress for the graphic, frank and candid way in which she described the Kindergarten of her day.

It is evident from this that the Kindergarten was regarded only as a subject of the curriculum, and there are records to show that it appeared as such on the time-tables. It was treated like reading and writing, the only difference being that the Kindergarten meant the use of certain materials or occupations or the playing of games during the working hours. The use of gifts was nothing short of ritual. With the ringing of the bell, at the appointed time, gifts were taken up by the children, who went through the prescribed rites and finished them at the ringing of the next bell. The teacher in charge made the children examine bricks, ordered them to build a structure, and then to develop it without disturbing and destroying it and without waste of material. Tablet-laying, stick and pea-work were done in the same manner.

Similarly, occupations centred round prepared and almost patented material; for instance, head-work in paper-cutting was done strictly in accordance with the given dimensions. The length and breadth of the paper was prescribed by the teacher, and the poor children who were there to develop their self-activity could not deviate from the commands of their teacher.

* A lecture deliverd at the last Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.							SUBSCRIPTION RATES.
Space.	Whole year.		Six months.		Per issue.		
	Rs.	As.	Rs.	As.	Rs.	As.	
Full page ...	10	0	5	0	3	0	For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including postage).
Half page ...	5	0	2	12	1	8	For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage)
Quarter page.	2	8	1	6	0	12	Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Per line ...	0	10	0	8	0	6	Single copy B. G. As. 12 for British India.

The Urdu Section is published separately also. Subscription Re. 1—14 As. a year.

S. M. KHAIRATH ALI, MANAGER,
Hyderabad Teacher,
Gun Foundry, Hyderabad, Deccan.

LIST OF BOOKS PURCHASED
FOR THE LIBRARY OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION.

1. Studies of Childhood by Sully.
2. Education by Michael West.
3. Talks to Teachers on Psychology by William James.
4. Teaching and Organisation by Barnett.
5. The Direct Teaching of English by Wren.
6. Psychology in the School Room by Dexter and Garlick.
7. Common Sense in Education and Teaching by Barnett.
8. The Teacher's Hand-book of Psychology by James Sully.
9. From a Kindergarten Window by Corrie Gordon.
10. Child Nature and Education by Corrie Gordon.
11. Montessori Schools by Jessy White.
12. Exposition and Illustration in Teaching by Adams.
13. School Discipline by William Chandler Bagley.
14. School Management & Method of Instruction by Collar & Crook.
15. Principles of Class Teaching by Findlay.
16. A Brief Course in the History of Education by Monroe.
17. The Montessori Method by Maria Montessori.
18. Dr. Montessori's Own Handbook by Maria Montessori.
19. The Advanced Montessori Method Vol. (I) by Maria Montessori
20. do do do (II) do
21. Human Nature and Education by Woodburne.
22. Teaching in Indian Elementary Schools by Miss Corrie Gordon.
23. The Dalton Laboratory Plan by Evelyne Dewey.
24. Elements of Psychology by Thorndike.
25. The Educational Ideas of Pestalozzi by Green.
26. The Principles and Practice of Teaching and Class Management by Joseph Landon.

(To be Continued).

THE HYDERABAD TEACHER.

October, 1929.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

Vol. IV. | October, 1929 A. D. / Azur, 1339 F. | No. 2.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan, Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

P. V. R. SEBASTIAN, B. A.

SECUNDERABAD - DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1929.

Single Copy Annas 12. (Postage Extra).

رجسٹر شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴۷

جلد (۴) — اسفندار ۱۳۳۹ف م جنوری سنہ ۱۹۳۰ء — شمارہ (۳)

زیر سرپرستی جناب فخر محمد خان صاحب ناظم تعلیمات سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

دائرہ ادارت :—

سید علی اکبر ایم اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن ملا بی اے بی ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبدالغنی صدیقی بی اے بی ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو پیدا کرنا۔
(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
ا۔ اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اُردو حصہ (عہ) فی پرچہ اُردو و انگریزی (۱۲ر) صرف اُردو (۸ر)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اُردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	صہ ۸ر	سے
نصف صفحہ	صہ ر	للعہ ۱۲ر	عصہ ۸ر
ربع صفحہ	للعہ ۸ر	عصہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ اسفندار ۱۳۳۹ف م جنوری سنہ ۱۹۳۰ع

جلد (۴) — **فہرست** — شمارہ (۴)

قاعدہ فارسی، ہندوستانی گاؤں کے پرند، امور خانہ داری و ترتیب دلاؤ،

تاریخ ہند، متعلم، ہونہار، نیرنگ خیال۔

انجمن امداد باہمی

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

امداد باہمی (Cooperation) کے اصول پر دکن میں اُردو مطبوعات کا

پہلا وسیع اور قابل اعتماد

ہر حصّہ (مار) مالی جو بیس ماہ میں فی قسط صہ رکے حساب سے ادا شدنی ہیں منافع بعد ادائی زکوٰۃ دس فی صدی تقسیم ہو رہا ہے

تھوڑے حصّے باقی رہ گئے ہیں

(خریدار جلدی کریں)

مکتبہ کے شعبے

۱۔ فروخت کتب۔ اُردو زبان کی تمام کتابیں ملسکتی ہیں کمیشن پر فروخت کی جاتی ہیں

۲۔ طبع۔ بہترین ماہر فن لیتھوگرافر کی نگرانی میں کام کر رہا ہے ہر قسم کی طباعت بہترین

۳۔ دارالاشاعت مؤلفین کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

افتتاحیہ

عثمانیہ ٹرینگ کالج | نئے تعلیمی سال نے سررشتہ تعلیم کی ایک نہایت شدید ضرورت کی سربراہی دیکھی۔ عثمانیہ ٹرینگ کالج کا افتتاح وہ مبارک تقریب ہے جس نے ایک طرف تو غیر ملکی ٹرینگ کالجوں سے دکن کے سپوتوں کو مستغنی کردیا اور دوسری طرف فن تعلیم کی ترقی میں ایک اور منزل کا اضافہ کرکے اور دیسی طیلسانین کے لئے سہولتیں بہم پہونچاکر، مدارس کی تعلیم کو بہتر بننے کا موقع دیا۔ عثمانیہ ٹرینگ اسکول کا قیام جب سے عمل میں آیا ہے، تب سے ظاہر ہے کہ تحتانیہ جماعتوں کی تعلیم بہت بہتر ہوگئی ہے۔ اسی اسکول میں میٹرک ٹرینگ اور حال ہی میں ایف اے ٹرینگ کے انتظام سے وسطانی طبقوں کی تعلیم میں نمایاں ترقی نظر آرہی ہے۔ اب جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تعلیم کے افتتاح سے اُمید ہے کہ فوقانی جماعتوں کو گرانقدر فائدہ پہونچے گا۔ یہ سب کچھ بتدریج ہوا اور ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن، جس عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم بڑھایا گیا اور ایک منزل کو استوار و مستحکم کرنے کے بعد دُوسری منزل کی تعمیر عمل میں آئی اس کے لئے ارباب بسط و کشاد کی دانائی و فراست قابل تحسین ہے اور ہم انھیں بی ٹی کلاس کے قیام پر مُبارکباد دیتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے بفضل خدا شعبہ بہ شعبہ کمل رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم شعبہ تعلیم کا مقابلہ دوسرے شعبوں سے کریں تو پہلی ہی نظر میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے جب کبھی جامعہ عثمانیہ نے کوئی شعبہ کھولا تو اس سے پہلے ہی اس شعبہ کے متعلق مستند اور متداول کتابوں کے ترجمے کرائے گئے چنانچہ دو اہم مثالیں شعبہ قانون اور شعبہ ڈاکٹری کی ہیں لیکن بی ٹی کے انتظام کے پہلے جامعہ نے فن تعلیم کی کتابوں کے ترجمے کرانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہاہمیں معلوم ہے کہ سررشتہ تعلیم نے چند کتابیں ترجمہ کرائی ہیں۔ مگر اس بناء پر جامعہ عثمانیہ کو اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب کہ ذریعہ تعلیم اُردو ہے تو یہ اصولاً درست نہیں کہ امتحانات تو اُردو میں ہوں اور درسی کتابیں اور حوالہ کی کتابیں انگریزی زبان میں ہوں

انجمن امداد باہمی

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

امداد باہمی (Co-operative) کے اصول پر دکن میں اُردو مطبوعات کا

پہلا وسیع اور قابل اعتماد

ہر حصہ (ما) مالی جو بیس ماہ میں فی قسط صہ کے حساب سے ادا شدنی ہیں منافع بعد ادائی

زکوٰۃ دس فی صدی تقسیم ہو رہا ہے

تھوڑے حصے باقی رہ گئے ہیں

(خریدار جلدی کریں)

مکتبہ کے شعبے

۱۔ **فروخت کتب۔** اُردو زبان کی تمام کتابیں ملسکتی ہیں کمیشن پر فروخت کی جاتی ہیں

۲۔ **طبع۔** بہترین ماہر فن لیتھوگرافر کی نگرانی میں کام کر رہا ہے ہر قسم کی طباعت بہترین

۳۔ **دارالاشاعت** مؤلفین کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

افتتاحیہ

عثمانیہ ٹریننگ کالج | نئے تعلیمی سال نے سررشتہ تعلیم کی ایک نہایت شدید ضرورت کی سربراہی دیکھی۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج کا افتتاح وہ مبارک تقریب ہے جس نے ایک طرف تو غیر ملکی ٹریننگ کالجوں سے دکن کے سپوتوں کو مستغنی کردیا اور دوسری طرف فن تعلیم کی ترقی میں ایک اور منزل کا اضافہ کرکے اور دیسی طیلسانین کے لئے سہولتیں بہم پہونچاکر، مدارس کی تعلیم کو بہتر بننے کا موقع دیا۔ عثمانیہ ٹریننگ اسکول کا قیام جب سے عمل میں آیا ہے، تب سے ظاہر ہے کہ تحتانیہ جماعتوں کی تعلیم بہت بہتر ہوگئی ہے۔ اسی اسکول میں میٹرک ٹریننگ اور حال ہی میں ایف اے ٹریننگ کے انتظام سے وسطانی طبقوں کی تعلیم میں نمایاں ترقی نظر آرہی ہے۔ اب جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تعلیم کے افتتاح سے اُمید ہے کہ فوقانی جماعتوں کو گرانقدر فائدہ پہونچے گا۔ یہ سب کچھ بتدریج ہوا اور ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن، جس عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم بڑھایا گیا اور ایک منزل کو استوار و مستحکم کرنے کے بعد دوسری منزل کی تعمیر عمل میں آئی اس کے لئے ارباب بسط وکشاد کی دانائی و فراست قابل تحسین ہے اور ہم انہیں بی ٹی کلاس کے قیام پر مُبارکباد دیتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے بفضل خدا شعبہ بہ شعبہ کھل رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم شعبہ تعلیم کا مقابلہ دوسرے شعبوں سے کریں تو پہلی ہی نظر میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے جب کبھی جامعہ عثمانیہ نے کوئی شعبہ کھولا تو اس سے پہلے ہی اس شعبہ کے متعلق مستند اور متداول کتابوں کے ترجمے کرائے گئے چنانچہ دو اہم مثالیں شعبۂ قانون اور شعبۂ ڈاکٹری کی ہیں۔ لیکن بی ٹی کے انتظام کے پہلے جامعہ نے فن تعلیم کی کتابوں کے ترجمے کرانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہمیں معلوم ہے کہ سررشتہ تعلیم نے چند کتابیں ترجمہ کرائی ہیں۔ مگر اس بنا پر جامعہ عثمانیہ کو اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب کہ ذریعہ تعلیم اُردو ہے تو یہ اصولاً درست نہیں کہ امتحانات تو اُردو میں ہوں اور درسی کتابیں اور حوالہ کی کتابیں انگریزی زبان میں ہوں

اُن مشکلات سے قطع نظر جو بی۔ ٹی کے طلبہ کو پیش آتی ہیں، اس دو زبانی طریقہ سے سیکھا ہوا علم عملی زندگی میں زیادہ کام نہیں آسکتا۔ اس لئے بیحد ضروری ہے کہ کتب درسی اور جس قدر ہو سکیں حوالہ کی کتابیں بھی، ترجمہ کرائی جائیں تاکہ حیدرآباد میں چند طلبہ کے لئے بی۔ ٹی کلاس کھول کر جو مصارف خزانہ شاہی پر عائد ہوئے ہیں وہ بےکار نہ جائیں۔ لہذا ہماری رائے میں یہ مناسب ہوگا کہ سررشتہ تالیف و ترجمہ میں شعبۂ تعلیم کا اضافہ کیا جائے اور اس شعبہ کی نوعیت بالکل شعبۂ ڈاکٹری کی طرح ہو کم از کم تین مترجمین کا تقرر کیا جائے۔ ایک نفسیات اور اُصول تعلیم کے لئے (۲) طریقۂ تعلیم کے لئے (۳) تاریخ تعلیم اور نظم و نسق مدرسہ وغیرہ کے لئے اس کے علاوہ اُجرت پر بھی کتابیں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ بہت جلد فن تعلیم کی اکثر عمدہ و مستند کتابیں اردو کا جامعہ پہنے ہوئے نظر آنے لگیں۔

جامعہ عثمانیہ کے ساتھ سررشتۂ تعلیمات کا اشتراک عمل بیحد ضروری ہے کیونکہ جامعہ عثمانیہ نصابی ضروریات کے مدنظر معدودے چند کتابیں ترجمہ کرائے گا۔ جو طلبائے بی ٹی کے کام آسکیں لیکن تعلیمات کو نہ صرف ان کتابوں کی ضرورت ہے بلکہ قریب قریب ہر اچھی کتاب کے ترجمہ کی ضرورت ہے۔ تاکہ دوسرے ممالک کے تعلیمی تجارب اور تعلیمی ترقیوں سے ہمارے مدرسین ناواقف نہ رہیں۔ سی۔ ٹی اور بی ٹی کے لئے ان کتابوں کو انگریزی میں پڑھنا مشکل نہیں۔ لیکن مڈل و میٹرک کامیاب کے لئے بیشک دشوار ہے۔ اس لئے اُن کے اور ان مدرسین کے لئے جو انگریزی سے واقف نہیں ہیں۔ ترجمے بیحد مفید ثابت ہوں گے۔ اور ان کی حاصل کی ہوئی تعلیم کو تازہ اور ان کو تعلیمی ترقیوں کے پہلو بہ پہلو رکھیں گے اور غیر انگریزی دانوں سے جو عام طور پر "دقیانوسیت" کی شکایت ہے وہ جاتی رہے گی۔

سررشتۂ تعلیمات کے لئے تین صورتیں ممکن ہیں۔ (۱) یا تو وہ بھی چند مترجمین مقرر کرے یا (۲) اُجرت پر ترجمہ کرائے یا (۳) چند قابل لوگوں کو مستقل الاؤنس دے کر ترجمہ کا کام لے تعلیماتی "شعبۂ تراجم" کے اخراجات سالانہ بجٹ سے پورے کئے جاسکتے ہیں اور کتابوں کی قیمتیں مدارس کے ابواب مشترکہ یا سررشتہ کے مد کتب و اخبار سے ادا کی

جاسکتی ہیں۔

آخر میں ہم اتنا اور کہیں گے کہ تعلیمی کتابوں کے ترجمہ سے نہ صرف متعلمین۔ بی۔ ٹی اور معلمین مدارس کو فائدہ پہونچے گا بلکہ اس صورت میں "اردو کمیٹی" کی سفارش کے مطابق اگر غیر انگریزی دانوں کو ٹرننگ میں شریک کیا گیا تو اُن کو انگریزی دانوں کے مقابلہ میں کوی دشواری پیش نہ آئے گی۔ اس کے علاوہ یہ ممکن ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں اپنے علاقہ کے غیر انگریزی دان اساتذہ کو ہمارے مدرستہ المعلمین میں ٹرننگ کے لئے بھیجیں اور شعبہ تعلیم کی مالی مشکلات کم ہوجائیں۔

ہم جامعہ عثمانیہ کے موسس اعلیٰ عالیجناب نواب حیدر نواز جنگ بہادر اور جناب ناظم صاحب تعلیمات مولوی خان فضل محمدؐ خان صاحب کی معارف شناسی اور تعلیمی دلچسپی سے پوری توقع رکھتے ہیں کہ جس قدر جلد حالات ساعد ہوں گے ضرور اس اہم معاملہ کی طرف توجہ مبذول کی جائے گی۔

کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ بابت ۱۳۴۹ف اور ذیلی کمیٹیوں کا تقرر

گذشتہ سال کانفرنس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اُس کے جلسوں میں پانچ کمیٹیوں کی رپورٹیں پڑھی گئیں، جو بے حد مقبول ہویں۔ کمیٹیوں کی تحقیق اور تدقیق کی بنا پر جو سفارشیں مختلف مضامین کی تعلیم کے متعلق کی گئی تھیں، انہوں نے نہ صرف اساتذہ کرام کی توجہ اپنے اپنے مضامین کی طرف منعطف کرادی ہے، بلکہ جدید تحقیقات سے جمہور معلمین کو آگاہ کردیا ہے۔ ان سفارشوں پر عمل کرنے سے جو عمدہ نتائج برآمد ہوئے ہیں اُن کو مدنظر رکھکر یہ طے کیا گیا کہ اس سال بھی تعلیم جغرافیہ و تاریخ اور ریاضی کی تعلیم سے متعلق غور وخوض کرنے کے لئے مشاق اور تجربہ کار مدرسین کی کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں اس سال کمیٹیوں کو نسبتہً زیادہ وقت ملا ہے۔ نظر برآں جو رپورٹیں آیندہ کانفرنس میں پیش ہوں گی وہ اراکین انجمن کے کامل غور وخوض کا نتیجہ ہوں گی اور مضامین زیر بحث کی تعلیم کے متعلق مدارس اور مدرسین کی حقیقی معنوں میں ترجماں ہوں گی۔ اراکین کمیٹی کی تشکیل میں بھی بے حد احتیاط اور تامل سے کام لیا گیا ہے اور پوری انجمن سے چن چن کر ایسے قابل اساتذہ کو منتخب کیا گیا ہے جو اپنے اپنے مضامین کے متعلق کافی غور وخوض کرچکے ہیں اور ان مضامین کی خامیوں، کوتاہیوں ضرورتوں اور اصلاح

طلب شعبوں سے کما حقہ واقف ہیں ہمیں یقین ہے کہ یہ رپورٹیں فن تعلیم میں بیش بہا اضافہ اور ضروری اصلاحوں کی طرف رہنمائی کریں گی۔

ایک محبِ قوم کی وفات

پچھلے دنوں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بی۔ اے کنٹب بیرسٹرایٹ لا کے انتقال کی خبر سنکر ہم کو بیحد ملال ہوا۔ مرحوم مدرستہ العلوم علی گڈھ کے ممتاز اور سربرآوردہ طالب علم تھے۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں آپ نے کالج کی سرگرمیوں اور مختلف انجمنوں میں دلچسپی لے کر ادبی ذوق اور قومی ایثار کا ثبوت دیا۔ ولایت کی تعلیم سے الفراغ حاصل کرنے کے بعد ایک عرصہ تک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی معتمدی کے فرائض انتہائی دلچسپی اور ایثار کے ساتھ انجام دیتے رہے مسلمانوں کے تعلیمی امور اور مادر کالج کی خدمت کی انجام دہی میں، جو حصہ مرحوم نے لیا، وہ کسی طرح فراموش کرنے کے قابل نہیں۔ کچھ عرصہ وزیر ہند کی کونسل کے رکن رہنے کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو مسلم یونیورسٹی کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف و منہمک ہو گئے۔ مرحوم ظاہرداری اور تصنع سے ہمیشہ متنفر رہے اور اس کی کوشش کی کہ حقیقی کام ہو اور مسلم یونیورسٹی کے طلبہ ہر طرح زیور علم سے آراستہ ہو کر میدان عمل میں ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش رہیں۔ اصلاحات کا ایک زبردست اسکیم مرحوم کے پیش نظر تھا اور وہ دلی آرزومند تھے کہ یونیورسٹی کے ہر شعبہ کو انتہائی کمال اور معراج پر دیکھیں۔ مگر افسوس ہے کہ نامساعدت زمانہ اور خرابی صحت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ چنانچہ مرحوم کو بہت جلد یونیورسٹی کی خدمت وائس چانسلری سے مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی علٰحدگی کے بعد یونیورسٹی کے انتظام میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں انھیں وہ بستر علالت سے بھی نہ دیکھ سکے؛ چنانچہ صاحب موصوف نے حکومت ہند کو توجہ دلا کر ایک کمیشن مقرر کرا دیا اور لائق ہاتھوں میں یونیورسٹی کی باگ دیکر چین و اطمینان کے ساتھ اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

اس جانکاہ حادثہ اور قومی ماتم میں ہم بھی سوگوار اور مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں!

خطبہ صدارت +

(از)

مسٹر پی۔ ایس سیوا سوامی ایئر، کے۔ سی۔ یس۔ ای، سی۔ آئی۔ ای۔
بی۔ اے، بی ایل

حضرات

میری تمنا تھی کہ اس اجلاس کی صدارت کے لئے رائٹ آنریبل وی۔ یس۔ سری نواس شاستری کی خدمات کا حاصل کرنا آپ کے فیڈریشن کے لئے ممکن ہوتا جن پر آپ کے نظر انتخاب پہلے پہل پڑی بھی تھی وہ کئی سال تک آپ کے ہم پیشہ رہے ہیں۔ گو انہوں نے گوناگوں سرگرمیوں کے ایک وسیع تر دائرہ میں کام کرنے کے لئے آپ کے حلقہ سے کنارہ کشی اختیار کی ہے مگر اب بھی تعلیم سے اُنہیں خاصی دلچسپی ہے۔ اگر آپ اس کا تازہ ترین ثبوت چاہتے ہیں تو جنوبی افریقہ کے شاستری کالج کی قابل یادگار بنیاد کو لے لیجئے۔ تعلیمی مسائل اور مدرس کی زندگی کے حالات، ذاتی تجربہ سے حاصل کردہ معلومات اُن کی وسیع نظر جو مختلف ممالک میں سفر کرنے اور مختلف اشخاص سے ملنے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اُن کی قوت فیصلہ اور سب سے زیادہ اُن کی قوت گویائی یہ سب چیزیں اُن کے خطبہ کو مستند اور قابل تسلیم بنا دیتیں۔ میں صرف معمولی آدمی ہوں جس نے کئی سال تک تعلیم کے مضمون سے گہری دلچسپی لی ہے۔ میں نے آپ کی دعوت صدارت اس لئے قبول نہیں کی کہ تعلیمی معاملات میں میں اپنے آپ کو مستند سمجھتا ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ مجھے اس امر کا احساس ہے کہ معمولی انسان بھی تعلیمی پالیسی اور مقاصد کے متعین کرنے میں کوئی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اور ایک کامل ماہر تعلیم کے لئے ضروری و لازمی ہے کہ معمولی انسان کے نقطہ نظر کی بھی قدر کرے محض آپ کے پیشہ کے اغراض کو

+ یہ خطبہ آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشنس کے پانچویں سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس میں گوش گذار حاضرین کیا گیا تھا۔

ترقی دینا آپ کے فڈریشن کا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ عام طور پر مقصدِ تعلیم کو ہر ممکنہ نقطۂ خیال سے وسعت دینا ہے۔ مضمونِ تعلیم انسانی سرگرمیوں اور سماجی بہبود کے تقریباً ہر شعبہ سے متعلق اور ایک وسیع میدان عمل پر محیط ہے فی الوقت جن مختلف مسائل سے آپ کو دلچسپی ہے اُن سب سے بحث کرنے کی کوشش میرے امکان سے باہر ہے۔ اور نہ میرا یہ خیال ہے کہ مجھ سے ایسی توقع کی جاتی ہے۔ اگر میں چند خاص عنوانوں اور مباحث پر روشنی ڈالوں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ میں اُن پر زور دینا چاہتا ہوں نہ یہ کہ جن دوسرے مسائل سے آپ کو دلچسپی ہے ان کی اہمیت سے میں واقف نہیں ہوں۔

ہندوستان کے دستوری کمیشن (انڈین سٹاچوٹری کمیشن) کی جانب سے مقرر شدہ ذیلی کمیٹی کی رپورٹ جو ۱۹۲۷ء کی ختم ہونے والی دہ سالہ مدت سے متعلق ہے اِس سال کی ایک نمایاں اہمیت ہے۔ ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ باوجودیکہ بلحاظ اغراض و مقاصد اس کی تحقیقات محدود نوعیت کی ہے، ایک نہایت ہی قابل قدر دستاویز ہے جو انصاف و ہمدردی کی فضا میں لکھی گئی کمیٹی کے کسی نتیجہ سے اختلاف کرنے کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہمارے بعض ہموطنوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے۔ کہ جہاں تک یہ نتائج نقائص کا اظہار کرتے ہیں۔ اُس حد تک اُن کو ہندوستان کے دستوری اصلاحات کے مخالفین استعمال کریں گے۔ انگلستان کے متعدد اخباروں میں اس رپورٹ پر جو رائے ظاہر کی گئی ہے۔ اُس سے اس میں شک نہیں کہ یہ خدشہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ میں اُن اخبارات کی آرا کو محض ہٹ دھرمی اور خود غرضی سے منسوب کرسکتا ہوں کوئی معقول شخص جو عام تعلیم کی تاریخ، یا ہندوستان کی طرز حکومت کی تاریخ سے واقف ہو، اِس رپورٹ سے کوئی ایسا نتیجہ جو ہماری سیاسی خواہشات کے منافی ہو۔ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگا وہ کونسے حقائق ہیں جن کو ہارٹوگ کمیٹی نے دریافت کیا ہے؟ اُن کا بیان ہے کہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۷ء تک کی دہ سالہ مدت میں درسگاہوں اور طلبہ کی تعداد کا لحاظ کرتے تعلیم کی رفتار میں سریع ترقی ہوئی اور مُلک روز افزوں حد تک تعلیم کے مقصد کے لئے قربانی کرنے کو تیار ہے نیز قانونی مجالس اور مقامی حکام تعلیم پر زائد اخراجات کی منظوری دینے کے لئے تیار اور راضی ہیں

نہ صرف یہی بلکہ طلبہ کی تعداد کا اضافہ تمام قومیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں اور پنچ قوموں میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کی اشاعت میں جو رکاوٹیں تھیں بتدریج دور ہو رہی ہیں تمام طبقوں اور تمام قومیتوں میں طلب علم کی خواہش قابل تعریف حد تک پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ کہ تعلیم کی بہتری اور وہ حالات جو درسگاہوں کی کامیابی کا راز ہیں ان دونوں میں ترقی کی ضرورت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ بالآخر اکین کمیٹی نے نتیجہ کیا نکالا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ قومی تعلیم کے نظام کے بنانے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے۔ اس پر غور کرنے کی خواہش گو عالمگیر تو نہیں ہے مگر پھیلی ہوئی ضرور ہے۔ اور اگر یہ خواہش قائم رہے اور عملی صورت اختیار کرے تو امید افزا استقبال یقینی ہے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس دہ سالہ مدت میں جن ہر دلعزیز وزراء کے قبضہ میں تعلیم کا شعبہ دیا گیا تھا۔ وہ ۱۹۲۱ء سے صرف چھ سال کے لئے کار فرما رہے ہیں تعلیم کی ترقی کے لئے اگر ایک طرف وزراء اور مجالس قانونی ذمہ دار ہیں۔ تو دوسری طرف جس داغ بیل پر ترقی ہوئی ہے وہ اکثر اصلاحات سے پیشتر کے خود مختار حکام کی ڈالی ہوئی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سابقہ نظام تعلیمی کے نقائص موجودہ ترقی کی تیز رفتاری کے باعث مبالغہ آمیز صورت میں نظر آ رہی ہیں۔ کامیابی متواتر تجربوں، غلطیوں سے متنبہ ہونے اور اصلاحات کے اختیار کرنے ہی پر منحصر ہے دنیا کا کونسا ملک ہے جو اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے مسلسل تجربوں اور بار بار کی ناکامیوں کے بغیر کامل یا بہتر نظام تعلیم قائم کر لیا ہو۔؟

کمیٹی کے دریافت کردہ حقائق کا اثر ہماری سیاسی ترقی کی قابلیتوں پر کیا ہوا ہے؟ نظام تعلیم پر دستوری حکومت کے مطالبات یہ ہیں کہ وہ ایک ایسا قابل حلقہ رائے دہندگاں پیدا کرے جو مناسب نمائندگاں کا انتخاب کرنے اور سیاسی جماعتوں کے متضاد لائحہ عمل کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے قابل ہو ایک مناسب حلقہ رائے دہندگاں کے پیدا کرنے کے لئے کس معیار اور کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے؟ اگر یہ رائے دی جائے کہ ایک آدمی کو حق رائے دہی کا استعمال کرنے کے قابل بنانے کے لئے ایک صحیح اور لبرل تعلیم کا نصاب ضروری ہے۔ تو بمشکل کوئی ملک ہی ایسا ہو گا جس کی نسبت یہ کہا جا سکے

کہ سب رائے دہندگان ایسے اشخاص ہیں جو لبرل تعلیم سے مستفید ہو چکے ہوں خود انگلستان اور مغرب کے دیگر جمہوری ممالک میں سیاسی مدبریں ان تمام نقائص پر اعتراض کرتے رہتے ہیں جو ایک رائے دہندہ کی رائے پر غیر متعلقہ خیالات ۔ اور ناقص و ناقابل عمل وعدوں اور لائحۂ عمل کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں یہ خیال نہ کر لیا جائے کہ میں حق رائے دہی کے لئے تعلیمی یا اور کوئی معیار مقرر کرنے کے خلاف کوئی رائے پیش کر رہا ہوں خود اراکین کمیٹی نے اس امر کے فرض کر لینے کے خلاف ہدایت کی ہے کہ وہ حق رائے دہی کے لئے خواندہ ہونے کو ضروری تصور کرتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ خواندہ ہونا تعلیم نہیں ہے بلکہ صرف تعلیم کا ایک ذریعہ ہے ۔ اور یہ کہ بعض صورتوں میں پایا جاتا ہے کہ بعض افراد اس قابل ہوتے ہیں کہ سمجھ بوجھ کر رائے دیں ہمارے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص کے اظہار میں مجھے مطلق تامل نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے برخلاف میں اسے اپنے نظام تعلیم کی ترقی کے لئے ایک ناگزیر ابتدائی منزل سمجھتا اور اس کا استقبال کرتا ہوں ۔

اب میں ہارٹوگ کمیٹی کے سیاسی رخ سے اس کے خالص تعلیمی پہلو کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۱۹۲۱ء کی اصلاحات کے بعد سے ملک کی عنان توجہ جس شعبۂ تعلیم کی طرف پلٹی ہے وہ عوام کی تعلیم ہے جمہوری آئین کی ضروریات کے علاوہ بھی ابتدائی تعلیم کی اشاعت کی ضرورت کو تمام طبقوں نے محسوس کیا ہے کمیٹی کی رائے میں تعلیم کی ابتدائی منزل میں طلبہ کی تعداد اور ابتدائی مدارس کے اخراجات دونوں میں بے حد ترقی ہوئی ہے ۱۹۲۲-۲۷ء کی پنجسالہ مدت میں (۲۲۳،۵۰،۴۷۰) کی بیشی تلامذہ کی تعداد میں ہوئی اور اخراجات میں ایک کروڑ چھیاسی لاکھ کا اضافہ ہو گیا ۔ ۱۹۲۷ء کے اعداد کا ۱۹۱۷ء کے اعداد کے ساتھ مقابلہ کیا جائے ۔ تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی تعلیم پر اخراجات ۲ کروڑ ۹۳ لاکھ سے ۶ کروڑ ۹۵ لاکھ ہو گئے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک معقول سوال ہے کہ آیا اس خرچ کے معاوضہ میں ملک نے کوئی معتدبہ فائدہ حاصل کیا ہے اور تعلیم میں اسی تناسب سے ترقی ہوئی ہے ؟ اراکین کمیٹی نے یہ فرض کر لیا ہے کہ کوئی بچہ مستقل طور پر خواندہ نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ کم سے کم چار سال کا نصاب پورا نہ کرے ۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ ابتدائی مدارس میں بے حد وقت

ضائع ہو رہا ہے اور طلبہ تعلیم ترک کر رہے ہیں۔ اکثر ابتدائی نصاب کے پورا کرنے سے پیشتر ہی مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں یا تحتانی جماعتوں میں ایک سال سے زیادہ روک لئے جاتے ہیں۔ کمیٹی نے اس امر کا پتہ چلایا ہے کہ کل برطانوی ہند میں اُن طلبہ میں سے جو سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں سب سے نیچی کی جماعت میں شریک ہوئے، سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں صرف (۱۸) فی صدی خواندہ کہلائے جانے کے مستحق نکلے۔ یہ قیاس تخمیناً ہے۔ مگر جو تعداد مستقل طور پر خواندہ کہلانے کے مستحق بن رہی ہے اُس کا صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تمام غلطیوں کا لحاظ کرنے کے بعد محنت اور روپیہ کے ضائع ہونے کا جو اندازہ کمیٹی نے کیا ہے اُس میں وہ حق بجانب ہے کمیٹی نے اس اسراف اور خرابی کے اسباب (جو زیادہ تر دیہاتی علاقوں میں ہے) والدین کے مفلسی، اُن کی ناقابلیت، ایک ہی مدرس کے مدارس کا لازمی ناکارہ پن، نصاب تعلیم اور دیہی زندگی کے ماحول کی عدم مطابقت، اساتذہ کی کم علمی اور معائنہ کرنے والے عہدہ داروں کی کمی، قرار دئے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ خرچ اور تضیع محنت کے متعلق کمیٹی کی رائے سے مخالفت کرنے یا اُن کی رائے کی صحت میں شک و شبہ کرنے کا امکان ہے جن اسباب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہی اسباب معالجے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ابتدائی مدارس میں جو اہم ترین اصلاحات مطلوب ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ نصاب تعلیم دیہی زندگی کے مطابق ہو اور اساتذہ کو دیہی زندگی سے رغبت دلانے والی تعلیم دی جائے اگر ایک جانب معائنہ کرنے والے عہدہ داروں کی کمی کو مان لیا جائے، تو دوسری جانب یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ اِن عہدہ داروں کی قابلیتوں میں بھی ترقی کی ضرورت ہے۔ اس امر میں کہ خود عہدہ دار مقامی ماحول کی ضروریات کے مطابق مؤثر تعلیم دینے کے قابل ہیں شک کی گنجائش ہے۔ مدرس کے کام پر تنقید و تعریض کرنا آسان ہے، لیکن خود تعلیم کے کام کو بہتر طریقہ پر انجام دینا اس قدر آسان نہیں۔ موجودہ قابلیتوں سے زیادہ قابلیت کے عہدہ داروں کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ جو سوال مُلک کے سامنے ہے وہ اخراجات کا سوال ہے یہ ظاہر ہے کہ سرمایہ محدود ہے۔ لہذا اس سرمایہ کو زیادہ گہری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ لگایا

جائے تاکہ حقیقی خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ ہو۔ یا موجودہ طریقہ پر مدارس کی تعداد بڑھانے میں صرف ہو۔ میں یہ خیال کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ زیادہ گہری کوشش اور انہماک کے ساتھ کام کرنے کے متعلق کمیٹی نے جو دلائل پیش کئے ہیں نہایت ہی وقیع ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قابلیت میں ترقی دینا اور ساتھ ہی ساتھ مدارس کی تعداد میں اضافہ کرنا ممکن ہے بشرطیکہ ہم ہر دو مقاصد کے لئے کافی سرمایہ سے تیار ہوں پنجاب میں مڈل ورناکیولر مدارس کے فارغ التحصیل اساتذہ کو جو دیہی زندگی سے میلان رکھتے ہیں دیہی مدارس میں مقرر کیا گیا ہے۔ اس انتظام کو اراکین کمیٹی نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ دیگر صوبجات میں بھی اس کی آزمائش کی جانی چاہئے۔ دیہی مدرسہ کا مطمح نظر نہ صرف خواندگی کا حصول بلکہ دیہی زندگی کے تمام پہلوؤں کے معیار میں اضافہ اور ترقی ہونا چاہئے جس کے حامی جدید ترین تعلیمی نظرئے بھی ہیں لہذا یہ نصب العین درست اور اس قابل ہے کہ اس کے حصول کی سعی کی جائے۔

اگر میرا حافظہ درست ہے تو مدراس کے محکمہ تعلیمات نے چند سال قبل ایسا ابتدائی مدارس کے تنظیم کی کوشش کی تھی جس میں انگریزی کو نصاب سے بالکل خارج کر دیا گیا اور کئی سال تک تعلیم صرف ملکی زبانوں میں دی جاتی تھی۔ مگر جو طلبہ ان مدارس میں نصاب ختم کر کے اینگلو ورناکیولر مدارس کی جماعتوں میں شریک ہونا چاہتے تھے اُن کی راہ میں چند مشکلات حائل ہوتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ بہرنوع اس صوبہ کے چند دیہی علاقوں میں والدین کی یہ خواہش ہے کہ اُن کے بچوں کو انگریزی سیکھنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں، تاکہ وہ زیادہ آسانی کے ساتھ تعلیم کی ثانوی منزل میں قدم رکھ سکیں۔ ابتدائی تعلیم کے مبحث کو ختم کرنے سے قبل میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے تحتانی تعلیم کے نظام میں کمیٹی نے جس خرابی اور اسراف کو پایا ہے وہ اس مُلک کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ میں نے انگلستان میں بھی اسی نوعیت کی شکایتوں کا ذکر کتابوں اور اخباروں میں پڑھا ہے۔ حال کے ایک مصنف نے لندن کے اعداد و شمار ۲۶-۱۹۲۳ء سے کر یہ بتایا ہے کہ اگرچہ والدین نے اپنے بچوں کو سولہ سال کی عمر تک مدرسہ میں رکھنے کا ذمہ لیا تھا

مگر بارہ یا تیرہ سال کی عمر سے سولہ سال کی عمر تک تعداد طلبہ میں برابر کمی ہوتی رہی اور سولہ سال کی عمر تک صرف ایک ثلث تعداد باقی رہ گئی۔ ان میں سے دو ثلث طلبہ یا تو نصاب مدرسہ کی تکمیل کرنے یا کامیابی کے معیار تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ غرض کہ دوسرے ممالک کے حالات کا بالمقابل مطالعہ ہمارے اپنے نقائص پر غور کرنے میں ہمیں تسلی بخشتا ہے۔

ثانوی تعلیم کے نظام کے متعلق کمیٹی کی رائے ہے کہ باوجود صریحی نقائص اور مشکلات کے صحیح ترقی کے امید افزا آثار موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثانوی تعلیم کا نظام عموماً جامعہ کے نصاب کی تیاری کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ اور زیادہ تر جامعہ کی ضروریات کے ماتحت ہوتا ہے۔ کئی سال قبل حکومت مدراس نے اس امر کو ممکن تصور کیا تھا کہ سرکاری ملازمت کے لئے امتحان میٹرک کے معیار قابلیت کو ترک کیا جائے اور اس طرح جو طلبہ جامعات کے قابل نہ ہوں اُن کے رحجان کو دوسری طرف پلٹ دیا جائے۔ کچھ تو اس غرض سے اور کچھ ثانوی مدارس میں کل مدت تعلیم کے دوران میں طلبہ کی ترقی اور تحصیل کا ریکارڈ حاصل کرنے کی غرض سے سکول فائنل لیونگ سرٹیفکیٹ کا طریقہ جاری کیا گیا تھا۔ صوبہ ہذا میں سکول فائنل سسٹم کو ناکام سمجھنا چاہیئے۔ جامعاتی تعلیم سے ناقابل طلبہ کو ہٹا دینے میں یہ طریقہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ اکثر والدین اس بات کے متمنی ہیں کہ ان کے بچے علمی پیشوں یا سرکاری ملازمت میں داخل ہو جائیں۔ یہی خواہش خود انگلستان میں مزدور پیشہ اشخاص کی ہے۔ کہ اپنے بچوں کو تربیت یافتہ جسمانی محنت سے بچا کر اُن کے لئے کوئی سرکاری ملازمت حاصل کی جائے۔ جامعاتی تعلیم سے طلبہ کی رُوگردانی محض اُن کی ناکامی اور اقتصادی کشمکش کے تجربہ کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ اسکول فائنل کا طریقہ کوئی اطمینان بخش ابتدائی نصاب فراہم کر کے طلبہ کو کسی پیشہ کے قابل بنانے میں بھی کامیاب نہیں رہا۔ امتحان سکول فائنل جو ثانوی مدارس میں طلبہ کے تحصیل علم اور ترقی کی آزمائش کی غرض سے صوبہ بھر میں لیا جاتا ہے۔ ایک نہایت ہی اہم معاملہ ہے۔ ان امتحانوں میں شریک ہونے والے طلبہ کی تعداد قدیم امتحان میٹرک کے امیدواروں سے بہت زیادہ ہے۔ قلیل التعداد ممتحنوں کا اس قدر کثیر تعداد طلبہ کا امتحان لینا بلحاظ نتائج لازمی طور پر ناقابل تشفی ہے۔ امتحان کی تمام برائیاں مقرر کردہ ممتحنین

اور امتحان دینے والے اُمیدواروں کی تعداد کے تناسب سے اور بھی اہم معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ آیا صوبہ کو پانچ یا چھ علاقوں میں تقسیم کر کے ہر ایک علاقہ کا امتحان علٰحدہ علٰحدہ لینے سے امتحان کی بُرائیاں کم ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ صوبہ ہذا میں امتحان سکول فائنل کے حاصل کردہ نشانات سے جامعہ میں داخلہ کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا امتحان سکول فائنل کی بُرائیوں میں سررشتہ کے اختیار کردہ طریقہ "تادرشین" سے کمی ہو رہی ہے یا اضافہ۔ نصاب جامعہ کے زمانہ میں طلبہ کا ایک ایک جماعت میں کئی کئی سال تک پڑا رہنا یا تو نظام تعلیم ثانوی کے غیر مؤثر ہونے کا ثبوت ہے؛ یا جو طلبہ کلیہ کی تعلیم کی غرض سے ثانوی نصاب کی تکمیل کرتے ہیں، اُن میں سے اکثر کی ناقابلیت کی دلیل ہے۔ جو طلبہ جامعہ کے نصاب کی تکمیل کامیابی کے ساتھ کرتے (یعنے سند حاصل کر لیتے) ہیں، افسوس ہے کہ وہ بھی کئی لحاظ سے ناقص ہیں۔ ایک اوسط درجے کے طیلسانی کے انگریزی کی معلومات میں نہ صرف نمایاں کمی ہوتی ہے؛ بلکہ لبرل ایجوکیشنل کے ضروری اجزا میں قابل افسوس نقص پایا جاتا ہے۔ انھیں کائنات کی عام اشیاء سے دلچسپی کم ہوتی ہے۔ اور تعلیمی جدت آفرینی اور ذوق مطالعہ بھی نہیں ہوتا اُن کا مطالعہ مقامی اخباروں یا چند ایک ناولوں سے شاذ و نادر ہی آگے بڑھتا ہے۔ املا اور صرف و نحو کی غلطیوں سے پاک ہونا طیلسانین کے لئے کوئی عمدہ صفت نہیں ہے۔ اگر مضامینِ تعلیم کے وسیع کرنے یا معیار امتحان کے بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو فوراً ہی اخبارات میں اور خود جامعہ کی مجلس اعلیٰ میں احتجاج کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ ماہرین کی رائے اس نقطۂ نظر کی طرف مائل نظر آتی ہے کہ قصور کلیہ کے طریقۂ تعلیم کا نہیں ہے۔ بلکہ ثانوی تعلیم کا ہے۔ لہذا یہ سوال کہ ثانوی تعلیم کے نظام کو کس طرح ترقی دی جائے۔ اُن اہم ترین مسائل میں سے ہے، جن پر آپ کو غور کرنا ہے۔ ثانوی تعلیم کے نظام کی ایک خرابی جو تقریباً آج تک باقی ہے وہ یہ ہے کہ طلبہ ایسی عمر میں انتخاب مضمون کے لئے مجبور ہوتے ہیں جب کہ ان میں عقل سلیم نہیں ہوتی۔ اور خود فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ کون مضمون اختیار کریں۔ اپنے زمانۂ تعلیم کے ایسے ابتدائی دور میں طالب علم جو انتخاب کرتا ہے، اُس سے زیادہ تر کلیہ کی تعلیم کے مضامین

اختیاری کا انتخاب قبل از وقت ہو جاتا ہے۔

اس میں بہت کچھ اعتراض کی گنجائش ہے کہ آیا مضامین کے انتخاب کے مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے یا نہیں۔ اور کیا یہ قرین مصلحت نہیں ہے کہ ایک اوسط درجہ کا طیلسانی کسی ایک مضمون میں خاص معلومات حاصل کرنے اور دیگر تمام مضامین سے نابلد رہنے کے عوض ان تمام مضامین کی عام معلومات ایک مقررہ حد تک حاصل کرے جو لبرل ایجوکیشن کے نصاب کے لئے ضروری ہیں۔ حال میں جامعۂ مدراس اور سکنڈری سکول لیونگ سرٹیفکٹ بورڈ نے ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

فنِ تعلیم کے ماہرین کے نزدیک شاید سب سے اہم مسئلہ یہ ہوگا کہ کس طرح تعلیم اور روزگار میں ربط و تعلق پیدا کیا جائے۔ تعلیم یافتہ طبقوں میں بے روزگاری کا سوال نہایت سخت ہے۔ ہندوستانی جامعات سے ہر سال جو سینکڑوں طیلسانین تیار ہو کر نکل رہے ہیں، اُن کی کھپت تو سرکاری ملازمت ہی میں ہو سکتی ہے اور نہ دیگر علمی پیشوں میں۔ یہ مشکل اُن نوجوانوں کی راہ میں حایل نہیں ہے جنہیں اچھے ذرایع حاصل ہیں۔ یا خود اُن میں خداداد جوہر قابل موجود ہے۔ ساری مصیبت اوسط درجے کے طیلسانی کے لئے ہے جو بہت دیر کے بعد معلوم کرتا ہے کہ اُس کی کلیہ کی تعلیم پر وقت اور روپیہ بیکار صرف ہوا۔ گو سرکاری ملازمت اور علمی پیشے اب بھی جاذب توجہ ہیں۔ اوسط درجے کا طیلسانی اس پر بھی راضی ہے کہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے جو کافی ذریعۂ معاش بہم پہنچانے میں مُمد ہو۔ لیکن بسا اوقات وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے موزوں ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب تک دوسرے ہی پیشوں کے دلاویزی اُن میں کام کرتی رہی۔ ہمارے نوجوانوں کی کثرت اور ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر یہ ضروری ہے کہ ان کو صنعتی۔ تجارتی یا زراعتی زندگی کی طرف متوجہ کیا جائے اور انہی مقاصد کی تعلیم دی جائے۔ اِن اغراض کے لئے ثانوی تعلیم کا درست نصاب شاید کافی اور ضروری سمجھا جائے گا۔ ثانوی تعلیم کے نظام کی اصلاح اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے مختلف شعبوں کا قیام دَورِ موجودہ کی اہم ترین ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اسی سے متعلق میں اپنے نظامِ تعلیم کے ایک زبردست اور اہم نقص کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں

قطع نظر اُن صورتوں کے جب کہ کوئی نوجوان اپنا آبائی پیشہ اختیار کرتا ہے، وہ اِس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وُہ کس پیشہ کا انتخاب کرے اور اُس کی تربیت پائے۔ ایک وسط درجہ کا لڑکا اتنا شعور ہی نہیں رکھتا کہ وہ اپنے طبیعت کے میلان کو معلوم کرے بلکہ وُہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی پیشہ میں وُہ بھلا یا بُرا کام کر سکتا ہے۔ یہی حال اُن کے والدین کا ہے۔ وُہ بھی اپنے بچوں کے میلانِ طبع کے دریافت کرنے کے قابل نہیں ہوتے اگر کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اپنی اولاد کو کسی فیصلہ پر پہنچنے میں مدد دے تو وہ مُدرس ہی ہو سکتا ہے ساتھ ہی یہ بھی بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ اکثر مدرسین بھی کوئی مفید مشورہ پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتے. نفسیاتی آزمائشوں یا دیگر ذرائع سے طلبہ کے رحجانات کو دریافت کرنے کا مسئلہ امریکہ کے ماہرینِ تعلیم کو متوجہ کئے ہوئے ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ انگلستان کے تعلیمی حلقوں میں بھی یہ مسئلہ جاذب توجہ بن رہا ہے۔ مجھے یہ ثانوی مدرسہ کے مُدرس کی اہم ترین ذمہ داری معلوم ہوتی ہے مگر یہ ایسی ذمہ داری ہے جس کے انجام دینے کی اُس کو تعلیم نہیں دی گئی۔ یہ ہماری سررشتہ ہائے تعلیمات کا کام ہے کہ شخصی رحجانات کے مطالعہ کے لئے یا تو ماہرین کو باہر سے بلائے یا مدرسین کو اُن ممالک میں جہاں ایسی تعلیم دیجاتی ہے بھیجنے کا انتظام کرے۔

اگر ثانوی تعلیم اُس عام تعلیم کی حد تک ہونے والی ہے جس کو اکثر نوجوان پانے کے خواہش مند ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ایسی تعلیم مضبُوط بنیادوں پر قائم کی جائے اور اس طرح اُستوار بنائی جائے کہ جو ضروریات لبرل ایجوکیشن کی ہیں پُوری ہو سکیں۔ یعنے طلبہ کے ماحول میں دلچسپی پیدا کی جائے؛ اُن کے علمی تحقیق اور تجسس کو اُبھارے؛ اُن کے قوای دماغی کو وسعت دے اور اُنہیں مفید شہری بنائے۔ اِن مقاصد کے حصُول کے لئے ضرورت ہے کہ ثانوی نصاب تعلیم کو وسعت دی جائے اور چند لازمی مضامین شامل کئے جائیں. بہر حال کسی صورت میں بھی نظام تعلیم کی اصلاح ہونی چاہئے۔

تعلیمی تجسس اور تحقیق کی سپرٹ کے اُبھارنے کا ایک نہایت قیمتی ذریعہ نیچر اسٹڈی اور سائنس کی تعلیم ہے۔ ثانوی مدارس میں سائنس کے ماتحت جو مضامین سکھائے جاتے

ہیں وہ طبعیات اور کیمیا ہیں ۔ مدارس کے معملوں میں کسی قدر عملی کام کیا جاتا ہے۔ میرے ہائی اسکول میں سائنس کے نتائج سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ طلبہ میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ بطور خود مشاہدہ اور مطالعہ قدرت کرسکیں گو میرے مدرسہ میں سامان کی کمی نہیں ہے اور نہ سائنس کے مدرسین اوسط سے کم درجہ کے ہیں ناکامی کے اسباب مجھے کچھ تو طریقۂ تعلیم میں۔ کچھ مضامین مشمولہ کی نوعیت میں اور کچھ خود مدرسین کی ناکافی تعلیم و تیاری میں نظر آتے ہیں۔ میں اس قدر خوش نصیب نہیں رہا کہ کسی ایسے مدرسہ کو دیکھتا جہاں نیچر اسٹڈی کا مضمون کامیابی کے ساتھ پڑھایا جاتا ہو۔ یا خود مدارس نے نیچر اسٹڈی سے نمایاں طور پر رغبت ظاہر کی ہو۔ میری تمنا ہے کہ سائنس کی تعلیم جان براؤن صاحب کی کتاب موسومۂ "مدارس میں سائنس کی تعلیم" میں جس طریقہ پر بتائی گئی ہے ہمارے مدارس میں بھی دی جائے۔ سکنڈری سکول لیونگ سرٹیفکیٹ بورڈ نے ابتدائی سائنس کا جو نیا نصاب تیار کیا ہے۔ اُس میں طبعیات اور کیمیا کے وہ مضامین شامل ہیں جو نباتات، حیوانات، تشریح بدن اور حیاتیات سے متعلق ہیں نیچر اسٹڈی کی کامیاب تعلیم کی طرف پہلا قدم خود مدرسین کی تربیت ہے اگر نتائج کے لحاظ سے ٹیچرس کالج کو دیکھا جائے تو اس امر میں بڑے شک وشبہ کی گنجائش ہے کہ آیا ٹیچرس کالج اپنا کام خوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی اجازت ملنی چاہئے کہ میں نے یہ شکائتیں سُنی ہیں کہ طبعیات اور کیمیا کا نظر ثانی کیا ہوا نصاب نہایت سخت اور اصطلاحی ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ شکایات بے بنیاد نہیں ہیں۔

ہارٹوگ کمیٹی نے معائنہ کرنے والے عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ کی ضرورت پر زور دیا ہے اگر مدارس میں تعلیم پر مناسب نگرانی رکھنی ہے۔ تو ہر مدرسہ کے معائنہ کے لئے اَب سے زیادہ وقت دینے کی ضرورت ہے بہر حال نہ صرف معائنہ کرنے والے عہدہ داروں کی تعداد میں زیادتی کی ضرورت ہے بلکہ ان کی قابلیتوں میں بھی معقول اصلاح ضروری ہے۔ میں ایسے انسپکٹروں کو جانتا ہوں جو مدرسہ کے مضامین میں سے کسی ایک کے خصوصی ماہر تھے اور اسی لئے اس مضمون کی تعلیم میں انہیں زیادہ دلچسپی تھی۔ معائنہ

کرنیوالے افسروں کی رپورٹوں سے پتہ چل سکتا ہے کہ کم وبیش وہ لکیر کے فقیر ہیں اور اُن کی رپورٹیں دقیانوسی اس کی اُمید نہیں کیجاتی ہے کہ کسی ناظم تعلیمات یا یونیورسٹی کمیشن کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ تعلیم گاہوں کی نسبت ظاہری حالت کے علاوہ جو عمارت مکانیت. کتب خانوں اور معملوں وغیرہ سے متعلق ہے اور کسی ذرائع آزمائش سے کام لے کر کوئی رائے قائم کر سکے۔ اگر معائنہ کے حقیقی کام کو مؤثر اور کارآمد بنانا ہے۔ تو ایسے اشخاص کے تفویض کیا جائے۔ جو مدارس ثانویہ کے نصاب میں "ہرفن مولا" کہلانے کے مستحق ہوں۔ اور جو خود نمونہ کے اسباق اور امور مدرسہ میں مشورہ دے سکتے ہوں۔

مدرسوں اور کالجوں دونوں کے معیار کی اصلاح میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ مدارس ثانویہ میں طلبہ ایک ایک جماعت میں کئی کئی سال تک پڑے رہتے ہیں جس کا اصلی سبب یہی ہے کہ ناقابل طلبہ کو شاید کسی حد تک والدین کے مجبور کرنے اور بڑی حد تک طلبہ کی فیس اور آمدنی کی خاطر شرکت کا موقع دیا جارہا ہے۔ چند ہی امدادی مدارس ایسے ہوں گے، جو ناقابل طلبہ کو سختی سے روک کر تحصیل علم کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے میں اس ذریعۂ آمدنی کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ہماری جامعات کو بھی اپنی زندگی کے لئے امتحان کی فیس پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دوسری چیز جو مجھے مدارس کے مفید ہونے پر ردِ عمل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ترغیب وتحریص ہے جس کے باعث طلبہ مختلف سماجی اور سیاسی مشغلوں میں مصروف نظر آتے ہیں میں یہاں غلط فہمی سے بچنا چاہتا ہوں۔ بیشک یہ ضروری ہے کہ مدرسہ کی تعلیم طالب علم میں سماجی خدمت اور شہری ذمہ داری کوٹ کوٹ کر بھر دے اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے تحریک کشافی قابل تعریف طریقہ پر اختیار کی گئی ہے سماجی بہبود کے لئے کسی قسم کے کام میں طلبہ کا دلچسپی لینا مجھے قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتا بشرطیکہ یہ سب کام مدرسین کے زیر ہدایت ہو اور طلبہ کو تعلیم سے منحرف اور برگشتہ نہ ہونے دے۔ مجھے اس سے رنج ہے کہ طلبہ قیمتی وقت کو قابل افسوس طریقہ پر برباد کرتے ہیں۔ اور گہرے مطالعہ کی عادت ڈالنے، کسب کمال وکسب علم اور ضبط نفس کے مواقع سے جو مدارس اور کالجوں میں فراہم کئے جاتے ہیں غفلت برت رہے ہیں۔ شاید میرا

بیان غلط ہو، یا دقیانوسی خیال کیا جائے۔ لیکن میں نے متعدد مدرسین اور پروفیسروں کو آج کل کے طلبہ کی زندگی کی خصوصیات کے متعلق یہی رائے ظاہر کرتے ہوئے سنا ہے
میں نے اپنے بیان کو متوسط قوائے دماغی رکھنے والے طلبہ کی تعلیم کے چند پہلوؤں تک محدود رکھا ہے۔ جو مجھے سوسائٹی کے لئے بمقابلہ اندھوں۔ بہروں۔ جرائم پیشہ اور ناقص القویٰ طلبہ کی تعلیم کے بہت زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ اب مجھے ایسے مضامین پر روشنی ڈالنا چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ جیسے لڑکیوں کی خصوصی تعلیم۔ غیر فرقہ وارانہ مذہبی تعلیم کے طریقہ کا قابل عمل ہونا اور اس کی تفصیل۔ غیر اوقات مدرسہ میں مدرسین کی مصروفیتیں۔ یا تعلیم بالغاں وغیرہ۔ حرفتی تعلیم کے متعلق میں صرف ایک بات کہوں گا۔ اور وہ یہ کہ صنعتی کارخانوں اور حرفتی تعلیم گاہوں کے منتظمین میں اتحاد عمل پیدا کرنا ضروری ہے۔ تاکہ عملی تعلیم اور آیندہ روزگار کے لئے سہولتیں حاصل ہوں۔
اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ کہ آپ کا فڈریشن تعلیم کے اِن مسائل پر اور اِن کے علاوہ اور دوسرے بہت سارے مسائل پر توجہ کرے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کا فڈریشن اپنے پیش نظر انہیں نمونوں اور اسی لائحہ عمل کو رکھے گا جیسا کہ امریکہ کی تعلیمی کونسل کا ہے۔ امریکہ کی تعلیمی کونسل اپنی چند سالہ زندگی میں بہترین کام کرتی رہی ہے۔ میں نے تعلیم کے ان پہلوؤں پر بحث نہیں کی ہے۔ جو پیشۂ معلمی کے حقوق کی حفاظت اور ترقی سے متعلق ہیں۔ قابل طلبائین کو پیشۂ معلمی کی طرف راغب کرنے کے لئے ان کو معقول مشاہرہ دینا۔ اور اُن کے لئے زندگی میں معقول میدانِ عمل پیدا کرنا ضروری ہے لیکن آپ کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مدرس کی مقابلتہً کم تنخواہ اِس ملک ہندوستان کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ انگلستان۔ یورپ اور امریکہ میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں امریکہ کی تعلیمی کونسل کے سالانہ اجلاس میں بیان کیا گیا تھا کہ نہ صرف ثانوی مدارس بلکہ کالجوں میں بھی جو تنخواہیں مدرسین کو دی جاتی ہیں، وہ نہایت ہی قلیل ہیں۔ مدرس کی حیثیت کو ترقی دینے کے لئے جو کچھ کوشش آپ کریں۔ اُن میں ایک خطرہ لگا ہوا ہے۔ جس کا انسداد کرنا ضروری ہے میرا اشارہ تجارت اور تجارتی اتحاد کی اسپرٹ کے داخل کرنے کے خطرہ کی طرف ہے۔ اپنے اراکین

کے حقوق کی حفاظت کرنے کی خواہش میں تجارتی اتحاد اپنی حفاظت میں نہ صرف قابل افراد کو لیتا ہے۔ بلکہ ناقابل افراد کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ رکنیت کے لئے آپ جو کچھ بھی معیار مقرر کریں۔ اس کا اندازہ صرف خارجی آزمائشوں سے ہی ہو سکتا ہے۔ لہذا آپ کی مجالس کے اراکین میں اکثر چند ناقابل افراد شامل پائے جائیں گے۔ جیسا کہ دوسری تمام جماعتوں میں ہوتا ہے۔ اس ملک میں پیشۂ معلمی ہمیشہ بڑی عزت سے دیکھا گیا ہے۔ سوسائٹی میں اِن کا رتبہ اُن کی تنخواہوں پر منحصر تھا۔ اور نہ ہونا چاہئے۔ لہذا مدرسین کو کوئی کام ایسا نہ کرنا چاہیئے جس کو دنیا کے اس شریف ترین پیشہ کے نمونوں اور روایتوں کے منافی اور باعث ذلت خیال کیا جائے۔

تعلیم دستکاری

از مولوی اللہ بخش صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

وسیع معنوں میں دستکاری سے یہ مراد ہے کہ ہمارا دماغ جن باتوں کی ہدایت کرتا ہے اُن کو ہم اپنے ہاتھ کے ذریعہ سے بہ تمام و کمال عملی صورت میں پیش کریں اور یہ اصطلاح ہاتھ کے ہر ایک باقاعدہ استعمال پر صادق آتی ہے چاہے وہ خطاطی ہو یا اور کسی قسم کی صنعت اصطلاح عام میں دستکاری عموماً انہیں چیزوں تک محدود ہے جو مختلف مادی اشیاء کے ہاتھ کے ذریعہ بنائی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ دستکاری بچوں کو اُن چیزوں کے بنانے میں مدد دیتی ہے جن کو وہ بنانا چاہتے ہیں اور اسی کی وساطت سے اُن کی دستی کاریگری نشوونما پاتی ہے اور اُن میں ایک قسم کی دماغی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو کسی اور چیز سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس سے نہ صرف ان کی صنعتی حس ترقی پاتی ہے بلکہ مادی اشیاء کو برتنے کی مہارت اور اچھی اور بُری صنعت میں تمیز کرنے کا مادہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ رفتہ رفتہ اس امر کو محسوس کر لیتے ہیں کہ دستکاری ایک نہایت ہی منفعت بخش ہنر ہے۔

مدرسہ میں دستکاری کی اہمیت مدرسہ میں دستکاری کی اور بھی اہمیت ہے۔ بہت سے

لڑکوں میں ذہنی تصور کا مادہ مفقود ہوتا ہے اور صرف وہ مادی اشیاء کی مدد سے تعلیم پا سکتے ہیں خصوصاً بچوں کے لئے تقریباً نصاب تعلیم کے ہر ایک مضمون میں جب تک دستکاری سے کام نہ لیا جائے اُس مضمون کی اصلیت اُن کے ذہن نشین نہیں ہو سکتی اس طرح سے علم ریاضی میں دستکاری کے ذریعہ سے بچوں کے دماغ میں اعداد۔ طول و عرض موٹائی۔ خواص اور تناسب کا صحیح اور اصلی تصور قائم ہو سکتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جن کی مدد سے بچے اُن حسابی طریقوں کی معقولیت کو جنہیں وہ مسائل کے حل کرنے میں استعمال کرتے ہیں تسلی بخش طور پر سمجھ جاتے ہیں۔ اور یہی چیز اُن کے ذہن کو نئے نئے مسائل کی جانب منتقل کرتی اور اُن کے لئے آگے راستہ صاف کر دیتی ہے۔ عموماً ہر ایک مضمون میں اشیاء کی جو تصویریں لڑکوں کے دماغ میں ہوتی ہیں وہ دستکاری کی مدد سے اس طرح صاف واضح اور ذہن نشین ہو جاتی ہیں کہ پھر وہ اُن کو عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ خصوصاً دستکاری خود اعتمادی کی قوت کو بڑھانے اور مستقل مزاجی سے کام کرنے کی عادت پیدا کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔ یہی خاصیتیں ہیں جن سے ہر ایک کام کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہو سکتا ہے اور وہ انسان کو لائق داد و قابل ستائش بناتی ہیں۔ دستکاری سے انسان کو اپنی طبیعت کے جوہر دکھانے کے عمدہ مواقع ہاتھ آتے ہیں اُس میں اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی قوت ارادی میں بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ دست کاری کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ وہ کام میں صحت و درستی کی اہمیت کو بچوں کے ذہن نشین کرا دیتی ہے کیونکہ ٹھوس اشیاء میں جو اسقام رہ جاتے ہیں وہ آسانی سے پہچان لئے جاتے ہیں۔

دستکاری کا تعلق مصوری کے ساتھ دست کاری اور مصوری کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ اُن مصورانہ خیالات کو جو لڑکوں کے دماغ میں اسباق یا نقشہ کشی کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں ٹھوس اشکال میں ڈھالنے کے لئے بے شمار مواقع بہم پہونچاتی ہے۔ ابتدا ہی سے ان کو دستکاری اور مصوری کے ذریعہ سے ایسی تعلیم دینی چاہیئے کہ ان میں رنگ اور شکل کی خوبصورتی کو سمجھنے اور جس مصالحہ سے اشیاء بنائی جاتی ہیں اس کو جانچنے اور ہنرمندی کے ساتھ استعمال کرنے کا صحیح مذاق پیدا ہو جائے اور وہ خود بخود اس امر کا احساس کرنے لگیں کہ ایک عمدگی

سے بنی ہوئی چیز جو اُس غرض و غایت کو جس کے لیئے وہ بنائی گئی ہے پورا کرسکتی ہے صرف یہی بلکہ یہ بھی محسوس کریں کہ جو چیز شکل و صورت اور تناسب کے لحاظ سے بے نقص ہو جائے خود ایک ایسی خوبصورتی سے متصف ہے کہ اس کو اور کسی ظاہری آرائش کی ضرورت نہیں نہیں حاجت تصنع کی اُسے جو خود مکمل ہے کہ دیکھو خوشنما لگتا ہے کیا چاند بن گہنے

تعلیم دستکاری کے مدارج | انگلستان اور امریکہ میں یہ امر متفقہ طور پر طے ہو چکا ہے کہ دستکاری کی تعلیم لڑکوں کو ایلیمنٹری اسکول کا زمانہ ختم ہونے تک برابر اور مسلسل دی جائے۔ اس تسلسل کو قائم رکھنے کی غرض سے تمام مدرسہ کا نصاب دستکاری ہر ایک مدرس کے پاس رہنا چاہیئے کیونکہ ہر ایک مدرس کو صرف یہی معلوم ہونا کافی نہیں ہے کہ اس کو اپنی جماعت میں کیا سکھانا چاہیئے بلکہ اس کو اس سے بھی بخوبی واقف رہنا چاہیئے کہ نیچے کی جماعتوں میں بچوں سے کیا کام کروایا گیا ہے۔ اور اوپر کی جماعتوں میں وہ کیا کام کریں گے نصاب دستکاری دو درجوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے ایک گیارہ سے لے کر بارہ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے اس وقت تک جب کہ وہ ابتدائی مدرسے سے دوسرے مدرسے میں داخل ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ اُس کل مدت کے لئے جب کہ وہ مدرسے کی تعلیم سے فراغت حاصل کرلیں۔ ابتدائی یا تحتانیہ درجے میں لڑکا پہلے پہلے کھیل یا عملی تجربہ کے ذریعہ سے بہت سی کارآمد مادّی اشیاء کی ماہیت و خواص سے واقف ہو جاتا اور اس امر کا پتہ لگا لیتا ہے کہ وہ مادّی اشیاء کن چیزوں کی ساخت میں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اسی درجے کے آخری حصہ میں ہاتھ کے استعمال کے ساتھ ساتھ آلات و اوزار سے بھی کام لینے کی ابتدا کر دینی چاہیئے ناپ اور پیمائش کی صحت و درستی پر اس زمانے میں چنداں زور دینے کی ضرورت نہیں رفتہ رفتہ خود لڑکوں میں اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی زیادہ عرصے تک صرف یہی امر مرکوز خاطر رہے کہ لڑکے جس غرض کے لئے جو چیز بناتے ہیں اس سے وہ غرض کہاں تک پوری ہوسکتی ہے۔ درجۂ فوقانیہ میں ایسی مادّی اشیاء سے کام لینا چاہیئے جن کو دستکاری میں استعمال کرنے کی مہارت حاصل کرنے کے لئے زیادہ قوت اور محنت کی ضرورت ہو اور ہر چیز میں صحت و درستی اور ساخت کی خوبی اور عمدگی کا بہ تمام و کمال لحاظ رکھا جائے۔ کسی چیز کے بنانے میں لڑکے جو کوشش کرتے

ہیں اُن کی یہ کوشش صرف اسی حد تک محدود رہے کہ جو مصالحہ دستیاب ہو سکتا ہے اُس سے اُس چیز کو تشفی بخش طریقہ پر بنالیں۔ لڑکوں کو ساخت اشیا میں اسی حد تک جدّت و اختراع سے کام لینے کی ہدایت دی جائے کہ جس خاص مقصد کے لئے جو چیز بنائی جاتی ہے اُس سے وہ غرض بطریق احسن پوری ہو سکے۔ تحتانیہ درجہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کے کام میں سوائے اس کے کہ لڑکیوں کو سوئی کا کام سکھایا جائے اور کوئی فرق نہیں کرنا چاہیئے۔ اُوپر کے درجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے کام میں عموماً فرق ہونا چاہیئے اور لڑکیوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر بجائے ان دستکاریوں کے جو لڑکوں کے لئے رکھی گئی ہیں لڑکیاں امور خانہ داری سے متعلق دستکاری اور سوزن کاری سیکھیں طبقہ فوقانیہ کو خاص سازوسامان اور آلات و اوزار کی ضرورت ہے اور عموماً اس کے لئے خاص عمارتیں ہونی چاہئیں جہاں لڑکے باری باری سے اپنے اپنے اوقات میں مدارس سے جاکر کام کریں اس کے یہ معنی نہیں لینے چاہئیں کہ دستکاری اُن کے درسی نصاب کا جزو لاینفک نہیں ہے دستکاری کے بہترین نتائج اُسی وقت رُونما ہوں گے جب کہ مدرسہ کے عام نصاب میں اور اس میں چولی دامن کا ساتھ رہے۔ دستکاری کا مرکز جہاں تک ممکن ہو مدرسہ سے قریب رہے اس وقت بھی جب دستکاری کی تعلیم مدرسہ سے کسی قدر دور مرکز میں دی جائے ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ ہمیشہ مدرسہ اور دستکاری کے مرکز میں اتحاد عمل قائم رہے۔ اس کی ذمہ داری ایک جانب تو صدر مدرس پر اور دوسری جانب عملہ مدرسین پر عائد ہونی چاہیئے۔ یہ لوگ اس کو مدرسہ ہی کے کام کا ایک شعبہ تصور کریں اور وقت بوقت جب لڑکے مصروف بکار ہوں ان کے کام کا معائنہ کرنے کی غرض سے مرکز دستکاری کو جایا کریں اور معلم دستکاری کا بھی یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ مدرسہ میں جاکر لڑکوں کی دیکھ بھال کیا کرے اگر اس طریقہ پر کام کیا جائے تو مدرسہ اور مرکز دستکاری دونوں میں قوی اتحاد عمل پیدا ہو سکتا ہے۔

طبقہ تحتانیہ

سالہائے ابتدائی جماعت صغیر کی دستکاریوں کے متعلق بہت کچھ معلومات بہم پہنچائی

گئی ہیں جس سے غالباً مدرسین کا ایک بڑا طبقہ واقفیت رکھتا ہے یہاں صرف امور ذیل کی جانب توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

(الف) اِس زمانے میں بچہ خصوصاً اپنے تجربہ اور عملی تجربات سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ اپنی عمر کے بالکل ابتدائی زمانے ہی سے وہ اپنے ماحول کی چیزوں کی ماہیت وحقیقت کو دریافت کرنے کی غرض سے اپنے ہاتھ کو کام میں لاتا ہے۔ مادّی چیزوں کو برتنے سے اس کو اپنی قوتوں کا احساس ہوتا ہے اور اس کو اس امر کی واقفیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اُن سے کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا اور اس طریقہ پر مادّی اشیاء کے اُس علم کی بنیاد قائم ہوتی ہے جو آئندہ چل کر اس کی جبلّی خصوصیات میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ مدرس کا کام ہے کہ مناسب اور موزوں وقت نئے نئے اشیاء اس کے سامنے پیش کر کے اس کے تجربہ کو وسیع کرے۔ اس سے پہلے ہی بچے کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس خصوص میں اپنی معلومات کو استعمال کرے کہ مادّی اشیاء سے کونسی چیزیں بنائی جا سکتی ہیں جن سے اس کی خیالی دُنیا اصلی صورت میں پیش ہو جائے اور معلم کا یہ کام ہے کہ بچوں کی فطرتی اُپج اور آزادی میں مداخلت نہ کرے بلکہ اُن کو اپنے خیالات کو عملی صورت میں ظاہر کرنے کے بہتر طریقے تبلائے پھر کچھ عرصہ کے بعد معلم بچوں کو اشیاء کے متعلق جو کچھ وہ بنا سکیں نئے نئے خیالات کا مشورہ دے کر اُن کے تجربات کے دائرہ کو وسیع کر سکتا ہے۔

(ب) کل صنعتی کام میں بچے کو اس قسم کی آزادی دینی چاہیئے کہ وہ نہایت موزوں مصالحہ اپنے لئے انتخاب کرے یہ عقلمندی سے بعید ہوگا کہ دستکاری کو ان خاص خاص شعبوں میں تقسیم کر کے محدود کر دیا جائے جو استعمال شدہ مصالحہ پر منحصر ہوں مثلاً کاغذ کا موڑنا اور مٹی کے نمونے بنانا۔

(ج) پہلے اسباق بموجب فطرت وہ ہونے چاہئیں جن میں بچے خاص اپنے خیالات کو عملی صورت میں لانے کی کوشش کریں اگرچہ بچے کو اس امر کی اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنے طریقہ پر کسی چیز کو بنائے لیکن اُس کی کوشش کے ایسے نتیجہ کو جس میں کسی قسم کی مدد نہ کی گئی ہو مکمل سمجھ لینا بڑی غلطی ہے اس میں شک نہیں کہ لڑکے کو ترقی کے

راستہ پر لگانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کو اپنی ذات سے عملی تجربہ کرنے کا موقع دیا جائے لیکن جب دورانِ تعلیم میں اس کو اپنے اسقام سے آگاہ نہ کیا جائے تو اس قسم کے جس قدر موقعے دئے جائیں گے اور جس قدر وقت اس کی تعلیم میں صرف ہوگا وہ سب بے کار ثابت ہوگا۔ اس کے کام کا مقابلہ اس کے معلم یا اس کے ہم جماعتوں کے کام سے کیا جائے اور ہم جماعتوں سے اس کے کام کی تنقید کروائی جائے تاکہ وہ اپنی ذاتی کوشش کی اصلاح کر سکے آزادانہ طریقۂ اظہار (FREE EXPRESSION) کے ہمیشہ یہ معنے نہیں ہیں کہ بچّوں کو اجازت دیدی جائے کہ وہ بغیر رہنمائی اور مشورہ کے جو چاہیں بنالیں۔

(د) اس کے بعد کے درجے میں ایسے اسباق ہوں گے جن کے ذریعہ سے معلّم جماعت کو بہ حیثیت مجموعی باقاعدہ اور معینہ تعلیم دیگا لیکن یہ صریح غلطی ہوگی کہ بچّے کی تعلیم کو صرف اسی حد تک محدود کردیا جائے کہ وہ مشغول کی کانتہ نقل کیا جائے اور معلم جو کرتا ہے خود بھی وہی کرے بلکہ چھوٹے بچّوں کو اکثر اس بات کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ چیزوں کو بنانے میں اپنے ذہن اور دماغ سے بھی کام لیں۔

(ر) آخر میں ایسے اسباق دئے جائیں کہ بچے فرداً فرداً دی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

(س) دستکاری میں بچّوں کے گروہ یا ٹیم بناکر کام لینا خاص طور پر مفید ثابت ہوا ہے اس طرح سے بچّوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ بنالئے جائیں اور ہر ایک گروہ اپنے بہترین معلّموں کے زیر ہدایت کام کرے۔

زمانہ او اخر| جس وقت بچہ انفنٹ اسکول کو چھوڑتا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں اپنی ذاتی دستکاریوں کو نظرِ تنقید سے دیکھنے اور بھدّی چیزوں سے تنفّر ظاہر کرنے کا مادّہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے اس میں صحیح اور درست پیمائش اور ساخت اشیاء کی جانچ اور اس امر کے پتہ چلانے کی قوت پیدا کردی جائے کہ جو چیزیں دوسرے لوگ تیار کرتے ہیں وہ کہاں تک ٹھیک اور درست ہیں۔ اس زمانے میں دستکاری کو دو نوعیتوں

تقسیم کرنا چاہیئے پہلی نوعیت یہ ہے کہ ایک تو وہ اسباق سے مدد لے کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے دوسرے اپنے ذہن و تخیل سے چیزیں تیار کرے۔ دوسری نوعیت یہ ہے کہ چیزوں کو نمونہ یا ہدایات کے مطابق تیار کرے۔ عموماً نوعیت اول میں بچہ ان خیالات کو جو کسی سبق یا کہانی یا کسی ذاتی تجربہ کی وجہ سے اس کے دماغ میں پیدا ہو گئے ہیں ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے عموماً دبنے اور چکنے والے مصالحہ سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اس کو جس صورت میں چاہو آسانی کے ساتھ ڈھالا جا سکتا ہے اور اس میں پائداری کا لحاظ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اس قسم کا کام بعض وقت ایلیمنٹری اسکول کے تحتانیہ درجوں میں کمال درجہ عمدگی و نفاست سے ہوتا ہے لیکن نقص یہ ہے کہ معلمین صحت و درستی کے بارے میں اکثر ایک ادنیٰ معیار پر قناعت کر جاتے ہیں۔ اس عمر کے بچے بغیر کسی غیر معمولی کوشش کے نہایت صفائی کے ساتھ مٹی یا دیگر دبنے اور چکنے والے مصالحہ سے جو ان کے کام کے لئے موزوں ہو ایک پھل یا ایک برگدار ٹہنی یا اسی قبیل کی سیدھی سادی بنی ہوئی چیز کی کل تفصیلات کو دکھا سکتے ہیں۔ ہمیشہ معلمین کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ پہلے ہی کام میں بچے ترقی کے راستے پر لگ جائیں۔ بہت سے مدارس میں نوعیت اول کی دستکاری سے ان نمونوں کے بنانے میں کام لیا جاتا ہے جو تاریخ و جغرافیہ کے اسباق سے متعلق ہوں۔ مثلاً مقوے کا بنا ہوا قلعہ یا کسی ملک کا طبعی نقشہ جو کسی قسم کے کاغذی گودے سے تیار کیا گیا ہو۔ بہ نسبت ان اشیاء کے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے مثلاً پھل یا ٹہنی وغیرہ یہ چیزیں علمی حیثیت سے زیادہ مفید و کارآمد ہیں۔

نوعیت دوم کی دستکاری میں بچوں کو اشیاء کے نقشے یا خاکے تیار کرنے کا موقع دیا جاتا ہے مثلاً بچوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ جس چیز کو بنانا چاہتے ہیں اس کا ایک سرسری خاکہ بنا لیں اور نیز ان سے ختم شدہ نمونے کے نقشے اور اس کی پیمائش کھنچوائی جاتی ہے اور اس طریقہ سے اسکیل ڈرائنگ کے آسان اصول ذہن نشین کرائے جاتے ہیں یا کسی چیز کو بنانے سے پہلے کاغذ پر اس کا نقشہ قائم کر لینے کی بہت اچھی تمہید اور طبقۂ فوقانیہ کے کام کا ایک ضروری جزو ہے۔

بعض مشکلات اس زمانہ میں جو تین عام مشکلات رونما ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔
پہلی مشکل جماعتوں کی تقسیم سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اسکول کے فوقانیہ طبقہ میں معمولی درسی جماعتیں اگر دستکاری کے لئے دو حصوں میں تقسیم کی جائیں اس وقت طبقۂ وسطانیہ میں بڑی اور غیر منقسمہ جماعتیں ویسی ہی رہینگی اس مشکل کے حل کرنے کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ قبل از قبل جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے لڑکوں کے گروہ پاٹیمین بنالی جائیں دوسری مشکل سربراہی سامان کی ہے یہ مشکل زیادہ طبقۂ تحتانیہ میں محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان چیزوں کے بنانے میں جن کی کوئی قیمت وصول نہیں ہوتی بہت سا سامان صرف ہوجاتا ہے سامان کی بچت اور کفایت کے متعلق مندرجۂ ذیل مشورے پیش کئے جاتے ہیں جو شاید مفید تصور کئے جائیں۔
(الف) حتی الوسع ردی سامان مثلاً پرانے مقوے دیوار کے کاغذ دھاتی پتر۔ تار اور لکڑی کی تختیوں کے ٹکڑے شیشوں کے ڈاٹ اور دھاگے کی چرخیاں استعمال کی جاسکتی ہیں۔
(ب) اس زمانے میں بھی ممکن ہو سکے تو حقیقت میں کار آمد اشیا مثلاً ٹوکریوں کی نبت کا کام۔ جالی دار اشیا اور بورے اور نمدے کے سلیپر جن کے تلے سن کی نبت کے ہوں مقوے کے ڈبے (دستانے اور کالر وغیرہ رکھنے کے لئے) روپیئے پیسوں کی تھیلیاں اور بائیں بنائی جانی جائیں۔
(د) سادہ جلد سازی بھی اس زمانے میں سکھائی جاسکتی ہے جس سے لڑکوں کو کاغذ اور مقوے کے استعمال کا معقول طریقہ معلوم ہوسکتا ہے۔
(ج) لکڑی کا ہلکا کام جس میں چھت سے نکلی ہوئی لکڑی کی پٹیاں آسانی کے ساتھ کام میں لائی جاسکتی ہیں یہ کام دس تا بارہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوسکتا ہے۔
تیسری دقت کلاس کے ساز و سامان کے متعلق پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ عموماً معمولی میزوں سے کام لینا پڑتا ہے حالانکہ اس کے لئے خاص اور آسانی سے ایک جگہ سے

دوسری جگہ منتقل کی جانے والی میزوں کی ضرورت ہے یہ دقت اس وقت رفع ہو سکتی ہے جب کام کرنے کا کمرہ مخصوص کر لیا جائے چھوٹے مدرسوں میں طبقۂ فوقانیہ اور تحتانیہ دونوں کے لئے ایک ہی کمرہ سے کام لیا جا سکتا ہے اور یہی کمرہ ضرورت کے وقت کلاس کے معمولی اغراض کے کام میں بھی آ سکتا ہے۔ ایک بڑی شہری مدرسے میں یہ ممکن ہے کہ ایک خاص کمرہ طبقۂ تحتانیہ کے لئے بھی رکھا جائے اور یہ کمرہ ایسا ہونا چاہئیے جہاں متعدد میزیں اور کرسیاں یا اسٹول یا بڑے مسطح ڈسک موجود ہوں۔ لیکن اگر یہ سامان نہ ہو تو ایسے میز کے تختوں سے بھی کام نکل سکتا ہے جو وقت ضرورت ایک معمولی ڈسک پر سے نکال کر دوسری ڈسک پر جمائے جا سکتے ہوں۔ اس کے علاوہ دیوار میں سامان رکھنے کے چند تابدان بنا لئے جائیں ایک یا دو بُن سنی شعلین اور ایک کلیے (کھریا) کا ڈبہ مہیا کر لیا جائے تو کافی ہے۔

نتائج حاصل شدنی بعد اختتام درجہ تحتانیہ اگر اس درجہ کے دوران میں تعلیم مکمل اور باقاعدہ ہوئی ہو تو درجہ مذکور کے ختم ہونے تک لڑکے میں اس قدر قابلیت پیدا ہونی چاہیئے کہ وہ ہر ایک چیز کا نقشہ بنانے اور اسکی پیمائش کرنے میں نہایت صحت و درستی کے ساتھ کام لے سکے۔ اور اس میں ایک مجوزہ نقشے اور ارتفاع کو سمجھنے کی پوری پوری اہلیت پیدا ہو جائے اس غرض سے کام کی ابتدا اس طرح کروائی جانی چاہیئے کہ نہ صرف لڑکے وہی چیزیں اور نقشے تیار کر لیں جن کو وہ بنانا چاہتے ہیں بلکہ قبل از قبل وہ یہ بھی سوچ لیا کریں کہ وہ ان چیزوں کی ساخت کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنے والے ہیں اور نیز خاکوں یا نقشوں کے ذریعہ سے جو کہ اسکیل کے مطابق کھینچے گئے ہوں ان چیزوں کے ڈیزائین بھی بنا کر بتلائیں یہ مسلسل طور پر کام کرکے ہاتھ پر پوری طور پر قابو حاصل کر لینے کی وجہ سے ان میں اس قدر استعداد پیدا ہونی چاہیئے کہ وہ زیادہ پائدار مصالحہ استعمال کر سکیں اور مختلف اوزاروں سے کام لے سکیں صرف یہی نہیں بلکہ نہایت صحت و درستی کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ نیز لڑکے میں اس قسم کی چیزیں تیار کرنے کا شوق اور صبر و استقلال سے کام کرنے کی عادت پیدا ہو جائے۔ (باقی آئندہ)

انسداد غیر حاضری

(از)

مولوی سید غلام محمود صاحب

صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج

خوشی کی بات ہے کہ مولوی سید غلام محمود صاحب نے ان دلچسپ مباحث پر قلم اٹھایا ہے جو ان کے دیرینہ تجربہ اور مشاہدات ذاتی پر مبنی ہیں اور جن سے ہر مدرس یا صدر مدرس کو آئے دن سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ یقین ہے کہ ناظرین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

غیر حاضری کا انسداد اس میں شک نہیں کہ صدر مدرسین کے لئے اہم اور صبر آزما مسئلہ ہے۔ کیونکہ جب تک مقامی اور مدرسہ کا ماحول ارتقائے مدارج طے نہ کرلے اس کا بالکلیہ انسداد ہوتا نظر نہیں آتا۔ لائق مضمون نگار نے جس تفصیل کے ساتھ انسداد کی تمام صورتیں پیش کی ہیں ان پر عمل پیرا ہونے سے حاضری جیسی چاہیے ویسی تو نہیں مگر تشفی بخش ضرور ہو جائیگی۔ مگر طلبہ کے سرپرست اور اولیاء کا کیا علاج! جو معمولی تقریب یا کام کاج کے موقعوں پر یا خانگی ضروریات کے سلسلہ میں بچوں کو گھر پر بٹھا رکھنا معمولی بات سمجھتے ہیں اور لطف یہ کہ اگر صدر مدرس اس معاملہ میں سخت ہے تو رخصت کے منظور کرانے میں ذاتی پیروی سے بھی دریغ نہیں فرماتے۔

دوسری اہم چیز مدرس کی شخصیت اور بچوں کی نبض شناسی ہے جو محض نفسیات کے مطالعہ یا ٹریننگ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ بڑی حد تک طبعی میلان پر منحصر ہے۔ ان پڑھ مائیں اصول نفسیات سے بالکل عاری مگر پڑھے لکھے مردوں سے زیادہ بچوں کی مزاج شناس ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے مدرسین کہاں سے لائے جائیں جو مشفقانہ برتاؤ اور فرائض شناسی کے ساتھ ساتھ ہر وقت اس ٹوہ میں

لگے رہیں کہ طلبہ کے طبائع اور غیر حاضری کے حقیقی اسباب کا پتہ چلائیں بہترین دل و دماغ کی کھپت تو اور سررشتوں میں ہو رہی ہے۔ رہے سہے تشنہ کام پیشۂ مدرسی کو جو اہم ترین پیشہ ہے اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ یہی غیر حاضری کے اسباب معالجہ کی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ مولوی محمد حسین صاحب جعفری نائب ناظم تعلیمات نے ڈنمارک کی تعلیم کا ذکر فرماتے ہوئے (حیدرآباد ٹیچر کی کسی پچھلی اشاعت میں) وہاں کے محکمہ تعلیمات کے تقررات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ جدید تقرر کے بعد کچھ عرصہ تک امیدوار کے کام کی خاص نگرانی کر کے اس کا پتہ چلا لیا جاتا ہے کہ اس پیشہ کے لئے وہ اہل ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں۔ بصورت ثانی امیدوار کو قطعی طور پر جواب دیدیا جاتا ہے۔ جہاں اس قسم کا انتظام ہو تو ظاہر ہے کہ تعلیمی حالت کیسی ہوگی۔ غرض کہ جہاں اور دشواریاں صدر مدرس کی راہ میں حائل ہیں وہاں ان صبر آزما حقائق سے بھی صدر مدرس کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

(شریک)

طلبہ کی غیر حاضری کا مسئلہ دن بدن غیر معمولی اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ اور شاید ہی کوئی خوش قسمت مدرسہ ایسا ہو کہ جہاں اسکی شکایت نہ ہو۔ ورنہ عام طور پر ہر مدرسہ اس کا شاکی نظر آتا ہے۔ اس کے وجوہ بظاہر دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعی تعداد کے ایک چوتھائی سے زیادہ طلبہ ہر مدرسے میں غیر حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اور بعض مدارس میں تو اس سے بھی اونچی تعداد غیر حاضر رہا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ باوجود انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے اصلاحِ حال کی کوئی تشفی بخش صورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات الٹا اثر یعنی شدد وشد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی جو نسخہ دفع مرض کے لئے تجویز کیا جائے۔ وہی اشتداد مرض کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ جس طرح ایک ہی مرض کی مختلف علتیں ہوا کرتی ہیں۔ اور بلحاظِ علل نسخوں میں اختلاف کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اسی طرح غیر حاضری کے اسباب بھی مختلف و متعدد ہوتے ہیں۔ جب تک مرض کی تشخیص کی طرح غیر حاضری کے سبب کی دریافت

عمل میں نہیں آئیگی۔ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوگی۔ اکثر مدارس میں اصلاح کی فوری و موثر تدبیر جسمانی سزا ہی سمجھی جاتی ہے اور زیادہ تر اسی پر عمل ہوا کرتا ہے حالانکہ تجربہ شاہد ہے کہ اس طریقہ عمل سے وہ نتائج مترتب نہیں ہوتے جن کی توقع کی جاتی ہے۔ اور ہوں بھی تو کیونکر مثلاً اس واقعہ کو لیا جائے کہ ایک مدرس صاحب ایک طالب علم کو غیر حاضری کی علت میں صدر مدرس صاحب کے پاس بغرض سزا ہی بھیجتے ہیں۔ جو محض ان ہی استاد صاحب کے آئے دن کی ناجائز سختی کے سبب غیر حاضر رہا کرتا ہے۔ اب اگر صدر مدرس صاحب رسمی طور پر اسباب غیر حاضری دریافت کرنے پر اکتفا کریں تو اس نادان طالب علم سے جو استاد کی سختی کے سبب اپنے جاہل رہنے کو ترجیح دیتا ہو کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ صدر مدرس صاحب کے سامنے جو قبل از قبل ہاتھ میں بید لئے تیور بدل کر بیٹھا ہوا استاد کی ناجائز سختی کو ظاہر کرنے کی جرأت کر سکے گا۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ صدر مدرس بید کی سزا دیتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ سخت سزا دینے کی پریشان کن دھمکی دی جاتی ہے۔ گویا امرت کی بجائے زہر کو بھی ناکافی سمجھ کر سم قاتل کے جز کو اس نسخے کا جزو لاینفک اور ازالہ مرض کا علاج واحد سمجھا جاتا ہے۔ اب ذرا اس واقعہ کے دوسرے پہلو کو بھی دیکھا جائے کہ اگر طالب علم جرأت کر کے صدر صاحب کے سامنے استاد صاحب کی ناجائز سختی کو دبے الفاظ میں بھی ظاہر کرتا ہے تو اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صدر صاحب یہی فیصلہ کریں گے کہ تم نے اپنے شفیق استاد کی بیجا شکایت کی جس کے سبب تم کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ آج استاد کی شکایت کی کل میری شکایت کرو گے۔ اس کے سوا تم سے اور کیا توقع ہوسکتی ہے۔ اگر غیر حاضری کی خطا معاف بھی کر دی جائے تو شکایت کا قصور معاف نہیں ہوسکتا۔ چلو ہاتھ بڑھاؤ اور سزا پاؤ۔ اگرچہ میں نے اس آخری جز کو امکان کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ مگر مجھ کو اس کے وقوع پذیر ہونے کا یقین اس لئے بھی ہے کہ بعض چشم دید واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ اب یہاں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طریقہ عمل سے غیر حاضری کا انسداد ہو جائے گا۔ مزید خرابیاں یہ پیدا ہوئیں کہ کم کر پہلے بچہ مدرس صاحب سے ڈر کر مدرسہ

نہیں آتا تھا تو اب صدر صاحب کے خوف نے اس کو اور بھی گریزپا کر دیا اور کوئی عجب نہیں کہ ان ہی صدر صاحب کو جنہوں نے اپنی دانست میں غیر حاضری کا کافی انسداد کر دیا تھا۔ چند ہی روز بعد غیر حاضری کی علت میں اسی طالب علم کا نام خارج کرنا پڑے۔ اور جب بچے کو اُستاد صاحب کی جائز طور پر شکایت کرنے کے سبب ناجائز سزا ملی تو اُس سے اِس کے اظہار حق کا قابل قدر جذبہ بلاوجہ پامال ہو گیا۔ اور اس کی بجائے اُس میں بزدلی اور دروغ گوئی کی مذموم تحریک پیدا ہوئی۔ نیز مبنی بر انصاف فیصلہ صادر نہ ہونے سے نہ صرف انصاف کی بے وقعتی ہوئی بلکہ بزرگوں سے نفرت و عداوت کرنے کا بیج بھی بویا گیا۔ اس موقع پر ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ نہایت نرمی و ہمدردی سے غیر حاضری کی اصل وجہ اس طرح دریافت کی جاتی کہ طالب علم بلا تامل خود بخود اُستاد کی ناجائز سختی کو ظاہر کر دیتا جس کے بعد اُسے محبت سے سمجھایا جاتا کہ دراصل غیر حاضری اُستاد کی نفع رساں سختی کا باعث ہے نہ کہ اُستاد کی سختی غیر حاضری کا موجب ہے۔ اور ثبوت کے طور پر اُسے اس امر کا یقین دلایا جاتا کہ تم خود حاضر باشی سے اس حقیقت کا تجربہ کر لو۔ نیز جب تک تمہیں منع نہ کیا جائے آغاز و اختتام مدرسہ پر اپنی حاضری کا علم کرانے کے لئے مجھ سے ملا کرو۔ پھر مدرس صاحب کو الگ طلب کر کے انہیں بخوبی سمجھا دیا جاتا کہ جب جائز تشدد سے غیر حاضری کا انسداد نہیں ہو رہا ہے تو انسب یہ ہے کہ اب غیر معمولی نرمی و شفقت کا برتاؤ کیا جائے اور طالب علم کی علمی مشکلات کو حقیقی ہمدردی و حوصلہ افزا دلجوئی سے آسان تر کرنے کی امکانی کوشش خاص طور پر کی جائے۔ نیز مناسب ہوگا کہ طالب علم کا شاکی ہونا اُستاد صاحب پر ظاہر نہ کیا جائے ورنہ بہت ممکن ہے کہ حسب ہدایت نرمی کا سلوک کرنے میں سختی کی جھلک نمایاں ہو جائے۔ اور خاطر خواہ اصلاح حال نہ ہو سکے۔ کم از کم میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر بلاشک یہ کہہ سکتا ہوں کہ صورتِ واقعہ کے لحاظ سے آخری تدبیر ہی مفید و مجرب ترین عمل ہے۔ جس کو نظر انداز کرنا سخت غلطی اور گوناگوں مصائب و نقائص کا موجب ہوگا۔

بعض وقت یہ دیکھا گیا کہ طالب علم اپنی واجبی ضرورت کے سبب ایک آدھ گھنٹہ کی رعایت کا قبل از قبل طالب ہوتا ہے۔ مگر اُستاد صاحب محض اپنی خام خیالی کی وجہ سے

جو اُن کی دانست میں عین ہمدردی ہوتی ہے۔ استفادہ کی اجازت نہیں دیتے۔ بالآخر طالب علم مجبوراً پورا دن غیر حاضر ہو کر عدول حکمی کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ جس کی ذمہ داری صرف اُستاد صاحب پر عاید ہوتی ہے کیونکہ یہ اُن ہی کی نادانی کا نتیجہ ہے۔

مدرسے کے اوقات کی تبدیلی بھی غیر حاضری کی محرک ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ جب کسی ضرورت سے مدرسہ صبح کا ہوتا ہے تو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس روز کی اوسط حاضری نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خصوصاً مسلمان طلبہ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی نہیں ہوتے۔ اور جو وقت اُن کے بستر سے اُٹھنے کا ہوتا ہے وہی مدرسے میں حاضر رہنے کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ضروریات سے فارغ ہو کر مدرسہ حاضر ہونے میں لازماً تاخیر ہونے کے سبب غیر حاضری گوارا کر لیتے ہیں۔ اور دوسرے دن معقول و نامعقول کوئی نہ کوئی عذر گھڑ دیتے ہیں۔

کبھی ہوم ورک کی مقررہ مقدار آرام پسند طلبہ کے امکان سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ اگر وہ جوں توں کر کے اُس کی تکمیل بھی کر لیتے ہیں تو اسباق بے دیکھے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر اسباق کی تیاری کی جاتی ہے تو ہوم ورک مکمل نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ان کے ذہن میں اس مشکل کو آسان کرنے کی یہی ایک تدبیر ہوتی ہے کہ وہ مدرسے سے غیر حاضر ہو جائیں۔ اور اس طرح تعلیم کے بارِ گراں سے سبکدوشی حاصل کریں۔

اکثر مدارس میں طلبہ کی انجمنیں قائم ہیں جن میں کم از کم مہینے میں ایک دفعہ تقاریر وغیرہ ہوا کرتی ہیں جو فی الحقیقت فائدہ مند ہیں۔ مگر جس روز انجمن کا جلسہ مقرر ہوتا ہے۔ اس دن کی اوسط حاضری اپنی کمی کو نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہے۔ اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے اس اختلاف پر غور کرنے کے بعد پتہ چلا کہ طلبہ کے از خود آمادہ نہ ہونے پر جب انہیں اپنی مرضی کے خلاف تقریر و نظم خوانی کے لئے نامزد کیا گیا۔ تو عدم تیاری کی خفت کو گوارا نہ کر کے غیر حاضری کی آڑ میں پناہ لینی پڑی۔

عموماً اُجرتِ تعلیم وصول کرنے کے زمانے میں غیر حاضر طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کے چند اسباب یہ ہیں کہ اُجرتِ تعلیم کی معافی کے عدم گنجائش کے سبب

غیر مستطیع طلبہ کو بھی فیس دینی پڑتی ہے اور جس کا فراہم کرنا اُن کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔ جب ایسی نوبت آپہنچتی ہے تو وہ مدرسے میں غیر حاضر ہو کر فیس کی فراہمی میں تگ و دو کرتے ہیں۔ اکثر مدارس میں ہر مہینے کے دوسرے یا تیسرے ہفتے میں فیس وصول کی جاتی ہے۔ اور یہ زمانہ فیس کی وصولی کے لئے اس وجہ سے ناموزوں ہوتا ہے کہ غریب و اوسط طبقے کی قلیل آمدنی وسطِ ماہ سے قبل ہی ناگزیر ضروریات کی نذر ہو جاتی ہے۔ اور اواخر ماہ میں عموماً تنگ دستی کا سامنا ہوتا ہے۔ ایسے زمانے میں جب بچے فیس کے طالب ہوتے ہیں اور ان کو بر وقت فیس نہیں ملتی ہے تو عدم ادائی کی شرمندگی یا تقاضے کے تشدد یا والدین کی آجکل سے تنگ آ کر گھر بیٹھ رہتے ہیں۔ اور اگر اوائل ماہ میں فیس وصول کی جاتی ہے تو اس میں یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ داخلہ رقم فیس کے وقت وصول کنندہ مدرسین کی جیبیں خالی ہوتی ہیں۔ مجبوراً اس مہینے کی فیس تقسیم تنخواہ کے بعد دوسرے مہینے میں جمع کر کے خزانہ کو بھیجی جاتی ہے۔ اس دو طرفہ خامی کو رفع کرنے کی آسان صورت یہی ہے کہ اجرت تعلیم اوائل ماہ میں وصول اور داخلِ خزانہ کی جائے۔ نیز اگر غیر مستطیع طالب علم وظیفہ یاب ہوں تو اُن کی رقم وظیفہ میں سے کافی مدت کی فیس یکمشت وضع کر کے تہِ امانت میں رکھلی جائے اور وظیفہ یاب نہ ہونے کی صورت میں اُن کی فیس پور فنڈ یا کسی دوسری مد سے مستعار ادا کر کے بہ سہولت وصول کر لی جائے۔ جس کے بعد انھیں۔ اس کی فراہمی کے سبب مدرسے سے غیر حاضر رہنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

جو طلبہ کسی مضمون میں کمزور ہوتے ہیں۔ اور مدرسے کی تفہیم بھی بوجہ کمزوری ذہن نشین نہیں ہوتی۔ نیز ان سے ہوم ورک کی کما ینبغی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اگر اُستاد صاحب ایسے طلبہ پر ہمدردی کے ساتھ توجہ خاص نہ کریں تو وہ چند روز میں لازماً بددِل ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر اس مضمون کی ساعتِ تعلیم میں غائب رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کم از کم نصف یوم کی غیر حاضری کا عمل ہوتا ہے۔

بغور مشاہدہ کرنے سے بعض مدارس میں یہ بھی دیکھا گیا کہ خصوصاً اونچی جماعتوں کے فیشن پسند طلبہ ڈرل کرنے سے عار کرتے ہیں۔ اور بر وقت کچھ نہ کچھ عذر کر کے بچ جاتے ہیں

جب ڈرل سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو والدین اور ڈاکٹروں سے تحریرات حاصل کرکے پیش کرتے ہیں۔ اس پر اگر وہ ہمیشہ کے لئے مستثنیٰ نہ کردے جائیں تو غیر حاضر رہنے کے عادی بن جاتے ہیں۔

جب طلبہ چند منٹ دیر سے مدرسہ آیا کرتے ہیں۔ اور اُستاد صاحب بھی ہر وقت مختلف قسم کی سزا دہی مثلاً کھڑا کرنے با جماعت میں داخل ہونے سے باز رکھنے اور شرم و غیرت دلانے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ تو ایسے موقع پر بھی طلبہ غیر حاضری کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔

کم شوق طلبہ کے لئے بسبب مدرسے میں کوئی خاص دلچسپی اور کشش موجود نہیں ہوتی ہے تو وہ عموماً بیرونی مدرسہ کی دلچسپیوں کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً طالب علم کے مکان میں کوئی مہمان آجائے یا مکان والے باہر جائیں یا خود اُن کو مدرسہ آتے ہوئے راستے میں کوئی دلچسپ کھیل تماشہ نظر آجائے غرض اسی قسم کے اور مواقع بھی کم شوق طلبہ کو مدرسہ آنے سے روک دیا کرتے ہیں۔

بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدرسین اپنی خانگی فرمائشات کی تکمیل طلبہ کے سر لگاتے ہیں اور جب ان سے بروقت تکمیل نہیں ہوسکتی تو وہ اس وجہ سے بھی کہ اُستاد صاحب کا کام کرنے میں غیر حاضری بھی ہو جائے تو سزا یا خفگی کا موجب نہیں ہوگا تکمیل کار کی خاطر غیر حاضر ہو جایا کرتے ہیں۔

جو طلبہ اشرار مدرسہ یا باہر کی بُری صحبتوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اُن کی مصروفیت دن بدن بڑھنے لگتی ہے۔ اور اس کے ساتھ مدرسہ کی دلچسپی کم ہوتی جاتی ہے۔ جب مزاج میں اس قسم کا تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بات بات پر غیر حاضر ہونے کو گوارا کر لیتے ہیں۔

کبھی کبھی طلبہ کو مدرسہ آنے سے قبل کھانا نہیں ملتا۔ اس پر بھی وہ مدرسہ آتے ہیں مگر جب دوبارہ مکان جاکر کھانا کھانے کی اجازت بروقت نہیں ملتی ہے تو وہ دوسرے موقع پر مجبوراً غیر حاضر رہتے ہیں کیونکہ غیر حاضری کے مقابلے میں بھوک ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

عموماً موسم کی تبدیلی کے زمانے میں جبکہ بھلے چنگے مزاجوں میں بھی ناگوار سا تغیر

پیدا ہو جاتا ہے۔ کھانے پینے اور کھیل کود میں بے احتیاطی کرنے کے سبب بیماری گھیرتی ہے جس کا نتیجہ مدرسے کی غیر حاضری ہوا کرتا ہے۔

جو طلبہ زیادہ تر خانگی کاروبار کے سرانجام میں گھرے رہتے ہیں وہ نہ اوقات کی نگہداشت کر سکتے ہیں نہ حاضری ہی کے پابند رہ سکتے ہیں۔ اور جب ان کی مصروفیت کے مدنظر ان کے ساتھ ہمدردانہ رعایت نہیں کی جاتی ہے تو یہ گنڈے دار حاضری اور بھی ابتر ہو جاتی ہے۔

رنگین مزاج طلبہ عُرس و جاترا اور میلے ٹھیلے کے موقع پر باوجود مقررہ تعطیل سے استفادہ کرنے کے ایک آدھ دن اور بھی غیر حاضر رہتے ہیں۔ اور بعض تو دو ایک دن ہی غائب ہو جاتے ہیں جنکی عین وقت پر روک تھام کرنی اس وجہ سے بھی بے سُود ہوتی ہے کہ اُن کا پُرشوق ارادہ عزم بالجزم ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے طلبہ ترغیب و تحریص سے دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں۔

سینما اور ناٹک کے دلدادہ طالب علموں کو زیادہ رات تک جاگنا پڑتا ہے اور صبح اُٹھنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس پر بھی طبیعت کسلمند رہتی ہے جو مدرسہ جانے سے روکتی ہے اگر اس کو نظر انداز کر کے طالب علم مدرسہ جانے کے لئے آمادہ بھی ہو جاتا ہے تو اسباق اور ہوم ورک کا نامکمل ہونا اُس کو اپنا متزلزل ارادہ فسخ کر دینے پر مجبور کرتا ہے اور وہ بالآخر غیر حاضر ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وسیع تعطیلات کے بعد چند روز تک اوسط حاضری گری رہتی ہے کیونکہ تعطیلات میں طلبہ جن غیر درسی مشغلے کو اختیار کرتے ہیں۔ اس کو عین وقت پر دفعتاً ترک کرنا چاہتے ہیں جو بعض اوقات فوری ترک نہیں ہو سکتا اور مجبوراً غیر حاضر رہنے کی نوبت آتی ہے۔

جب کوئی طالب علم کسی جرم کا مرتکب یا نقصان رسانی کا موجب ہوتا ہے اور اس کو سزا پانے کا اندیشہ بھی رہتا ہے تو وہ سزا یابی کی مصیبت کو اپنے سر سے ٹالنے کے لئے غیر حاضری کی آڑ میں اس لئے پناہ لیتا ہے کہ شاید دو چار دن گذر جانے کے بعد سزا کا اشتداد کم ہو جائے یا کوئی دوسری صورت جس میں سزا یابی کا احتمال ہی نہ ہو پیدا ہو جائے بہرکیف مطمئن ہونے تک مدرسہ سے روپوش رہنا ضروری سمجھتا ہے۔

بعض وقت چند یا دو طالب علموں میں کسی وجہ سے باہمی عداوت پیدا ہو کر آئے دن نوک جھونک رہا کرتی ہے۔ بالآخر ایک غالب اور دوسرا مغلوب ہوتا ہے غالب ضرر رسانی کے نئے نئے اسباب فراہم کر کے مغلوب کا ناک میں دم کر دیتا ہے۔ اگر استاد صاحب کو اس کا علم ہوا اور انہوں نے اس کا کافی انسداد کر دیا تو خیر گزری اور معاملہ رفع دفع ہو گیا ورنہ مغلوب اس مقام سے عارضی طور پر ہی ہی دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں خلش و رنجش کے نت نئے سامان موجود ہوتے ہیں۔

خصوصاً چھوٹی جماعتوں کے کم سن بچے جو اپنے ماں باپ کے غیر معمولی لاڈ پیار میں پرورش پاتے ہیں۔ مدرسے کی ذراسی ناگواری اور تھوڑی سی سختی کو بھی جو اُن کے لئے بلحاظ حالات و افتاد مزاج زیادہ ہوتی ہے۔ برداشت نہیں کر سکتے۔ اور جب ایسی نوبت آتی ہے تو گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ جن کو ماں باپ بھی اس حالت میں مدرسہ جانے کے لئے مجبور کرنا گوارا نہیں کرتے حقیقت میں "علم النفس" کے نقطۂ نظر سے کم سن طلبہ کے لئے مدرسہ مدرسہ نہیں بلکہ گوناگوں دلچسپیوں اور طرح طرح کے مسرت افزا نظاروں کا گھر ہونا چاہیئے تاکہ اُس کی روز افزوں کشش طلبہ کو منحرف نہ ہونے دے۔

درس ادب اگر بود زمزمۂ شادیہا جمع بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

مسئلہ تعلیم سے گہری دلچسپی اور عملی ہمدردی رکھنے والے باریک بین حضرات کی خدمت میں انسداد و اسباب غیر حاضری کے متعلق چند موٹی موٹی باتیں بیان کرنے کے بعد اس مزید گزارش کی جرأت بھی کی جاتی ہے کہ از راہ کرم مذکرہ بالا امور پر کم از کم امتحاناً عمل فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اگر کسی مدرسے کے جملہ مدرسین مسئلہ غیر حاضری پر ہمہ تن متوجہ ہو جائیں اور صدر مدرس صاحب بھی بے کم و کاست دلچسپی لیں تو مجھے یقین کامل ہے کہ چند روز میں اُس مدرسے کی اوسط حاضری نمایاں طور پر ترقی پذیر ہو جائے گی۔

خطبۂ نواب سر نظامت جنگ بہادر

بتقریب

جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ عثمانیہ

ذیل میں ہم نواب صاحب ممدوح کے فاضلانہ خطبہ کا ضروری اقتباس جو "حیدرآباد ٹیچر" کے مقاصد کے تحت آسکتا تھا، درج کرتے ہیں۔ اس مختصر مگر جامع خطبہ میں جس عالمانہ انداز سے مقصد تعلیم اور مقصدِ حیات پر دل نشین پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے، وہ قارئینِ "ٹیچر" کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگی۔

(اشتراک)

جامعہ عثمانیہ کے طالب علم ایسی حالت میں ہیں کہ زندگی کو ایک جلیل القدر مہم تصور کریں جسے وہ اپنی کوششوں سے اور زیادہ باعظمت اور شاندار بنا سکتے ہیں اسی خیال سے انہیں کام کرنا چاہیئے اور اسی کے یاد دلانے کے لئے آج میں یہاں آیا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو کوئی وعظ سنانا نہیں چاہتا بلکہ سیدھی سادی زبان میں ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جن سے آپ کو دلچسپی ہو اور جس سے اس وقت اور آئندہ چل کر آپ کو کچھ فایدہ پہونچ سکے۔

مقصد تعلیم کی نسبت صاف اور صریح الفاظ میں سوال یہ ہے کہ انسان کو تعلیم سے کیا فائدہ ہے اور یونیورسٹیوں کے قیام کا کیا مقصد ہے؟ پہلے اس سوال کے دوسرے جزو کی طرف توجہ کی جاتی ہے یونیورسٹی (یا جامعہ) کیا ہے اور اس سے کیا مقصد حاصل ہوتا ہے؟

اس کے جواب میں ہمیں کسی تعریف کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر اس کا صحیح مفہوم ہمارے ذہن میں آجائے اس لئے اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یونیورسٹی یا جامعہ نوجوانوں کی ایک انجمن ہے، اور اس کا مقصد ایک طرف ایسے علم کا حصول ہے جو زندگی کے کارخانے میں انہیں اچھا کاریگر ثابت کرے اور دوسری طرف انہیں صداقت اور نیکی کے اعلیٰ مدارج کی طرف لے جائے اور یہی وہ دو اجزا ہیں جن سے عملی حسنِ اخلاق مرکب ہے، اور علم کی تمام بالائی عمارت کی اصل بنیاد اسی پر قائم ہے۔ ہم سب اس سے واقف ہیں کہ وہ نوجوان

جو بلند خیالات، اور پاکیزہ احساسات کے پرسکون فضا، اور اپنے سے زیادہ پختہ مغز اصحاب کے زیر ہدایت رہتے اور باہم مل کر کام کرتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ زندگی کے مختلف فرایض ان لوگوں سے بہتر طریقہ پر انجام دینے کے قابل ہوں گے جنھیں ایسے مواقع نہیں ملتے اس سے یونیورسٹی یا جامعہ کی ضرورت اور اس کے مفید ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ صرف یونیورسٹی میں رہنے تک نہیں بلکہ دنیا کی بڑی کاروباری یونیورسٹی میں داخل ہو کر بھی اس امر کو یاد رکھیں، کیونکہ وہاں آپ سے ہر موقع پر یہ توقع کی جائے گی کہ آپ اپنے ذاتی جوہر دکھائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آپ کی دماغی ساخت میں صحیح علم کی خالص دھات یا غیر صحیح علم کے کھوٹ کا جز غالب ہے اور آیا آپ کی فطرت ایسی پاک و صاف ہو گئی ہے کہ وہ ہمیشہ زندگی کے برترین نظریات کی طرف بڑھتی ہے، یا آپ کے محصلہ سطحی علم نے آپ میں یہ ادنیٰ خواہش پیدا کر دی ہے کہ آپ اس سے صرف حصول اُجرت کا کام لیں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ جو شخص علم محض اسی غرض سے حاصل کرتا ہے کہ وہ اسے بڑی سی بڑی قیمت پر فروخت کر سکے وہ نہ فطرت اور نہ یونیورسٹی کی تخلیق کا بہترین نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ اشخاص کا عمدہ نمونہ وہ ہے جو اپنے علم اور قابلیت کو اپنے ابنائے جنس کے فایدے کے لئے ایک امانت تصور کرتا ہے۔ اور خود راہ راست پر چلنے کے لئے اس کو اپنا ہادی اور رہنما بناتا ہے خواہ ایسا شخص کسی حالت میں ہو، امیر ہو یا غریب۔

تعلیم اور کلچر میرے نزدیک تعلیم سے مراد انسان کی وہ روحانی ترقی اور شائستگی ہے جو اکتساب علم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جب اس پر اس طور سے نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم ہماری زندگی کے مشکل ترین مسائل میں سب سے اہم مسئلہ ہے اور ہمیں چاہیئے کہ جس طرح ممکن ہو اس کو اپنے لئے حل کریں۔ اس کا کیا سبب ہے کہ اہل مغرب صدیوں کی بکار آمد ترقی کے بعد اس وقت اس کی روحانی کمی کو محسوس کرنے لگے ہیں؟ کیا ہم اس سے متنبہ ہو کر اپنے نظام تعلیم کے لئے ایسے طریقے نہیں اختیار کر سکتے جو ہمیں ان غلطیوں سے محفوظ رہنے میں مدد دیں جو دوسرے لوگ کر چکے ہیں؟ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ ہمارے مدرسے کالج اور یونیورسٹیاں سب، ممالک غیر کے نقلی اور ادنیٰ قسم کے سامان مہیا کرنے کے

گراں خرچ کارخانے ثابت ہوں گے۔ اور ایک غیر مطمئن اور مضطرب فضا پیدا کر دیں گے جیسا کہ دوسرے مقامات پر ہو رہا ہے میں ذاتی طور سے مغربی تہذیب کی بہترین چیزوں کا مداح اور پسند کرنے والا ہوں کیونکہ مجھے خود انگلستان کی ایک قدیم یونیورسٹی سے تعلق رہا ہے مگر میں ابھی تک یہ باور نہیں کر سکا ہوں کہ ہمارے ہندوستانی ادارات جو تربیت انسانی دل و دماغ کے لئے مہیا کر رہے ہیں وہ بہترین قسم کی تربیت ہے۔

تربیت کے لفظ سے میرا خیال اس طرف جاتا ہے کہ یہ وہ لفظ ہے جو ہماری زبان پر بار بار آتا ہے مگر باوجود اس کے ہم اس کے حصول کے لئے بہت کم کوشش کرتے ہیں بدقسمتی سے یہ لفظ کثیر مطالعہ اور وسیع علم کا مترادف ہو گیا ہے۔ دماغ کو جدید اور قدیم واقعات سے معمور اور مملو کر لینا ممکن ہے کہ اسے عجائب خانہ یا ذخیرہ علوم بنا دے، لیکن اس سے لازمی طور پر وہ عمدہ صفت نہیں پیدا ہوتی جس کا مفہوم لفظ تربیت سے پیدا ہوتا ہے، یعنے وہ صفت جو فطرت اور انسانی افعال کی عمدگی، حسن، اور شان و شوکت کے اشارات اور کنایات کو سمجھتی اور اُن پر کاربند ہوتی ہے اور انسان کے دل کو ایسا ذی حس آلہ بنا دیتی ہے کہ وہ عمدہ جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

صداقت، حسن، اور نیکی کی قوتیں ہم میں اور ہمارے گرد و پیش ہمیشہ موجود رہتی ہیں اور ہم ان کے اختلاط سے اپنے آپ کو شاد و خرم رکھ سکتے ہیں، اور یہ صحیح تربیت ہی سے ہم کو حاصل ہو سکتا ہے، اگر ہم اکثر ان مادی دُنیوی فوائد کے پیچھے پڑ کر جنھیں ہم تنہا تعلیم کا معاوضہ تصور کرتے ہیں، اس حقیقت کو یاد نہیں رکھتے ہماری اعلیٰ فطرت کا تقاضا اور سخت تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو خوشنما، عمدہ، اور صادق، بنائیں۔ یہ درحقیقت قدرت کا ایک قانون ہے، پھر صحیح تعلیم سے ہمارے لئے ایک ایسی فضا پیدا ہونی چاہیئے جس سے ہمارے اعلیٰ دماغی قویٰ روشنی اور غذا حاصل کرتے ہیں، اور خود غرضی اور حرص و ہوا اور دوسری بلاؤں سے جو ان سے پیدا ہوتی ہیں بالکل محفوظ اور مصئون ہو جائیں۔ یاد رکھئے کہ تعلیم کا شریف ترین مقصد اپنے بہترین معنوں میں تربیت ہے اور سب سے بڑا معلم فطرت ہے نہ کہ کتابیں کتابیں جو کچھ کرتی ہیں وہ یہی ہے کہ وہ فطرت کے کارناموں کو ضبط تحریر میں لے آتی ہیں، اور

کتابوں میں بہتر کتابیں وہ ہیں جو فطرت کے کارناموں کو اس طرح ضبط تحریر میں لاتی ہیں کہ وہ ہمیں خود فطرت کے سامنے لے جا کر حاضر کر دیتی ہیں جب کتابیں ہماری یہ خدمت کرنے لگتی ہیں، اور جب ہمارا دل فطرت یا انسانی افعال کے کسی ایسے واقعہ سے جو عمدہ، خوش نما، متناسب یا رفیع، اور عظیم الشان ہو پوری طرح متاثر ہو کر خاص جذبات محسوس کرنے لگتا ہے، صرف اسی وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم میں تعلیم نے شائستگی اور تربیت پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی آپ لوگوں کو اتنی اصلاح ضرور دونگا کہ آپ لوگ اپنے پڑھنے کی کتابوں میں محتاط رہیں، کیونکہ کتابیں مثل دوستوں کے اچھی بری دونوں طرح کی ہو سکتی ہیں۔ ان کے جانچنے کا علمی معیار یہ ہے کہ اچھی کتابیں وہ ہیں جو آپ کے دل میں اچھے خیالات پیدا کرتی ہیں اور آپ کو اچھا بنانے میں موید ہوتی ہیں جب آپ لوگ کوئی کتاب پڑھیں تو اس کے حسن و قبح کے جانچنے میں اس معیار کو بھول نہ جائیں اور اس کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ کتابوں کے مطالعہ میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ انسان دوسرے لوگوں کے خیالات کے اتباع کا خوگر ہو جاتا ہے اور آخر میں ان خیالات کو اپنے خیالات سمجھنے لگتا ہے اس سے ہمیشہ اپنے آپ کو بچانا چاہیئے اور اپنے ذہن میں ایسے اکتسابی علم کو ہمیشہ اکتسابی علم ہی کے نام سے موسوم رکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

پڑھتے وقت اپنے دماغ کو بیدار رکھنا، اور جو خیالات مطالعہ سے پیدا ہوں ان پر غور کرنا، اور ان کی نسبت اپنی رائے قائم کرنا، اور ان سے نتائج نکالنا اور اس طور سے خود اپنی کوشش سے حقیقت تک پہونچنا اور اسے بخوبی سمجھ لینا بھی ضرور ہے علاوہ بریں اس کی بھی ضرورت ہے کہ جو کچھ آپ لوگ پڑھیں اُسے کامل طور سے سمجھیں اور اس کے امتحان اور تصدیق کے لئے خود ان اشیاء کی اندرونی اور بیرونی فطرت کی تلاش کریں تاکہ آپ کے دل مطمئن ہو جائیں مطالعہ سے تخیل کی قوت میں اضافہ ہونا چاہیئے مطالعہ تخیل کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

میں اس جملہ معترضہ کی معافی چاہکر پھر تعلیم کے مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں مجھے آپ لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ میرے خیال میں موجودہ نظام تعلیم عام طور سے کس جگہ ناکامیاب ثابت ہوتا ہے، اگر میں اپنا خیال ان الفاظ میں ظاہر کر سکتا ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ اس نظام میں انفرادی یعنے ہر ایک شخص کی روح کو پوری طور سے شائستہ بنانے کی طرف بہت کم توجہ

کی جاتی ہے اور نہ انسانی عقل کو ایسی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ حقیقی اور عارضی قدر و قیمت، اور لازمی اور ضمنی ضروریات میں تمیز اور فرق کر سکے۔ ہم میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے بعد بے غرضانہ خلوصِ دل، صداقت، اخلاص، ہمدردی، فیاضی، اعتدال، اخلاقی جرأت، تصورِ عزت، اور صحیح خودداری میں ان لوگوں سے بہتر ہیں جو جہلا کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں؟ یہ خیال تکلیف دہ ضرور ہے مگر ساتھ ہی اس کے بالکل صحیح ہے قدیم وضع کے لوگوں کی ضرور یہ کوشش تھی کہ وہ بعض خیالات مثلاً خدا اور انسانی روح کی ذمہ داریوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں، جس سے ہمارا موجودہ نظام تعلیم بالکل خالی ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم سے نہ صرف تمام شائستگی اور شرافت پیدا کرنے والے خیالات بلکہ اپنے سے بالا تر کی عظمت بھی مفقود ہو گئی ہے اور موجودہ زمانہ کی اکثر برائیاں اور آفتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی قسم کے تصورات ہمارے خیال کو اس طرف مائل کر دیتے ہیں کہ بہترین تعلیم وہ ہے جو نہ صرف ہماری عقلوں کو آراستہ کرے بلکہ ہمارے احساسات کو صحیح راستہ پر لگا دے خود ہمارے قلب میں ایک شمع ہدایت روشن ہے اور ہماری رہ نمائی کے لئے گذشتہ صدیوں کی دانش کا ذخیرہ بھی موجود ہے، تعلیم کا یہ کام ہے کہ وہ اس شمع کی دیکھ بھال کرتی رہے اور اسے روشن رکھے تاکہ ہم اپنے اسلاف کی مجتمعہ دانشمندی سے پوری طرح مستفید ہو سکیں۔ زندگی اور اس طور سے تعلیم کا حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ ایک پاک و صاف، صحیح، اور سادہ، مفید اور کارآمد زندگی کس طرح بسر کی جا سکتی ہے؟ یہ ایک قابل لحاظ واقعہ ہے کہ دنیا کے بڑے اور بہترین اشخاص نے بہ نسبت اپنے خیالات کے اتباع کے زیادہ تر اپنے جذبات کے اتباع میں کام کیا ہے، کیونکہ ان لوگوں میں خیالات ہمیشہ کسی بڑے عمدہ اور فیاض جذبہ کے ماتحت رہتے تھے۔ ہمیں تعلیم ہی کے ذریعہ سے اس منزل تک پہونچنا ہے، اس لئے ہمیں محض خیالات کی اس بھول بھلیاں میں نہ پڑنا چاہیئے جو ہماری موجودہ تہذیب نے تعمیر کی ہے، ہماری کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ ہم صحیح تعلیم کی رہ نمائی سے پھر انہی پاک قلبی جذبات کی طرف رجوع ہو سکیں۔

تعلیم کے اخلاقی پہلو پر اس قدر کہنے کے بعد مجھے یہ بیان کرنا چاہیئے کہ میرا خیال

اور یقین اس تعلق کی نسبت کیا ہے جو تعلیم اور انسان کے مذہبی اور مخصوص اس احساس میں پایا جاتا ہے جو فتوت یا مروت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مجھے اس کے بیان کرنے میں مطلق تردد نہیں ہے کہ وہ تعلیم جس پر حقیقی طور سے تعلیم کا اطلاق ہو سکتا ہے وہ ان دونوں احساسات کو اپنا سچا معین اور مددگار سمجھتی ہے، وہ اپنے آپ کو پاک و صاف رکھنے کے لئے ان سے استمداد کرتی ہے اور خود انھیں غلط فہمیوں کے رفع کرنے میں مدد دیتی ہے۔ انسانی فطرت کے تمام اخلاق حسنہ انھیں دو متفقہ احساسات خیالات، اور جذبات کے زیر اثر ہوتے ہیں جو علی الترتیب مذہب اور فتوت یا مروت کے نام سے پکارے جاتے ہیں ان میں ایک پاکیزہ اور شرف افزا آکریم و تعظیم کی روح حرکت کرتی ہوئی پائی جاتی ہے جو عمل میں آکر افعال حسنہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کیونکہ ان دونوں کا تعلق ان اعلیٰ خیالات سے ہے جنھیں مذہب ابھارتا اور معرض عمل میں لاتا ہے۔ یہی دونوں احساس اخلاق کی روح رواں میں اور یہی اس میں شریفانہ پُرجوش آرزوؤں کے محرک ہوتے، اور مردانہ ایثار کی حیرت انگیز قابلیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ ظاہری صورت میں واردات ہیں، اور اسی حیثیت سے ان سے بحث کی جاتی ہے۔ مگر ان کا اصلی منبع انسان کا قلب ہے۔ وہ اس وقت بھی انسانی اعمال کے بہترین ہادی اور رہنما اصول ہیں اور اس بنا پر بلا عظیم خطرہ کے ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ان کی شکلیں زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ مگر ان کا جوہر کسی وقت بھی نہیں بدلتا۔ انسان کے دل میں ہمیشہ ان کی جگہ رہے گی اور ہمیشہ یہی اصول اسے اعلیٰ مدارج کی طرف لے جانے کی کوشش کریں گے صحیح تعلیم پر لازم ہے کہ وہ اس واقعہ کو تسلیم کرے، اور اگر اسے اپنے آپ کو اخلاقی مذلت سے بچانا ہے تو ان مددگاروں سے استمداد کرتی رہے۔

تعلیم اور مسابقت مجھے تعلیم کے ایک دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنا ضرور ہے۔ یہ ایک فطرتی چیز ہے کہ تعلیم سے دل میں سبقت کی خواہش پیدا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں اپنے ساتھیوں سے کس طرح اور کن امور میں سبقت لے جانا چاہیئے۔ یہ ایسا سوال ہے جس پر ہم بہت کم غور کرتے ہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ ہم کبھی اس خواہش سے بری نہیں ہو سکتے کہ اپنے ہمچشموں

سے اگر سب امور میں نہیں تو کم از کم بعض امور میں سبقت لے جایں؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر صورتوں میں یہ خواہش صرف بعض ان دنیاوی فواید کی حد تک محدود رہتی ہے جو ہمارے دلوں کو بے قرار رکھتے ہیں مثلاً عزت، عہدہ، حیثیت، دولت، وغیرہ اور عام طور سے اسے اخلاقی اور دماغی سبقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب اس پر غور کرنا چاہیئے کہ ان دنیاوی فواید کا حاصل کر لینا اور دولت مند ہوجانا کیا ہمیشہ ہمارے امکان میں ہے؟ اس کا انحصار حالات پر اور ایک بڑے درجہ تک دوسروں کی اعانت اور مدد پر ہوتا ہے، جسے ہم ہمیشہ طلب اور حاصل نہیں کر سکتے۔ کیا ایسی حالت میں یہ اس سے بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنا مقصد ان امور کو قرار دیں جن کا حصول کلیتہً ہمارے ہی اختیار میں ہو؟ کیا ہم اپنی اخلاقی طبیعت کو قوی کر کے قوت حاصل نہیں کر سکتے اور ان اعلیٰ مدارج تک نہیں پہونچ سکتے جو ہمیں بہتر اور زیادہ تر مستقل عظمت کا مستحق قرار دے سکتے ہیں؟ اس میں کیا امر مانع ہے کہ ہم میں سے مفلس سے مفلس شخص بھی ایماندار، مخلص، صادق، انصاف پسند، بامروت جری اور قوی دل ہوجائے اور اپنی ان صفتوں سے ملک اور قوم کو فایدہ پہونچائے اور ہم بھی اپنے بہت سے مشاہیر سلف کی طرح ان دنیاوی فواید کو جو کہ خود بین اور کوتاہ دل لوگوں کا مرکز آرزو ہوتے ہیں، حقارت کی نظر سے کیوں نہ دیکھیں اور اپنی ان عمدہ اور عظیم الشان روحانی قوتوں کو کیوں نہ پرورش کریں اور بڑھایں جو ہمیں قوی دل بنا سکتی ہیں؟ بانیاں مذہب و فلسفہ کے حالات کو معاینہ کیجیے اور خود اپنے دل سے سوال کیجیے کہ آیا وہ عزت دولت یا عہدہ تھا جس نے ان کی عظمت قایم کی۔ خود ہمارے رسول کریمؐ اس سے بہت پہلے سے کہ وہ دنیا کے سامنے اپنی تبلیغ لے کر آیں "امین" کے خطاب سے مخاطب کیے جاتے تھے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان میں صداقت، خلوص، اور دیانت تھی۔ یہ وہ گوہر شب چراغ تھے جو ان کے موٹے جھوٹے لباس سے چمکتے اور دمکتے نظر آتے تھے یہی وہ اوصاف تھے جس کی بنا پر خداوند تعالےٰ نے انھیں ان کے تمام معاصرین پر سبقت اور ترجیح عطا فرمائی اور انھیں اوصاف کی بدولت ایک تاریک ماحول میں وہ روشنی پھیلی جو ایک نئی دنیا اور ایک نیا تمدن پیدا کرنے والی تھی، اور جس نے ایک

قوم کو تمام ناپاکیوں سے پاک کر کے انسان کی عمر طبعی کی نصف مدت میں ایک عظیم الشان قوم بنا دیا۔ اعلیٰ درجہ کے لوگ اسی طریقہ سے اپنے معاصرین سے سبقت لے جاتے ہیں وہ اپنی روحانی قوتوں کو دنیاوی فواید کے حصول میں ضائع نہیں ہونے دیتے۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ تعلیم سے یہ کام لیں کہ وہ آپ کو سیدھا راستہ بتائے نہ کہ غلط راستہ پر ڈال دے۔

صنعت اور حرفت کی تعلیم اب میں صنعت و حرفت کی تعلیم کے اہم مضمون کو لیتا ہوں اور آپ کو بتاتا ہوں کہ کام مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض دماغ اور بعض ہاتھ کے لئے موزوں ہیں۔ انسان کو اس زندگی میں یہ دونو کام کرنے پڑتے ہیں۔ جس حالت میں آپ لوگوں کا دماغ خیال کے اعلیٰ مراتب کے طے کرنے میں لگا ہو آپ اپنے ہاتھوں کو مفید اشیا کے بنانے میں مشغول رکھئے تاکہ زندگی زیادہ تر آرام دہ اور اس کی ظاہری صورت زیادہ تر خوشنما ہو جائے اسی میں قوموں کی بڑائی کا راز چھپا ہوا ہے اور اسی ذریعۂ سے مغربی قوموں نے اپنے آپ کو دولت مند اور قوی بنا لیا ہے اور اسی دولت اور قوت کے ذریعہ سے بالآخر تمام دنیا پر حکمران ہو گئی ہیں۔ یہ انہوں نے دنیا کی یونیورسٹی میں سیکھا ہے، علمی یونیورسٹیوں پر واجب ہے کہ وہ اس واقعہ پر ان کے تمام علمی پہلوؤں کے ساتھ غور، بحث، اور فکر کریں تاکہ ان کے خیالات موجودہ زندگی کے اس مرکزی واقعہ کی طرف متوجہ ہو سکیں ترقی پزیر دنیا کا اب یہ خیال نہیں ہے کہ یونیورسٹیاں خالی الفاظ کی تخم ریزی کی کیاریاں، یا نمایش کے لئے ڈگریوں کے نشوونما کے چمن ہیں ڈگری کے معنی کسی قسم کی قابلیت کے ہیں یا سمجھے جاتے ہیں اور قابلیت کے معنی دنیا کے عملی کاموں کی انجام دہی کی استعداد ہے۔ اس سے جو کچھ نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ صاحب ڈگری کو اس قابل ہونا لازم ہے کہ وہ اس عملی دنیا میں کوئی عمل اپنے ہات سے کر سکے تاکہ وہ اپنی روزی پیدا کرنے کے قابل ہو جائے، اور اپنی جماعت کا ایک کار آمد اور مفید رکن ثابت ہو، مگر ہندوستان کے اکثر ڈگری یافتہ اس حقیقت سے ابھی تک پوری طرح واقف نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اقتصادی دنیا میں اپنے نشان امتیاز کو بڑے عہدوں اور حقوق کے دعویٰ کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور ان کا مطمح نظر صرف سرکاری ملازمت

ہوتی ہے۔ اس کا کیا نتیجہ ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دورِ زندگی اس جماعت کو غیر مطمئن پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ برٹش انڈیا کی مثال ہمارے آنکھوں کے سامنے ہے اور اگر ہم میں امتیاز اور سمجھ کی کوئی قوت باقی رہ گئی ہے تو ہمیں اس سے انتباہ حاصل کرنا چاہیئے۔ میں آپ سب لوگوں کو نہ صرف مشورہ دوں گا، بلکہ التجا کروں گا کہ آپ اس معاملہ پر اچھی طرح غور کریں اور بروقت اپنے آپ کو زندگی کے میدان کارزار کے لئے تیار کرلیں جس میں آپ کو بجائے الفاظ کے افعال اور بجائے زبان کے ہاتوں سے کام لینا پڑے گا۔ آپ کو اپنا مطمح نظر بدل دینا اور ڈگری کو زندگی کے عملی کام کرنے کی تیاری کا صرف ایک پروانہ تصور کرنا چاہیئے نہ یہ کہ آپ تھوڑا سا علم حاصل کرلینے کی وجہ سے اس اہم اور ضروری کام کرنے سے شرمانے لگیں جو ایک تربیت یافتہ دماغ کی زیر ہدایت صرف ہاتوں سے انجام پاسکتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہماری حکومت نے آخر کار صنعت اور حرفت کی تعلیم کے متعلق اپنے فرض کو محسوس کرکے اس کے حصول کے ذرایع مہیا کردئے ہیں اور میں اس خوش قسمت دن کا منتظر ہوں جس دن عثمانیہ یونیورسٹی اس جدید ادارہ کے ساتھ ہو کر فی الحقیقت برادرانہ محبت اور برتاؤ سے کام کرنے لگے گی۔

آخر میں میں آپ لوگوں کو فرقہ واری اختلاف کے خطرات سے بھی چند الفاظ میں متنبہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایسے صریح مضمون پر تفصیل سے بحث کرنا بے کار محض ہے، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس زمانہ میں سوائے کم سمجھ اور بدطینت لوگوں کے کوئی شخص اختلاف مذہب کی بناء پر لڑتا جھگڑتا نہیں۔ حیدرآباد کا دامن ہمیشہ اس داغ سے پاک رہا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ ہمیشہ رہے گا۔ لیکن مستقبل کے دروازہ کی پاسبانی آپ طالب علموں کا کام ہے فقط

خطبۂ صدارت

از

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی
پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی

ڈاکٹر صاحب موصوف کا وہ پُر مغز اور جامع خطبۂ صدارت درج ذیل کیا جا رہا ہے جو انھوں نے صوبہ متحدہ کی مسلم ٹیچرس کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں بمقام الہ آباد پڑھا تھا۔

اس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں کہ جدید طریقۂ تعلیم نے ہندوستان کی قدیم شائستگی اور تمدن کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے اور اب جو مغائرت مدرسے اور گھر کے درمیان ہے وہ کسی زمانے میں بھی نہ تھی۔ ان مباحث اور قدیم زبانوں کی ترویج اور ضرورت پر جس سلاست اور خوبی کے ساتھ بچے تلے الفاظ میں بحث کی گئی ہے، وہ السنۂ مشرقیہ کے مخالفین کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

(شریک)

حضرات،

مسلم تعلیمی کانفرنس کے شعبۂ معلمین کا صدر منتخب کر کے مجھے جو عزت آپ نے بخشی اُس کا شکریہ اگر ادا نہ کروں تو احسان فراموشی ہوگی اور کفرانِ نعمت۔ اس عنایت اور عزت کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتا ہوں مگر شکر کے ساتھ ایک شکایت بھی ہے کہ ایسی بڑی عزت اور ایسی اہم خدمت آپ صاحبوں نے مجھ نااہل کو عطا فرما دی اور وہ بھی اس طرح کہ عذر یا انکار کی مجال نہ تھی، بلکہ میرا حال اُس بچے کا سا ہوا کہ "بہ مکتب نمی رود ولے برندش"۔ آپ حضرات اس کا یہی جواب دیں گے کہ ہمارے مکتبوں کا تو قدیم سے یہی دستور چلا آتا ہے،

اور اس جبری تعلیم کے زمانے میں یہ طرز عمل اور بھی ناگزیر ہے۔ اس کی شکایت یعنی چہ؟
بات پر بات یاد آئی۔ قدیم زمانے میں مسلمانوں کے گھرانوں میں عام طور پر یہی دستور تھا کہ ماں باپ اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام آپ کرتے اور لازماً کرتے۔ بسم اللہ کے بعد جب اُستاد کا انتخاب کرتے تو اکثر اِس کا بھی لحاظ رکھتے کہ آدمی ایسا ہو جس کا رعب بچے پر پڑے، اکثر گوش مالی کرتا رہے اور کبھی کبھی چشم نمائی اور گوش مالی کی حد سے آگے بڑھ کر ایسی سزائیں بھی دے دیا کرے جنھیں وہ یاد رکھے۔ تماشا یہ تھا کہ بچے اُسی کٹر اُستاد کے ایسے گرویدہ ہوتے تھے کہ بڑے ہو کر عمر بھر اُس کا احسان مانتے مگر آج مسلمان بچے عام طور پر تعلیم سے بھاگتے ہیں اور اُن کے ماں باپ کو مطلق پروا نہیں۔ اِس عظیم تفاوت کا سبب حقیقت میں یہ ہے کہ اُس زمانے میں تعلیم کا مقصد اور تھا، اِس زمانے میں اور۔ وہاں تہذیبِ اخلاق اور تادیبِ نفس اور حصولِ کمال مقصود تھا اور یہاں امتحان میں کامیاب ہونا سند حاصل کر لینا اور بالآخر روٹی کمانا مطلوب ہے۔
پرانے زمانے میں مسلمانوں کی تعلیم کی یہ صورت تھی کہ ابتدا مکتب سے کی جاتی تھی جس میں پڑھنے لکھنے کی تعلیم شروع ہوتی اور جوں ہی بچہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جاتا ماں باپ کوشش کرتے کہ وہ شہر کے اچھے سے اچھے منشی سے فارسی کی تعلیم پائے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد فکر کی جاتی کہ عربی کی تعلیم کی ابتدا ہو اور اُس کے لئے بھی شہر کا بہترین عالم تجویز کیا جاتا۔ بچے کے باپ چچا بھی جوں کہ اُسی قسم کی تعلیم پا چکے تھے اس لئے یہ قابلیت رکھتے تھے کہ گھر پر اُس کی تعلیمی ترقی کی رفتار کو دیکھتے اور وقتاً فوقتاً اصلاح کرتے رہیں جب بچے کی عمر زیادہ ہو جاتی تو اگر اس کے دل میں تحصیل کا ذوق پختہ ہو جاتا تو وہ خود ہی اپنے لئے اُستاد تلاش کر لیتا۔ اِس میں مقامات کی دوری کا مطلق خیال نہ کرتا بلکہ کامل اُستاد کی شاگردی کے شوق میں بہت ہی دُور دراز مقامات کا سفر ایسی مسرت کے ساتھ اختیار کرتا جیسے کوئی شخص خوش نما شہروں اور خوش فضا منظروں کی سیر حظ اور تفریح کے لئے کرتا ہو۔ اِس دوران میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کے دل میں یہ خیال نہ آتا تھا کہ میں تحصیلِ علم کے بعد کسی بڑی خدمت کو حاصل کرونگا یا اپنے علم کو اِس طرح پر استعمال کروں گا کہ اُس

سے ثروت اور حکومت نصیب ہو۔

افسوس ہے گزشتہ صدی میں جب انگریزی تعلیم کا چرچا ہوا اور نئے مدرسوں کی بنیاد پڑی تو اس بات کی مطلق کوئی کوشش نہ کی گئی کہ پرانے طرز تعلیم میں جو چیزیں مفید تھیں اُن کو قائم رکھ کر نئی چیزیں اضافہ کی جاتیں بلکہ تعلیم کے پرانے نظام کی ہر چیز فرسودہ اور معیوب خیال کی جانے لگی اور سب سے زیادہ نقصان اس طرح سے ہوا کہ جو تعلق پرانے زمانے میں مدرسے اور گھر کے درمیان قائم تھا وہ ٹوٹ گیا۔ نئی تعلیم کی ضروریات اور اُس کے طرز عمل سے ماں باپ بالکل ناواقف تھے اُنھوں نے بچے کو اسکول میں داخل کرا دیا اور بے فکر ہو گئے۔ کسی قسم کی مدد یا اصلاح اُن سے کوسوں دور ہو گئی، اس لئے کہ انگریزی زبان نہ صرف بحیثیت تعلیم کے ایک مضمون کے حائل تھی بلکہ اُس کے علاوہ بھی جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ بھی ایک اجنبی زبان کے واسطے سے۔ اِس سے کتابی تعلیم اور اُس کے نتائج ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ تعلیم کا سب سے اہم مقصد بھی فوت ہو گیا یعنی ذہنی اور دماغی قوتوں کی تربیت اور ترقی۔ نئی تعلیم نے اگر پرانے نظام کی جگہ کوئی ایسا نظام قائم کر دیا ہوتا جو اُس پرانی چیز کا بدل صحیح معنی میں ہوتا تو یقیناً ہم اس نقصان سے محفوظ رہتے مگر یہ ایک امرِ محال ہے کہ ایک بیرونی چیز خواہ وہ اپنے اثر میں کیسی ہی قوی ہو اُس چیز کا بدل ہو سکے جو سالہاسال بلکہ صدیوں کی ذاتی اور قومی کوشش اور ذوق اور شوق کا نتیجہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ تعلیم کو داخلی ہونا چاہیئے نہ کہ خارجی، اور خارجی بھی وہ جسے غیر قوم نے اگر اپنی ضروریات کے لئے جاری کیا ہو۔ اِس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ مغربی تعلیم نے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ یقیناً بہت فائدہ پہنچایا جس کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہیئے، مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہماری قدیم تہذیب اور شائستگی کی بنیاد جو مسلمانوں کے لئے عربی اور فارسی تھی اور اب تک ہے اور ہندوؤں کے لئے سنسکرت اور ایک حد تک فارسی اُسے اس نئی تعلیم نے متزلزل کر دیا۔ خود یورپی قوموں کی تہذیب کی بنیاد لاطینی اور یونانی زبانیں ہیں اور کوئی یورپی قوم اِس بات پر ہرگز تیار نہ ہو گی کہ اِن قدیم زبانوں کی تعلیم اُس کے نصاب سے مطلقاً خارج کر دی جائے اس لئے کہ اُن کی تہذیب و تمدن کی بلند پایہ عمارت

اسی بنیاد پر کھڑی ہے۔ اُنھوں نے اگر لاطینی اور یونانی تصانیف اور دونوں زبانوں کی تعلیم سے قطع نظر کیا ہے تو صرف سائنس اور عملی فنون کی تعلیم میں۔ اِن کے علاوہ جتنے علوم یورپ میں متداول ہیں اُن کے لئے لاطینی اور یونانی زبانوں کا جاننا اور اُن کی اہم تصانیف سے واقف ہونا تحصیل علوم کی پہلی شرط ہے۔ ہمارے لئے انگریزی تو ایک لابدی مضمون قرار دے دی گئی ہے لیکن یورپ کی قدیم زبانیں اگر لازم بھی کر دی جائیں تو بھی وہ کسی طرح ہماری تہذیب کی بنیاد کا کام نہیں دے سکتیں۔ یورپ کی تمام اعلیٰ اور ادنیٰ درس گاہوں میں ان زبانوں کی جو تعلیم ہوتی ہے وہ ویسی ہی مکمل اور پختہ ہوتی ہے جیسی اب سے سو پچاس برس پہلے ہمارے شرفا کے گھرانوں میں عربی اور فارسی کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ پرانے زمانے میں ہمارے ہاں قدیم زبانیں دماغوں کو جلا دینے کا سب سے بہتر ذریعہ سمجھی جاتی تھیں اور یورپ کے ماہران تعلیم نے یہ خیال متواتر اور نہایت تاکید کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ اگر قدیم زبانوں اور ذہنی علوم کی تعلیم بند کر دی جائے تو اُس کے ساتھ اُن کی دماغی ترقی بھی مسدود ہو جائے گی اور محض عملی علوم اُن کو اِس تہلکے سے نہ بچا سکیں گے۔

لیکن، حضرات، آپ ضرور یہ اعتراض کریں گے کہ دوسری قومیں، جو ہمارے ساتھ اس وسیع ملک میں بستی ہیں، انگریزی کے ذریعے سے مختلف علوم میں اعلیٰ ترقی حاصل کر رہی ہیں، بلاشبہ۔ مگر اس سے اُس کی نفی لازم نہیں آتی جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ ہمارے ہندو ہم وطنوں نے مغربی تعلیم کی طرف بہت جلد توجہ کی مگر اُنھوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی قدیم علمی زبان سنسکرت کو اور اپنی دیسی زبان کو ہرگز نہ بھولیں گے۔ پس سنسکرت کی تعلیم کو کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے تقویت پہنچ رہی ہے۔ اس خصوص میں مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کے اسباب اور ہیں۔ ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی مدرسوں میں مسلمان اساتذہ کی تعداد نہایت ہی کم ہے اور فارسی عربی کے مدرسوں سے قطع نظر کیجئے تو اکثر اور بیشتر مدرسوں میں ایک مسلمان مدرس بھی نہ ملے گا۔ اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اور مذہب والے مدرسوں کے وجود سے مسلمان بچوں کو کوئی نقصان پہنچتا ہے بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ مسلمان معلموں کے مطلق نہ ہونے یا بہت کم تعداد میں ہونے سے

مسلمان بچوں کے خیالات پر یقیناً یہ اثر پڑتا ہے کہ ہماری قوم کے لوگ اکثر علوم کے حاصل کرنے سے عاری ہیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ غیر مذہب والے مدرس، مسلمان بچوں کے ان غلط خیالات کی کوئی اصلاح نہیں کر سکتے جن خیالات میں کچھ نہ کچھ مذہب کا لگاؤ ہوتا ہے. میں اپنے ذاتی علم سے کہہ سکتا ہوں کہ بعض ہندو مدرس، اسلام کے اصول اور دیگر مذہبی امور سے ایسی اچھی واقفیت رکھتے ہیں کہ وہ بلا مبالغہ مسلمان بچوں کو ان کے مذہب کی بھی تعلیم دے سکتے ہیں، لیکن غلط فہمیوں کے خوف سے وہ ہمیشہ ایسی بحثوں سے احتراز کرتے ہیں اور یہ ان کی محض نیک نیتی ہے۔

اس بیان سے میں صرف اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ تعداد میں تعلیم و تعلّم کو اپنا پیشہ بنانا چاہئے۔ "تعلیم" کے ساتھ "تعلّم" کا لفظ میں نے عمداً اضافہ کیا ہے۔ اس لئے کہ ہم میں سے جو صاحب اس پیشے کو اختیار کریں وہ صرف یہی کہہ کے بری الذمہ نہ ہو جائیں کہ ہم نے شاگرد کو عبارت پڑھا دی اور اس کے معنے بتا دئے، ہمارا کام ختم ہوگیا بلکہ ان کو چاہیئے کہ خود بھی مطالعہ جاری رکھیں اور علم اور تعلیم کے تمام امور میں گہری دلچسپی پیدا کریں ویسی ہی گہری دلچسپی جیسی کہ ایک کبوتر باز کو کبوتر بازی کے تمام چھوٹے اور بڑے معاملات سے ہوتی ہے۔ ان کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اپنے کم عمر شاگردوں کو علم کے مختلف مدارج طے کرنے کی طرف جن ترکیبوں سے بھی ہو سکے، رغبت دلائیں اور جو بچے جس کسی خاص مضمون کی طرف مائل ہوں، ان کو اسی شعبے میں ترقی کرنے میں مدد دیں جو طلبہ اسکول کے اعلیٰ مدارج طے کر چکیں ان کو نہ صرف ان کے استاد بلکہ ان کے اعزا و اقربا بھی تعلیمی پیشہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔

جہاں میں نے پرانی تعلیم کو بہت کچھ سراہا ہے وہاں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ پرانی تعلیم، اسی پرانے ڈھنگ پر، موجودہ زمانے میں ہمارے درد کی دوا نہیں ہو سکتی مسلمانوں کے علمی عروج سے لے کر اس وقت تک اتنے نئے علوم ظہور میں آئے ہیں اور پرانے علوم میں ایسی توسیع ہو گئی ہے کہ ان سے بے اعتنائی نہ صرف مضر

ہو گی بلکہ اچھا خاصا دیوانہ پن۔ نہ صرف قدیم علوم کے لئے بلکہ قدیم اور جدید زبانوں کی تعلیم کے لیے بھی اِس بات کی شدید ضرورت ہے کہ نئے طرزِ تحقیق اور نقد و تبصرہ کے اصول کی مدد سے ہم پرانے علوم و فنون کو تازگی اور شگفتگی بخشیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علمی کام یونیورسٹیوں سے متعلق ہے۔ مگر حضرات، یونیورسٹیاں اپنے اِس فرض کو ہرگز پورا نہیں کر سکتیں، جب تک کہ اسکول اور کالج اپنے طالب علموں میں اول روز سے اس اہم کام کی بنیاد نہ رکھیں اور اُن کے دماغوں کو اِس کام کے لئے پوری طرح تیار کر کے یونیورسٹیوں تک نہ پہنچائیں۔ مسلمان طالب علموں کی حالت تو یہ ہے کہ جب وہ اسکول کے نصاب کو طے بھی کر لیتے ہیں تو یونیورسٹی میں آکر اُن کی ہمتیں بالکل پست پائی جاتی ہیں۔ ریاضی اور سائنس کے جملہ مضامین سے وہ خائف ہوتے ہیں اور اپنی تعلیم کے لئے ایک ایسا نصاب تلاش کر لیتے ہیں جس میں وہ کم سے کم محنت کر کے امتحان کے پھندے سے نکل جائیں اور اُس کے بعد پھر کسی علمی کتاب کو ہاتھ لگانے کی تکلیف اُنہیں نہ کرنی پڑے۔ اور تو اور فارسی اور عربی کے بارے میں اُن کے خیالات یہ ہیں کہ عربی نہایت مشکل زبان ہے اس لئے اُس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے، فارسی نسبتاً آسان ہے صرف امتحان میں آسانی کی غرض سے اُسے اختیار کرنا مصلحت ہے۔ اِس بے دلی اور بے دماغی کا جو نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں اُسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں

حضرات! آپ بُرا نہ مانیں اِس خرابی کے ذمہ دار یا تو اسکولوں کے فارسی اور عربی پڑھانے والے ہیں یا طالب علموں کے سرپرست جو اِس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ اب عربی فارسی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ مسلمانوں میں جو گروہ تعلیم یافتہ کہلاتا ہے اُس کو بھی عموماً تعلیم سے دلچسپی اُسی قدر ہے جس قدر اُس کی ضرورت امتحانوں میں کامیابی کے لئے ہے، وہ اپنی اولاد کو جب تک بالکل مجبور نہیں ہو جاتے، سررشتۂ تعلیم کی ملازمت نہیں کرنے دیتے۔ جو قوم اِس شریف ترین پیشے سے اِس درجہ بیزار ہو اُس کا حشر معلوم

حضرات! میں نے قوم کی ناگفتہ بہ حالت اور تعلیم سے اُس کی بے اعتنائی کی داستان

سُنا کر یقیناً آپ کی طبیعتوں کو مکدر اور دلوں کو مایوس کر دیا ہے جو میرا ہرگز مقصود نہ تھا۔ مسلمانوں کو "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ" کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمت کی کمر باندھ کر ہم سب کام کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم معلموں کا یہ کمزور گروہ بھی اگر کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو زیادہ زمانہ نہ گزریگا کہ ہم لوگ اپنے گروہ کی کھوئی ہوئی قوت اور رو قعت کو باوجود تمام مشکلات کے ایک بار پھر حاصل کر لیں گے۔

آپ حضرات جو اس وقت جمع ہوئے ہیں یقیناً ایسی تحریکیں پیش کرتے کو ہیں جن سے، خدا چاہے گا، ہماری ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ بشرطیکہ ہم اُن کے مطابق عمل پیرا ہونے سے کسی طرح پہلو تہی نہ کریں۔ میرے ذہن میں جو چند تجویزیں ہیں اُن کو آپ صاحبوں کے غور کے لئے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہر قسم کی درس گاہوں میں ایسے مسلمان اُستادوں کی تعداد بڑہائی جائے، جنھوں نے مجبوری سے نہیں بلکہ اپنے شوق سے معلمی کا پیشہ اختیار کیا ہو اور علاوہ اور علوم و فنون کے تعلیم کے نظری اور عملی اصول کا مطالعہ اور تجربہ بھی کیا ہو۔ جب ہر مضمون کے پڑھانے والے مسلمان اُستادوں کی ایک قرار واقعی تعداد رفتہ رفتہ موجود ہو جائے گی تو تھوڑے ہی دنوں میں یونیورسٹیوں میں بھی مسلمان طلبہ ہر شعبے میں نمایاں ہوں گے۔ اُستادوں سے میری مراد صرف مرد اُستاد نہیں بلکہ اُستانیاں بھی ہیں۔ قومی تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہے کہ شریف گھرانوں کی بیویاں تعلیم یا تدریس کے کام کو اختیار کریں خصوصاً چھوٹے بچوں کی تعلیم کو عورتیں مردوں سے بدرجہا بہتر انجام دے سکتی ہیں۔ شاید بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ ڈاکٹر مونٹی سوری، جن کا طریقۂ تعلیم چھوٹے بچوں کے لئے اس وقت سب سے بہتر مانا جاتا ہے، وہ مرد نہیں بلکہ آسٹریا کی ایک خاتون ہیں۔

۲۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ عربی اور فارسی پڑھانے والے مدرسوں کے لئے بھی ٹریننگ کالجوں میں خاص طور سے ٹریننگ کا انتظام کرنے کی تجویزیں عمل میں

لائی جائیں۔

۳۔ عربی اور فارسی کے تمام امتحانوں کا نصاب اور معیار ایسا ہو کہ اُس سے گزر کر جو طالب علم آگے بڑھے اُسے اِن زبانوں میں پختہ اور کافی استعداد ہو۔

۴۔ عربی اور فارسی سے پہلے اُردو کی معقول تعلیم تقریباً تین سال تک ہونا لازم ہے اور اسی دوران میں حساب، جغرافیہ، حفظانِ صحت اور بعض اور مضمونوں کی تعلیم بھی شروع ہو جانی چاہیئے۔ آگے چل کر اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی نصاب میں شامل کرنا چاہیئے اس لئے کہ خصوصاً بھاشا نظم ہمارے ادب کا ایک لاینفک جزو ہے۔ اب سے تیس چالیس برس پہلے تک مُسلمانوں میں ہندی نظم کے قدرشناس کثرت سے موجود تھے اور ہندی کے مُسلمان شاعر بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ایک چھوٹے سے قصبے بلگرام میں بہت سے مُسلمان شاعر گزرے ہیں جن کا ہندی کلام قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اِسی سِلسلے میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم میں جو طالب علم سنسکرت کی طرف مائل ہوں اُن کو خاص طور پر مدد دینا چاہیئے اِس لئے کہ اپنے وطن کی پُرانی علمی زبان کا جاننا مُسلمانوں کے لئے بھی ہر حیثیت سے مفید ہوگا۔

ممکن ہے کہ بعض صاحبوں کو یہ اعتراض ہو کہ زبانوں کی اتنی طول طویل فہرست کا بارِ گراں ہمارے بچّوں سے نہ اُٹھ سکے گا۔ اِس کے جواب میں، میں یہ عرض کروں گا کہ یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے۔ جرمنیہ اور یورپ کے اور بہت سے ملکوں میں اسکولوں کی آخری چھ جماعتوں میں کم سے کم پانچ زبانوں کی تعلیم لازمی ہے اور اُن کے علاوہ کئی اور زبانوں کی تعلیم کا انتظام تقریباً ہر مدرسے میں ہوتا ہے جن کو بعضے طالب علم، اُن پانچ لازمی زبانوں کے علاوہ، اپنے شوق سے اختیار بھی کرتے ہیں۔ البتہ اُن مدرسوں میں جو عملی مضمونوں اور سائنس کی تعلیم کے لئے مخصوص ہیں تین ہی زبانیں لازماً پڑھنی پڑتی ہیں اس لئے کہ اُن طالب علموں کو لاطینی اور یونانی کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ماننے کے لئے میں کسی طرح تیار نہیں کہ یورپ کے بچّوں کے دماغ ہمارے صوبے کے بچّوں کے دماغوں سے زیادہ قوی ہیں۔ اُن کی برتری اگر ہے تو اسی میں کہ اُن کی قوموں میں

صدیوں سے اجتماعی زندگی ترقی کرتی رہی ہے اور اس لئے اُن کی عادتوں اور رسم و رواج نے حصولِ علم کو اُن کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ زبانوں کے متعلق تو میرا یہ خیال ہے کہ اُن کے سیکھنے اور کمال کے ساتھ سیکھنے کی جو قابلیت اُردو بولنے والی قوم میں ہے اُس کا مقابلہ سوار وسیوں (اور پارسیوں) کے کوئی اور قوم نہیں کر سکتی۔ ہمارے بچوں کے لئے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تعلیم دینے کے طریقہ میں اصلاح کی جائے اور وہ بغیر اچھی کتابوں اور خاص تربیت پائے ہوئے معلموں کے ممکن نہیں۔

۵۔ ثانوی تعلیم (یعنی سکنڈری اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن) کے دوران میں جو مختلف مضمون ایک طالب علم اختیار کر سکتا ہے اُن کے متعلق یہ کوشش کی جائے کہ ہر مضمون میں مسلمان طلبہ کی ایک معقول تعداد داخل ہو۔ لیکن یہ جب ہی ممکن ہوگا کہ ابتدائی مدرسوں میں قابل مسلمان مدرسوں کی تعداد کافی ہو اور ان کی کوشش اور اثر سے مسلمان بچے اپنی عمر کی مناسبت سے مختلف مضمونوں میں پختہ کار ہو کر ثانوی مدرسوں میں جائیں اسی طرح ثانوی مدرسوں میں بھی مسلمان اُستادوں کی ایسی کافی تعداد ضروری ہے جو اپنی مثال سے ان بچوں کے ازدیادِ شوق کا باعث ہوں اور یوں اُن کی ہمتیں بڑھا کر اُن کی علمی اُمنگوں کو ترقی دیں۔

اس میرے بیان سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ تربیت یافتہ معلموں (یعنی ٹرینڈ ٹیچرس) کی مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے کیسی شدید ضرورت ہے اور ٹرینڈ بھی وہ جو اپنے شوق سے بلکہ ایک ثوابِ عظیم کا کام سمجھ کر مدرسوں کے زمرے میں شامل ہوئے ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص کو یہ اپنا فرض سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنے نوجوان بیٹوں، بیٹیوں اور رشتہ داروں کو جو اچھے دماغ اور اچھے اخلاق رکھتے ہوں معلمی کی طرف راغب کرے اور جتنی زیادہ تعداد میں ممکن ہو اپنے اثر سے مسلمان نوجوانوں کو مدارس کی ملازمت میں داخل کرے، عام اِس سے کہ وہ مدارس چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اگر اس تدبیر پر عمل کیا گیا تو دس ہی بارہ برس میں آپ دیکھ لیں گے کہ مسلمان کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

آخر میں پھر میں اِس غلط فہمی کو رفع کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تجویزیں، جو میں نے پیش کی ہیں، خدانخواستہ اس وجہ سے ہیں کہ میں مسلمانوں کے تعصب کو اُکسانا چاہتا ہوں حاشا

ایسا نہیں بلکہ میں تعصب کو بدترین خصائل تصور کرتا ہوں۔ ساتھ ہی اس کے میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر مدرسے میں چاہیے وہ سرکاری ہو یا قومی، ہندو اور مسلمان دونوں مذہبوں کے ماننے والے اُستادوں کا ہونا ہماری قومی تعلیم کے لیئے نہایت ضروری ہے اس لئے کہ اگر ہم دونوں کو اپنے وطن میں رہنا اور عزت کے ساتھ رہنا ہے تو ایک کو دوسرے کے خیالات و حالات اور رسم و رواج اور سب سے زیادہ علمی اور ذہنی اور روحانی اُمنگوں سے بچپن ہی سے واقف ہونا چاہیئے۔

آخر میں میں آپ حضرات کی عنایت کا شکریہ پھر ایک بار ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس جلسے کی صدارت کا اعزاز مجھے عطا کیا اور میری اس تقریر کو نہایت صبر کے ساتھ سُن کر مجھ پر کرم پر کرم فرمایا۔

جغرافیہ اور اُس کا طریقۂ تعلیم

مولوی غلام دستگیر صاحب فاروقی مددگار مدرسۂ وسطانیہ چنچل گوڑہ

تاریخ

تاریخ سے ظاہر ہے کہ تقریباً نصف صدی پہلے مضمون جغرافیہ کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی، جو آج اس کو حاصل ہے۔ اہمیت کس طرح حاصل ہوتی! یہ تو علم ہیئت کا ایک جُز تھا۔ اس میں صرف پہاڑ، دریا، شہروں کے نام اور پیداوار کا ذکر ہوتا تھا جس سے اس مضمون میں کوئی ایسا مقناطیسی اثر نہیں تھا، جو مطالعہ کرنے والوں کی طبیعت کو اپنی طرف مائل کرتا۔ اس لئے یہ مضمون بہت خشک ہو گیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلم اور متعلم ہر دو کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ جہاں یہ مضمون خشک تھا، وہاں اس کا طریقۂ تعلیم بھی غیر موثر اور دلچسپی سے خالی تھا جس سے طلبہ کا زیادہ وقت پہاڑ، دریا اور شہروں کے نام رٹنے میں صرف ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم سے قوت متخیلہ، قوت استدلال اور قوت فیصلہ کی تربیت نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر یہ مسلّم ہے کہ مضمون جغرافیہ کی تعلیم اس نہج سے ہو کہ ان قوا کی تربیت اور اُن کا نشو و نما ساتھ ساتھ ہوتا رہے۔

وسعت ۔ دورِ جدید مسئلہ ارتقا کا علم بردار ہے۔ اس مسئلہ کے تحت دنیا کے دیگر علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ مضمون جغرافیہ کا بھی ترقی کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ماہرانِ علم جغرافیہ نے دنیا کے نامعلوم اور دور دراز قطعات ارض کو دریافت کر کے اس فن میں علم ہیئت، طبقات الارض، طبعیات، معاشیات، حیاتیات اور تاریخ وغیرہ جیسے اہم فنون شامل کر کے اس کو بھی ایک علیحدہ فن اور سائنس کے درجہ تک پہنچا دیا۔ یہ انہیں کی ان تھک کوشش کا نتیجہ ہے کہ دوسرے علوم وفنون کے طرح مضمون جغرافیہ بھی کالج کی اعلیٰ ترین جماعتوں میں پڑھایا جاتا ہے اور آج ہم کو اس کے بھی ایم۔ اے ہدست ہوتے ہیں۔

فوائد ۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ دنیا میں ہر کام اس کے فوائد کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ اور انسان انہیں علوم وفنون کو زیادہ حاصل کرتا ہے جس کے فائدے زیادہ ہوں۔ اس کلیہ کے تحت یہ امر دریافت طلب ہے کہ مضمون جغرافیہ سے وہ کونسے فوائد حاصل ہوتے ہیں جن سے انسان بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

اگر ہم گہری نظر سے دیکھیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ زندگی کا ایسا کوئی پیشہ نہیں ہے جس میں جغرافیہ کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ انسانی جماعت کے سب سے اہم اور مہتم بالشان پیشہ زراعت کو لیجیے تو ظاہر ہوگا کہ ایک با اصول کاشتکار کو جغرافی معلومات نہایت ضروری ہیں اس حقیقت کے مدنظر کہ کابل جاکے آم کا پودا کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ زمین کی نوعیت معلوم کی جائے کہ آیا اس میں تری کی کاشت ہو سکتی ہے یا خشکی کی؟ ساتھ ساتھ موسموں کے تغیرات کا جاننا بھی اس کے لئے لازم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پیداوار کا دارومدار زیادہ تر زمین کی نوعیت اور موسموں کے اثرات پر ہے۔ آبپاشی، کھاد، کاشت کی نگہداشت اور اس کی نتقلی کے اصول سے واقف ہونا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے ورنہ وہ ایک کامیاب کاشتکار کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ جغرافی حالات ہی کا نتیجہ ہے کہ بمبئی میں روئی کی گرنیوں کی کثرت، بنگال میں سن کے کارخانوں کی زیادتی اور رنگون میں چاول صاف کرنے کی مشینوں کی بہتات ہے۔ مانچسٹر کے سوتی کپڑے شفیلڈ کا فولادی سامان اور پورٹس موتھ کی جہاز سازی بھی جغرافی حالات ہی کی رہین منت ہے۔

اگر صناع ان تمامی حالات سے واقف نہ ہوں تو آج یہ صنعتیں ایک ایک کرکے دُنیا سے اٹھ جائیں۔

یورپ اور امریکہ کی اقوام کو آج جو چار چاند لگے ہیں اس کا راز ان کی تجارت میں مُضمر ہے۔ یہ تجارت کی برکت تھی جس کی بدولت پُرتگیزی۔ ولندیزی۔ فرانسیسی اور انگریز یکے بعد دیگرے ہندوستان کے مالک بن گئے۔ کیا حقیقت بیں نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ ہے کہ ہندوستان کے بحری راستہ کی دریافت محض تجارت کی غرض سے نہیں ہوئی؟ اور کیا یہ دریافت بغیر جغرافی علم کے ظہور میں آئی؟ یہ جغرافی معلومات ہی تھے جنہوں نے کولمبس کو امریکہ کا واسکوڈی گاما کو سواحل ہند کا اور کُک کو آسٹریلیا کا مالک بنا دیا۔ واقف کاران حقیقت اچھی طرح سے یہ جانتے ہیں کہ ایک کامیاب تاجر کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ وہ سامان کے حمل ونقل کے مختلف ذرائع سے پُوری طرح واقف ہو۔ اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ فلاں چیز کہاں کثیر مقدار میں ہمدست ہوتی ہے اور کہاں ارزاں اور یہ کہ اس کی نکاسی کس جگہ منفعت بخش اور آسان طریقہ سے ہوسکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان امور اور مضمون جغرافیہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

فن جغرافیہ مدبرین سلطنت کا ایک اچھا رہنما ہے جس کی مدد سے وہ زمین کی نوعیت کے لحاظ سے مالگزاری قائم کرسکتے ہیں۔ آبپاشی کے ذرائع جاری کرسکتے ہیں ملک میں آمد ورفت کے وسائل اختیار کرسکتے ہیں۔ چنانچہ یہ مدبرین سلطنت ہند کے جغرافی معلومات ہی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب میں نہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اور مدراس میں تالابوں کی بہتات ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں مدبرین اور ماہرین فن جنگ کا اس امر پر اجماع تھا کہ جغرافی نقطۂ نظر سے جرمنی کا محل وقوع اس قابل نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی عظیم الشان جنگ کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے۔ چنانچہ اپنے ملک کی جغرافی حالات کو نظرانداز کرنے سے جرمنی کو جو کچھ نقصان اُٹھانا پڑا اس سے ہر شخص واقف ہے۔

اہمیت ـــــــ ۱۔ آج وہی قوم مہذب اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہے، جو اپنا ایک

خاص تمدن رکھتی ہو اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تمدن کی عمارت کی بنیاد جغرافی حالات پر منحصر ہے۔ اگر یہ حالات کسی ملک یا قوم کی ترقی کے ممدو معاون نہ ہوں تو وہ ملک یا قوم اپنا تمدن قائم کر ہی نہیں سکتی۔ عالمان تاریخ نے مصر اور ہند کے تمدن کو نہایت قدیم مانا ہے۔ ان دونوں کی بنیادوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ جہاں مصر کا تمدن دریائے نیل کا رہین منت ہے وہاں ہمالہ کی بدولت ہندی تمدن نے جنم لیا۔ اگر ہندوستان کے شمال میں ہمالہ نہ ہوتا تو ہند میں پانی کا کال ہوتا۔ اس کی زمین زرخیز ہونے کی بجائے بنجر ہوتی۔ یہاں آئے دن حملوں کا خوف لگا رہتا۔ جس کی وجہ سے باشندگاں ہند نہ شہری زندگی بسر کرتے اور نہ وہ چار دانگ عالم میں صنعت سازی کے موجد ہوتے جس کا یورپ مدتوں گاہک رہا ہے۔

منگولیا کے سردار اعظم چنگیز خان اور اس کے جانشینوں نے ایشیا میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی مگر منگولیا کے لق و دق صحرا، آب و ہوا اور دیگر جغرافی حالات نے ان پر ہیبت فاتحوں کو اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنے وطن مالوف میں کم از کم تمدن کی داغ بیل ڈالتے۔ اور یہ بیچارے داغ بیل ڈالتے ہی کس طرح جب کہ عام باشندے بارش اور اناج کی قلت سے خانہ بدوش زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور ہیں جس سے تمدن کی بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ زمانہ ماضی کی راگنیوں کو الاپنے کی بجائے اگر ہم موجودہ زمانہ ہی کے حالات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یورپ کی ترقی کا راز بھی جغرافی حالات ہی میں مضمر ہے۔ یورپ کا وسط دنیا میں واقع ہونا جس کی وجہ سے اہل فرنگ کا دنیا کے ہر حصہ میں بسہولت آنا جانا، اس کے پہاڑوں کا رخ جس سے بر اعظم کے بہت بڑے حصہ میں کافی بارش کا ہونا، اس کے جہاز رانی کے قابل دریا، اس کے ساحل کا زیادہ کٹا پھٹا ہونا، اس کی صحت افزا و توانا کرنے والی آب و ہوا، زرعی اور معدنی پیداوار کی فراوانی یہ ایسے جغرافی حالات ہیں جنہوں نے باشندگان بر اعظم کو شہری زندگی کا موقع دیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے علوم و فنون کے دریا بہا دئے ایک طرف ان دریاؤں کے سیلاب نے قدیم تمدنوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تو

دوسری طرف اُنہیں کی آبیاری نے اہل فرنگ کی تہذیب کی کھیتی کو سرسبز و شاداب کر دیا، جس سے تمام اقوام عالم مستفیض ہو رہی ہیں۔

اس سے یہ واضح ہے کہ جغرافیہ کا راست تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ لہذا اس مضمون کی تعلیم کے وقت حتی الامکان اس بات کی کوشش ہونی چاہیئے کہ جغرافیہ کی ہر بات انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو سے وابستہ ہو۔ اب نیچے کی سطروں میں اس اُصول کو عملاً پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

طریقہ تعلیم جماعت دوم:- ایک چیز فی نفسہ بہت عُمدہ اور مُفید ہوتی ہے مگر اس کے بے اُصولی استعمال سے اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ناول ہی کو لیجئے کہ اس سے زبان اور سیرت ہر دو کی درستی ہوتی ہے مگر بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اس کے غلط استعمال سے گمراہ ہو جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ اچھے ناول کا قصور نہیں بلکہ اُس کے مطالعہ کرنے والوں کا ہے۔ اسی طرح بعض مفید مضامین نصاب بے اُصولی تعلیم کی وجہ سے طلبہ کے بار خاطر ہوتے ہیں اور وہ ابتداہی سے اُن سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین میں جغرافیہ بھی داخل ہے، جس کی تعلیم کی ابتداہی ایسے طریقہ سے ہوتی ہے جو کم عمر طلبہ کے لئے نہ مفید ہی ہوتی ہے اور نہ دلچسپ۔ حالانکہ اس مضمون کی ابتدائی تعلیم بے حد مفید اور دلچسپ ہے۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ مضمون جغرافیہ کس جماعت سے شروع ہو اور یہ کہ اس جماعت میں کیا پڑھایا جائے بلکہ اپنے ناچیز تجربہ کی بنا پر ہم کو اس موقع پر یہ بتانا مقصود ہے کہ جو نصاب جماعت واری اس وقت مقرر ہے اُس کو کس طرح پڑھایا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ مضمون جغرافیہ کی تعلیم جماعت دوم سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس میں اصطلاحات جغرافیہ کی تعلیم داخل نصاب ہے۔ اصطلاحات کو محض رٹا دینے سے نہ اُن کے صحیح تصورات طلبہ کے ذہن نشین ہو سکتے ہیں اور نہ ان سے کوئی لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ اصطلاحات کی تعلیم بالکلیہ مشاہدہ کے ذریعہ دی جائے اور اُن کی تعریفات جہاں تک ممکن ہو بذریعہ سوالات اُنہیں سے اخذ کرائی جائیں اور اس کے لئے آسانی سے

حسب ذیل طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) کم عمر طلبہ کھلے مقام کی تعلیم کو جب کہ انہیں کھیل کا بھی موقع ملے بیحد پسند کرتے ہیں۔ پس احاطۂ مدرسہ میں کسی ایک نمایاں جگہ تمام اصطلاحات کا ریلیف میپ تیار کیا جائے اور تعلیم کے وقت طلبہ کو اس نقشہ کے اطراف جمع کیا جائے۔ ان میں سے چند کو اس نقشے کی مختلف اشکال میں پانی ڈالنے کے لئے کہا جائے۔ ظاہر ہے کہ پانی پڑنے کے بعد مختلف اصطلاحات کی شکلیں اور نمونے تیار ہو جائیں گے۔ مدرس اب کوئی ایک اصطلاح مثلاً جزیرہ کو لے اور سابقہ معلومات کی بناء پر طلبہ سے دریافت کرے کہ وہ اس خشکی کے حصہ کے اطراف کیا دیکھتے ہیں اور یہ کہ اس کے کتنے طرف پانی ہے۔ یہ تصور اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشین کرایا جائے کہ یہ خشکی کا ایک حصہ ہے جس کے چاروں طرف پانی ہے۔ پھر ان کو اس کا نام بتایا جائے اور اس کے بعد ہی دریافت کیا جائے کہ جزیرہ کس کو کہتے ہیں۔ اگر طلبہ اس کی تعریف کرنے سے قاصر رہیں تو ازسر نو خشکی کے حصہ کو بتا کر دریافت کیا جائے کہ یہ کیا ہے؟ جواب ملے گا کہ یہ خشکی کا حصہ ہے پھر یہ دریافت کیا جائے کہ اس کے چاروں طرف کیا ہے؟ جواب دیا جائے گا کہ پانی ہے۔ مگر جواب مکمل لیا جائے یہ کہ اس کے چاروں طرف پانی ہے اب یہ پوچھا جائے کہ کس حصہ کے چاروں طرف پانی ہے؟ آخیر میں اس کا نام دریافت کیا جائے۔ اس کے بعد ہی اس کی تعریف پوچھی جائے طلبہ اگر اب بھی تعریف نہ کرسکیں تو ان کے دیئے ہوئے مختلف جوابوں کو ایک جگہ جمع کرکے انہیں کے الفاظ میں تختہ سیاہ پر لکھا جائے مثلاً خشکی کے اس حصہ کو جس کے چاروں طرف پانی ہو جزیرہ کہتے ہیں اور یہ تحریر ان سے پڑھوائی جائے اس عبارت کی مشق کے بعد اس کو مٹا دیا جائے اور ان سے مکرر جزیرہ کی تعریف پوچھی جائے۔ اس طرح جزیرہ کا تصور اور اس کی تعریف اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشین کی جائے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ دو متضاد چیزوں کے مقابلے سے اُن کا صحیح تصور ذہن نشین ہو جاتا ہے مثلاً نرم اور سخت اشیاء طلبہ کے سامنے پیش کی جائیں تو نرمی اور سختی کا صحیح تصور ان کے ذہن نشین ہو جائے گا۔ اسی اصول کے تحت اگر دو متضاد اصطلاحیں لیکے بعد

دیگرے بتائی جائیں تو بہت مُفید ہوگا۔ پس جزیرے کے بعد تالاب سے جھیل کا تصور دلاکر اس کی تعریف نکلوانا فائدہ سے خالی نہیں۔ اب طلبہ کو جھیل بتا کر (مگر پہلے ہی نام نہ بتایا جائے) اِس قبیل کے سوالات کئے جائیں۔ یہ کسی چیز کا حصّہ ہے ؟ (جھیل پر ہاتھ رکھکر) جواب ملے گا کہ تری یا پانی کا حصّہ ہے۔ اس تری کے حِصّے کے چاروں طرف کیا ہے؟ جواب دیا جائے گا کہ اِس کے چاروں طرف خشکی ہے۔ اِس کے بعد نام بتایا جائے اور آخیر میں مثل جزیرہ کے تعریف نکلوائی جائے۔ پھر جزیرہ اور جھیل کا مقابلہ کرایا جائے۔ مثلاً جزیرہ خشکی کا حِصّہ ہے اور جھیل تری کا جزیرہ کے چاروں طرف تری ہے ۔ مگر جھیل کے چاروں طرف خشکی ہے۔ اِسی سلسلہ میں تالاب اور جھیل میں جو فرق ہے وہ بھی بتا دینا بے محل نہ ہوگا۔

اب یہ بحث رہجاتی ہے کہ اِن اصطلاحوں کو انسانی زندگی سے کس طرح مربوط کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ اکثر طلبہ تالاب اور اُس کے فوائد سے واقف ہوتے ہیں۔ اس سابقہ واقفیت اور ربیع کی مدد سے اُنہیں یہ بتایا جائے کہ اکثر دریا جھیل سے نکلتے ہیں۔ انہیں دریاؤں کا پانی بعض تالابوں میں لیا جاتا ہے جس سے ہم اپنے کھیت اور باغ سیراب کرتے ہیں۔ اگر یہ پانی کے قدرتی خزانے نہ ہوں تو ہمارے دریا خشک ہو جائیں اور ہم کو کھانے پینے کی سخت تکلیف ہوگی۔ اس موقع پر جھیل نقشے میں دکھا کر اس سے نکلنے والے دریا کے فوائد طلبہ پر واضح کئے جائیں تاکہ جھیل کے فوائد کی حقیقی تصویر اُن کی نگاہوں کے سامنے کھینچ جائے۔

جزیرہ کا تعلق اس طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ لوگ موسم گرما میں کسی حوض یا باؤلی کے نزدیک بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور وہ اس لئے کہ یہاں بیٹھنے سے اُن کو زیادہ گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح جزیرے کے باشندوں کو عام طور پر زیادہ گرمی نہیں معلوم ہوتی جس سے اُن کی صحت اور طاقت میں ترقی ہوتی ہے۔ اور وہ ان دونوں کی مدد سے علوم وفنون اور دولت میں خوب ترقی کرتے ہیں مثال کے طور پر انگلستان اور جاپان کے لوگوں کی ترقی کا مختصراً ذکر مناسب ہوگا۔

اوپر کی تین اصطلاحوں کی تعلیم کے بعد جزیرہ نما، خلیج، خاک نائے، آب نائے،

میدان، سطح مرتفع، دریا، نہر اور معادن، پہاڑ، پہاڑی، سلسلہ کوہ، اور کوہ آتش فشاں اور بحر اعظم و بر اعظم وغیرہ اوپر کے اصول پر پڑھائے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ابتدائی دو تین اصطلاحوں کی تعلیم میں کچھ وقت پیش آئے مگر پھر معلم اور متعلم ہر دو کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔

(۲) اصطلاحات کی تعلیم کمرۂ جماعت میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت تختۂ سیاہ کا استعمال کثرت سے ہونا چاہیئے۔ وہ اس طرح کہ جس اصلاح کی تعلیم مقصود ہو اُس کو تختۂ سیاہ پر کھینچا جائے مثلاً جزیرہ نما اُس کا خشکی کا حصہ خاکی رنگ کی چاک سے اور تری کا حصہ نیلے چاک سے ظاہر کیا جائے۔ ہم نے پہلے جو سوالات بتائے ہیں اُسی قبیل کے سوالات اس وقت بھی کر کے جزیرہ نما کا صحیح تصور دلایا جا سکتا ہے۔ طلبہ سے بھی اس اصطلاح کا نقشہ ان کی بیاضوں یا خاکی رنگ کے موٹے کاغذ پر رنگین چاک سے کھینچوانا چاہیئے اس وقت نقشہ اصطلاحات کا استعمال بھی ضروری ہے۔ طلبہ سے اصطلاحات کے نقشوں کی خوب مشق کرائی جائے تاکہ وہ ہر اصطلاح کا نقشہ بسہولت کھینچ سکیں۔

(۳) چھوٹے بچّے ریت سے کھیلنے میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اصطلاحات کی تعلیم کے وقت اُن کے اس جذبے سے فائدہ اُٹھانا تعلیم کو فطرت کے موافق دینا ہے اصطلاحات کی تعلیم کے وقت ہر طالب علم اپنے سامنے ایک ٹرے رکھے جس میں ریت بھری ہوئی ہو۔ اب مدرس کی رہنمائی میں ریت سے مختلف اصطلاعات کی شکلیں بنائی جائیں۔ ان شکلوں کے اطراف جہاں جہاں ضرورت ہو پانی ڈالا جائے تاکہ ہر اصطلاح کی شکل واضح ہو جائے۔

(۴) عام طور پر اس طریقہ تعلیم کی بھی سفارش کیجاتی ہے کہ بارش کے بعد طلبہ کو میدان میں لے جا کر جغرافی اصطلاحات کی مختلف شکلوں کا عینی مشاہدہ کرایا جائے۔ اگر بارش کا موسم اچھا ہو اور طلبہ و مدرسین کو سہولت ہو تو اس اصول پر عمل کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں۔ (باقی داری)

انجمن اساتذہ حیدرآباد کا چوتھا سالانہ اجلاس | انجمن اساتذہ حیدرآباد کی انتظامی کمیٹی کے اجلاس میں یہ طے پایا کہ انجمن مذکور کی سالانہ کانفرنس کا چوتھا اجلاس بتواریخ ۲۸، و ۲۹، امرداد ۱۳۳۹ف مطابق ۳، و ۴، جولائی ۱۹۳۰ء بمقام حیدرآباد دکن منعقد ہوگا

اس اجلاس کی نمایاں خصوصیت یہ رہے گی کہ مثل سال گذشتہ مختلف سب کمیٹیوں کی رپورٹ اور غور و خوض کے نتائج و سفارشات کانفرنس میں پیش کئے جائیں۔ چنانچہ ایک قرار داد کے ذریعہ مندرجۂ ذیل سب کمیٹیوں کا تقرر عمل میں آیا اور ان کمیٹیوں نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے:-

(۱) سب کمیٹی تعلیم جغرافیہ:- صدر سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے کنٹب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و اطراف بلدہ — معتمد کے۔ بی شاستری صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ صدر مدرس فوقانیہ مفیدالانام

(۲) سب کمیٹی تعلیم تاریخ:- صدر ایس ہنمنت راؤ صاحب ایم۔ اے، ایل۔ ٹی پروفیسر نظام کالج — معتمد جی۔ اے چندور کر صاحب ایم۔ اے۔ صدر مدرس وسطانیہ رزیڈنسی

(۳) تعلیم ریاضی اور اُس کا زندگی سے تعلق:- صدر ریورنڈ ال ہمن پرنسپل ویسلی مشن ہائی اسکول — معتمد مسٹر جی سندرم ہیڈ ماسٹر مشنوڈ ٹ ہائی اسکول

جدید روس اور مسئلہ بے علمی | سویٹ روس نے ۱۹۲۹ء میں بے علمی کو دور کرنے کے جو تبلیغی ذرائع اختیار کئے وہ لائق ستائش ہیں۔ دس سال پیشتر تک روس میں جہالت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں مگر مسلسل کوشش اور لگاتار جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ وہاں کی فضا قریب بالکل بدل گئی اور بے علمی کو زیر کر لیا گیا۔ صرف ایک سال میں سرکاری طور پر ۲۵ کرور رسالے، کتابیں اور پمفلٹ شائع کئے گئے اور ملک کے طول و عرض میں اُن کی اشاعت اور تقسیم عمل میں آئی۔ ان میں سے ۷۰ فی صدی کسانوں اور کاریگروں میں تقسیم کئے گئے

اوران ابتدائی مدارس میں بھیجے گئے جہاں کسانوں اور کاریگروں کے بچے زیر تعلیم ہیں۔

لاطینی رسم الخط امسال نو سے روس میں بھی لاطینی رسم الخط کے رائج کرنے کی اطلاع ملی ہے۔ یہ انقلاب وہاں کی تعلیمی انجمن کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔

پانچویں کانفرنس آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشنس منعقدہ مدراس۔ آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس السوسی ایشن کے پانچویں سالانہ اجلاس میں امسال حال انجمن اساتذہ بلدہ کے، دو اراکین مولوی ظہور علی صاحب بی۔ اے صدر دارالعلوم اور مسٹر چندرور کر ایم۔ اے صدر مدرس وسطانیہ رسیڈنسی نے بحیثیت نمائندہ انجمن شرکت فرمائی۔ کانفرنس کی روداد انگریزی حصہ میں درج کی جارہی ہے اور خطبہ صدارت کا ترجمہ بھی اردو حصہ میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہاں قابل ذکر تحریکات کے نمایاں خط و خال درج کرنے پر اکتفا کی گئی، جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ کانفرنس میں متعدد تحریکات بحث و مباحثہ کے لئے پیش ہوی تھیں، مگر مندرجہ ذیل پروگرام مباحثہ چھڑ گیا۔

کانفرنس کی رائے میں مدارس ثانویہ اور اعلیٰ مدارج تعلیم میں، ذریعہ تعلیم مادری زبان ہونا چاہیے اور گورنمنٹ و یونیورسٹیوں پر لازم ہے کہ مادری زبان کو لازمی طور پر اختیار کریں۔

اس تحریک کی ترمیمات بھی پیش کی گئیں بعض کا یہ منشا تھا کہ رزولیوشن سے یہ فقرے "اعلیٰ مدارج تعلیم میں" اور "لازمی طور پر" خارج کردئے جائیں۔ مولوی ظہور علی صاحب نے بھی اس مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کا ذکر کیا اور ہماری زبان ذریعہ تعلیم ہونے کے باعث جو ترقی عثمانیہ یونیورسٹی نے کی ہے اس کو موثر الفاظ میں بیان کیا۔ بہت مباحثہ کے بعد ترمیمات نامنظور ہوئیں اور اصل تحریک بغلبہ آرا پاس ہوی۔

دوسری تحریک یہ تھی کہ معائنہ مدارس کے لئے بجائے ایک مہتمم کے کئی مہتمم، بلحاظ مضامین مقرر کئے جائیں اور وہ موجودہ مہتماں کے ساتھ اشتراک عمل کریں تاکہ بحیثیت مجموعی مدارس بہتر حالت میں کام کرسکیں۔ امریکہ میں یہی طریقہ رائج ہے، جو نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ اس تحریک پر طویل مباحثہ کے بعد بغلبہ آرا تصفیہ ہوا۔

سب سے معرکہ کا مسئلہ یہ تھا کہ طلبہ کو ازدواجی زندگی کی تعلیم دی جائے کیونکہ سن

بلوغ کو پہنچنے کے بعد سرد وگرم زمانہ سے انھیں دوچار ہونا پڑتا ہے لہذا اس سے بخوبی واقف کرادیا جائے۔ بعض نے یہ اعتراض کیا کہ طلبہ کو اس قسم کی معلومات کا بہم پہنچانا خطرات سے خالی نہیں مگر ردوقدح کے بعد یہ تحریک بھی منظور ہوئی۔

ان تحریکات کے علاوہ چند مضامین بھی پڑھے گئے جن میں خاص طور پر قابل ذکر مسٹر ہیتا مورتی کا مضمون مادری زبان کو وسیلہ تعلیم بنانے سے متعلق تھا۔ صاحب موصوف نے عثمانیہ یونیورسٹی کے زرین کارناموں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے حکومت مدراس سے سفارش کی وہ گورنمنٹ نظام کی قابل تقلید پالیسی پر کار فرما ہو۔

فوقانیہ عثمانیہ نلگنڈہ کا جو تھا سالانہ جلسہ بابتہ ۱۳۳۸ف یہ جلسہ ۸ اسفندار ۱۳۲۹ف کو مدرسہ کی بازیگاہ پر، بڑی آرائش وزیبائش کے ساتھ، نواب ناظر یار جنگ بہادر کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ صدر مدرسہ مولوی احمد عبدالعزیز صاحب نے مدرسہ کی سالانہ کارگزاری سے متعلق روداد پڑھکر سنائی۔ اس کے بعد معزز صدر نشین نے مدرسہ کی ترقی پر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ دلچسپی اور ترقی کے نظر کرتے، مدرسہ جامعاتی تعلیم کی معاونت کا پورا حق ادا کر رہا ہے اس مدرسہ نے جسقدر مختلف کھیلوں اور کشافی میں نمایاں حصہ لیا ہے وہ باعث مسرت ہے۔ بعد ازاں طلبہ میں انعامات تقسیم کئے گئے اور صدر مدرسہ کے اظہار تشکر پر جلسہ برخاست ہوا۔

سریاپیٹھ ضلع نلگنڈہ میں بیاڈمنٹن۔ وسطانیہ تعلقہ سریاپیٹھ کے صدر مدرس افتخار علی خاں صاحب بی۔اے کی ایک مرسلہ رپورٹ سے واضح ہے کہ مولوی احمد شفیع صاحب بار ایٹ لا منصف تعلقہ مذکور نے جو تعلیمی مشاغل سے بے انتہا شغف رکھتے ہیں اس تعلقہ میں بیاڈمنٹن کا ٹورنمنٹ قائم کیا جس کا آخری مقابلہ ۲۲ اسفندار ۱۳۲۹ف کو مولوی غلام محمود صاحب اول تعلقدار کے زیر صدارت ہو کامیاب ٹیم کو نقروی تمغے اور ہارنے والی ٹیم کو دیگر انعامات تقسیم کئے گئے۔ اراکین ٹورنمنٹ کی جانب سے ایٹ ہوم بھی دیا گیا۔ آخر میں اول تعلقدار صاحب نے جناب ناظم صاحب تعلیمات کی کھیل کی طرف رغبت ومیلان پیدا کرنے والی تحریک کی تعریف کرتے ہوئے کھیلوں کی اہمیت اور ان کی ضرورت پر تقریر فرمائی۔ اور اسی سلسلہ میں بوائے فنڈ کی امداد کے لئے تحریک کی گئی جس کے نسبت

معتمد حضرات نے چندہ عطا کرنے کا وعدہ فرمایا بعدازاں صدر مُدرس نے شکریہ ادا کیا اور "زندہ بادشاہِ دکن" کے نعروں کی گونج کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا۔

کریمنگر میں کھیلوں کے دلچسپ مقابلے | مولوی قادر محی الدین صاحب معتمد انجمن اساتذہ ضلع کریم نگر کی ایک فرستادہ رُوداد کے ذریعہ اطلاع ملی کہ انجمن اساتذہ کے زیرِ انصرام کھیلوں کے سالانہ مقابلے ماہ بہمن ۱۳۴۹ف میں ہوئے۔ مدارس تحتانیہ کے مقابلوں کا انتظام ساتوں مستقر ہائے تعلقات پر کیا گیا۔ انجمن کی جانب سے انعامات تقسیم کئے گئے۔ مستقر کریم نگر پر جناب نارائن راؤ صاحب اوّل تعلقدار کے زیرِ صدارت جو مقابلے ہوئے اُن میں تربیت جسمانی کے بہترین نمونے مدرسین کی سرگرم کوششوں کے نتائج تھے۔ اہالیانِ قصبہ اور عہدہ دارانِ مقامی کا خاصہ مجمع تھا، کھلاڑیوں اور تماش بینوں کا اس قدر اژدھام تھا کہ سارا بازی گاہ معمور اور نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے گونجتا رہا۔ عہدہ دارانِ مقامی جس سرگرمی اور فراخ دلی سے انجمن اساتذہ کی امداد فرما رہے ہیں، وہ حال اور مستقبل کے لئے مسرت بخش ہے۔

تنقیدیں

قاعدہ فارسی | یہ کتاب اُس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، جس کو انجمن مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود نے مدارس کے لئے، راست طریقہ تعلیم ( ) پر ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین سے تیار کرایا ہے۔ متین صاحب کا نام اُردو صحافت کے لئے نیا نہیں ہے وہ سررشتۂ تعلیم حیدرآباد دکن کے ایک تجربہ کار مدرس ہیں جنہیں فارسی زبان سے خاصی دلچسپی ہونے کے علاوہ متعدد فارسی مقالوں وغیرہ کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس قاعدہ کی اہم خصوصیات یہ ہیں:-

الفاظ اور خیالات کی تعبیر و توضیح کے لئے سو سے زیادہ تصاویر دی گئی ہیں

اور طلبہ کو دونوں عہد کی زبانوں سے مانوس کرنے کے لئے فارسی جدید کے ساتھ فارسی قدیم کا بھی امتزاج کیا گیا ہے۔ مکالموں کی طرز میں جہاں جہاں سلیس جملے استعمال کئے گئے ہیں اُن میں زیادہ تر روزمرّہ فارسی جدید کو استعمال کیا گیا ہے۔

ہماری رائے میں اگر یہ قاعدہ بذریعہ بلاک چھپوایا جاتا تو اِس کی خوبی اور رونق میں اضافہ ہو جاتا ہمیں اُمید ہے کہ مولف کے تیار کردہ سلسلوں سے طلبہ کا بہت زیادہ فائدہ ہوگا، اور فارسی کے اُس پرانے نصاب کے پڑھنے پڑھانے سے طلبہ اور اساتذہ کی طبیعتیں جو اُکتا گئی ہیں، اِس جدید سلسلے کے رواج پا جانے کے باعث ان میں شوق و دلچسپی پیدا ہوگی۔

لکھائی چھپائی متوسط، قیمت ٦ر مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے

ایک ہندوستانی گانوں کے پرند یہ کتاب ڈگلس ڈیور صاحب ماہر علم طیور کی تصنیف ہے، جس کا ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے کسی لائق مترجم سے کرایا ہے۔ زیر تنقید کتاب پچاس اسباق پر مشتمل ہے۔ انداز بیان اس قدر سلیس اور دلچسپ ہے کہ پڑھنے والے بغیر تکان محسوس کئے اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں خاص کر بچوں کی تعلیم کے لئے یہ کتاب بڑی مُفید معلوم ہوتی ہے اُردو میں اس قسم کی کتابیں بہت کم نظر آتی ہیں، ہماری رائے میں یہ کتاب اور کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ جامع معلوم ہوتی ہے لیکن تصویریں بہت دُھندلی ہیں جس کے باعث پرندوں کی شکل کی شناخت بمشکل ہوتی ہے۔

کتاب کی قیمت نا معلوم آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے پتہ سے طلب فرمائیے۔

اُمور خانہ داری و تربیت اولاد یہ کتاب ایک پلسی خاتون کونٹس اے پارسنز کی کتاب (Home craft and mother craft) کا ترجمہ ہے۔ اس میں اُمور خانہ داری اور تربیت اولاد سے متعلق مضامین درج ہیں طبقۂ نسوان کی تعلیم کے لئے اُردو میں اس موضوع پر اس قدر تفصیل کے ساتھ شاید ہی کوئی کتاب ہوگی۔ اُردو ادبی دُنیا کو ای بی نندا صاحب کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ اُنہوں نے اس گراں قدر کتاب کا سلیس ترجمہ کر کے صنفِ لطیف کے استفادہ کے لئے سہولت بہم پہنچائی۔

یہ مفید اور دلچسپ کتاب، جو چھوٹی تقطیع میں ۳۱٦ صفحوں پر ختم ہوتی ہے، آکسفورڈ

یونیورسٹی پریس کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

آکسفورڈ تاریخ ہند حصہ دوم | یہ کتاب وی۔ای۔سمتھ صاحب سی۔آئی۔ای کی تاریخ (The Oxford History of India) کا ترجمہ ہے، جس کے مترجم پروفیسر شیخ عبدالحمید ایم۔اے ہیں موصوف کا نام کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔کتاب بحیثیت مجموعی دلچسپ اور جامع ہے، جس کا مطالعہ طلبہ کے لئے خالی از دلچسپی نہیں۔

یہ کتاب بھی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام چھپی ہے جو اسی پتہ سے ۲ ار قیمت پر مل سکتی ہے۔

ہونہار دہلی | یہ نیا ماہوار رسالہ دہلی سے نونہالانِ وطن کی خدمت گزاری کے لئے بڑی آب وتاب کے ساتھ نکلنا شروع ہوا ہے۔اس رسالہ سے طبقہ تحتانیہ سے لیکر طبقہ فوقانیہ کے طلبہ بھی استفادہ کرسکتے ہیں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ادب طفولیت کے معیار اور اصول نفسیات کو پیش نظر رکھ کر دلچسپ مضامین کے ساتھ دستی اور فوٹو بلاک کی تصویریں بھی دی جاتی ہیں۔اس کا ٹائٹل بھی کچھ کم شاندار نہیں۔

اس رسالہ کے مدیر جامعہ ملیہ دہلی کے نوجوان تعلیم یافتہ فیاض حسین صاحب نسیم ہیں جو سابق میں تازیانہ لاہور کے اسٹاف میں بحیثیت مدیر کام کرچکے ہیں

رسالہ کی طباعت وکتابت بھی خاصی ہے جس سے لایق مدیر کی نفاست طبع اور خوش اسلوبی کا پتہ چلتا ہے

باوجود ان ظاہری ومعنوی خوبیوں کے اس کا سالانہ چندہ صرف تین (سے) روپے ہے۔جس کو کم استطاعت طلبہ بھی خرید کر پڑھ سکتے ہیں۔

یہ ماہوار رسالہ منیجر "ہونہار" صدر بازار دہلی کے پتے سے ملسکتا ہے۔

متعلم حیدرآباد | اس نام کا ایک سہ ماہی باتصویر رسالہ دارالسلطنت حیدرآباد دکن سے شائع کیا جارہا ہے۔اس میں صرف وہ مضامین شائع کئے جاتے ہیں جو طلبہ کے

لکھے ہوئے ہوتے ہیں یا وہ جو ان کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی نشو ونما میں معاون ہوں۔ اس کے علاوہ جوہر شرافت کے پیدا کرنے کے لئے کشافی سے متعلق مضامین بھی شائع کئے جاتے ہیں۔

اس کی دلچسپ ترتیب کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے فراہم کرنے میں سرگرم کوشش کی گئی ہے۔

محمد حفیظ اللہ میر صاحب مدیر رسالہ مذکور سررشتہ تعلیم حیدرآباد کے ایک تجربہ کار مدرس ہیں۔ ان کو بچوں کی ذہنیتوں کا پتہ چلانے میں خاصہ ملکہ ہے۔ رسالہ دلچسپ اور ہونہار ہے خدا کرے جلد پروان چڑھے۔ لائق مدیر نے رسالہ کی طباعت میں بڑی سرگرمی دکھائی ہے کاغذ اور ٹیٹل بھی شاندار ہے حجم ۴۸ صفحہ ہے۔ آخر میں طلبہ کی سہولت کے لئے ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ لیکن ہماری رائے میں عبارت اس قدر سلیس رکھی جائے کہ فرہنگ کی ضرورت ہی نہ ہو تو اچھا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ صرف تین روپے ہے منیجر رسالہ متعلم تھر گھٹی، حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیں۔

نیرنگ خیال لاہور یہ ماہوار علمی و ادبی رسالہ آج کئی سال سے شائع ہو رہا ہے اس کے مدیر حکیم یوسف حسن صاحب خاص نمبروں کے نکالنے کے باعث اردو صحافت میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ موصوف جو کام کرتے ہیں بڑے سلیقہ سے کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج یہ رسالہ مقبولیت عام حاصل کرتا جا رہا ہے

لاہور جیسے سہل الاشاعت مقام سے ایک جاذب نظر مجلہ کا شائع ہونا تعجب خیز نہیں لیکن سلامت روی اور یکسانیت نے اس معاصر کو کامیاب طریقہ پر ہنوز جاری رکھا ہے اور صنف نازک سے متعلق بہترین آرٹ کے نمونے پیش کرنے کے لحاظ سے ہمارے نوجوانوں میں آئے دن ہر دلعزیز ہو رہا ہے اس کا سالانہ چندہ (للعہ) ہے منیجر رسالہ نیرنگ خیال، بارود خانہ لاہور سے طلب فرمائیں۔

جغرافیہ ملک سرکارعالی

(برائے جماعت سوم)

یہ ایک نیا جغرافیہ ہے اور بالکل نئے انداز سے ابھی ابھی طبع ہوا ہے اس میں بے شمار عکسی تصویریں اور دو عدد بڑی تقطیع کے رنگین و بیش قیمت نقشے دئے گئے ہیں مولف نے بڑی جانفشانی سے دوسری اور تیسری جماعتوں کے بچوں کی ذہنیت اور رجحان کی موزونیت کے لحاظ سے اس کتاب کو کثیر رقم خرچ کرکے چھپوایا ہے، اور بچوں میں جغرافیہ کی تعلیم کو ہر دلعزیز بنانے کی غرض سے اس کی قیمت کچھ عرصہ کے لئے اصلی لاگت سے بھی کم رکھی ہے، یعنی صرف چھ آنہ (۶ر) فی جلد۔ آج ہی ایک نسخہ طلب کرکے ہمارے دعوی کی تصدیق کریجئے۔ فقط

سلیس جغرافیہ دکن یہ بھی ملک سرکارعالی کا جغرافیہ ہے اور دوم و سوم جماعتوں میں بہت مقبول ہو چکا ہے اسی واسطے ایک قلیل عرصہ میں اس کتاب کی بہت سی جلدیں فروخت ہوگئیں۔ اب تک اس کی قیمت چار آنہ ۶ پائی تھی لیکن اب مولف نے اس کی قیمت میں بھی غیر معمولی تخفیف کردی ہے یعنی ۴ر فی جلد کی بجائے صرف ۲ آنہ ۶ پائی فی جلد کے حساب سے ملسکتی ہے۔ اب اس کی بہت تھوڑی جلدیں باقی رہ گئی ہیں جن کے فروخت ہوجانے کے بعد پھر یہ کتاب اتنی کم قیمت پر نہیں ملے گی فقط۔

جدید تاریخ ہند اس "جدید تاریخ ہند" کی خوبیوں کا اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مجلس انتخاب کتب ممالک محروسہ سرکارعالی نے اس کو تمام مدارس سرکارعالی کے کتب خانوں کے لئے خریدنے کی سفارش فرمائی تھی۔ اس کی ضخامت ۳۸۴ صفحات ہے۔ اس کی قیمت اب تک عہ سکہ عثمانیہ فی جلد تھی۔ لیکن مولف نے غریب طلبہ کو فائدہ پہنچانے کے لئے "جدید تاریخ ہند" کی اصلی قیمت کو گھٹا کر نصف کردیا ہے یعنی اب اس کی قیمت صرف ۱۲ر سکہ عثمانیہ فی جلد کردی گئی ہے جو اصلی لاگت سے بھی کم ہے جلد خرید لیجائے کیونکہ موجودہ اسٹاک ختم ہوجانے کے بعد پھر اس قیمت پر یہ کتاب فروخت نہ کیجائیگی۔

سید شرف الدین قادری ایم۔ اے۔ (بی۔ ٹی)

ملنے کا پتہ سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن

The P. N. E. U. came into being in 1888 in response to a demand by thoughtful parents who desired to know how to give intelligent supervision and guidance to the development of their children. It offers its members a theory and a practice of education worked out by Miss Mason its founder which are simple yet effective. It has a definite curriculum and an approved method. Its distinctive curriculum is characterised by liberal views as regards education, good literature playing a big part in this respect, and its method, not difficult to learn, lays emphasis on the three essential elements—assimilation, rejection, and reproduction, on which all educational growth ultimately depends. Its correspondence and examination system also makes for co-ordinating the results achieved. It thus tends to do away with the desultoriness which characterises most private tuition as we know it. The P. N. E. U. trains teachers on its own methods and these are available, but the method can be followed by parents and others who care to undertake it and apply themselves to it.

Mrs. Tasker asks the question, "could we not make plans for carrying Miss Mason's inspiring ideas of education into the zenanas behind the purdahs?" The suggestion is thought provoking, for it does seem that only along some such lines can the real problem of female illiteracy, especially adult illiteracy, be really solved under the present existing conditions. It might be a fruitful field of experiment for the Hyderabad Women's Association for Educational Advancement to undertake.

---

rule to admit only such teachers for training as have passed the Middle Examination, and recently after the abolition of the Middle Examination, the Education Department has instituted a Departmental Examination for those who wish to join normal schools with a view to qualifying themselves for the posts of teachers in primary schools. As regards training colleges for teachers of secondary schools, the Hartog Committee have rightly pointed out that "enough cannot be done in the short space of nine months, which is all that is usually available, to uproot the old methods of teaching to which many of the students are accustomed; and for many of the teachers more frequent refresher courses at the training colleges would be of great advantage". As far as we are aware no steps have yet been taken to lengthen the course of training in any of the training colleges in India. The Training College at Dacca has however instituted a refresher course, and we commend its example to other training colleges in India.

The Parents' National Educational Union.

The ideals of the P. N. E. U. (Parents' National Educational Union) as set forth in an able and instructive article by Mrs. Tasker in this issue should prove of interest to all concerned with the cause of education in India, where the problem of reaching those whose customs do not permit of public school going is ever present. It is questionable whether the schools by themselves will ever solve the problem of illiteracy, especially of female illiteracy, and here it would seem in the method of the P. N. E. U. is a system ready to hand, which has justified itself by results and which with some adaptation should prove most helpful to this end.

Notes and News.

The 4th Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association will be held on the 3rd and 4th July 1930. The following sub-committees have been appointed to prepare reports and submit them to the Conference:—

1. School work in relation to practical life, with special reference to Mathematics.

Rev: L. Simpson, M. A., (Chairman), G. Sundaram (Secretary), Miss D. M. Clough, Messrs. Venkatashulu, B. A, R. S. Hughesdon, B. Sc. V. V. Hardikar, Din Dayal Naidu, D. C, Bhogle, Abdul Latif, S Gulam Mahmood, Mohd: Osman, B. A., T. D.

2. The Teaching of History.

Professor S. Hanmanth Rao, M. A., L. T. (Chairman), G. A. Chandawarkar, M. A., (Secretary), Messrs. S. M. Nakvi, S. Fakrul Hasan, Ganesh Chand, Md. Yusuf, Shaik Ali Husain, M. Hanmant Rao, Deuskar. Dinkar Narayan, B. A., B. T.

3. The Teaching of Geography.

S. Ali Akbar, M. A., (Chairman), K. P. Shastri, B.A., L.T., (Secretary), Rev: F. C. Philip, M. A., Miss Wooky, B A., Messrs. Gulam Kader, B. A., P. V. R. Sebastian, B. A, Abdul Noor Siddiqi, B.A., B.T., D. V. Ramana Rao, S. Abdul Kadir, Gulam Dastagir, Yousuf Husain, B.A., B.T., V. R. Kalyansundaram Iyer, B.A., C. H. Krishnaswami, B. A., L. T., Mohd. Siddiq, B. A., B. T.,

---

In consequence of his appointment as tutor to Prince Azam Jah Bahadur and Prince Moazum Jah Bahadur, Mr. K. Burnett has retired from the principalship of the Nizam College and Mr. McEwen, B. Sc., has succeeded him as principal. Mr. Burnett served on the staff of the college for a period of nearly 30 years. During the last 10 years of his service he did much as Principal to improve the efficiency of the college. He will be long remembered for his interest in games and sports and for the personal contacts which he established with his pupils.

---

faction at the passing of the Child Marriage Restraint Act and supporting Mr. Jayakar's Bill "to remove disabilities affecting the untouchable classes of Hindus" pending in the Assembly. Polygamy was strongly condemned and parents were requested not to give their daughters in marriage to men who already had wives, and it was resolved that marriages of old men with minor girls should be forbidden by law.

The afternoon was again devoted to visits to the Rescue Home, Wadia Maternity Hospital, which is solely for women of the labouring classes, the Municipal School where vocational training is given to children, and lastly to the New High School for Girls. Later Mr K. H. Vakeel delivered a lecture on "Some Aspects of Indian Art" which was illustrated with magic lantern slides.

The excursion to the Elephanta Caves was greatly enjoyed by all the delegates. The launch was full of delegates from all parts of India and it was amusing to see some sing, some talk and some of the high-spirited ones shout out Women's Conference "Jai Jai Jai" and clap their hands. Besides amusement we had a good opportunity of exchanging our views on and discussing various subjects. The refreshments which were served put us in a good humour to continue the fourth session of the Conference, which was chiefly to map out the work for the coming year and to elect the office bearers. Then with a hearty vote of thanks to the President and the various ladies who had helped to make the Conference a success, the work ended.

To make us feel that we deserved some enjoyment after 4 days of strenuous work Lady Dorab Tata entertained all the Delegates to an At Home, where Mr. Alfred Mirovitch, the great pianist, gave us selections from his repertoire.

Science optional with Physics in the 1st year of the Arts Examination.

To supply the need for opening more girls' schools and providing suitable school buildings, the Conference considered the advisability of launching a campaign for the formation of companies on the lines of the Girls' Public Day School Company in England. This work was entrusted to the All-India Fund Association as part of its work for the coming year.

The resolution for founding a Central College for training Kindergarten and Secondary teachers caused a long discussion on the question of the medium of instruction. It was explained that the college would train a superior class of teachers who would go and impart their knowledge to the students of their province in the vernaculars.

The resolution on Compulsory Primary Education for girls as well as for boys in urban, suburban and rural areas was also discussed, and it was suggested that in all schools education should be made free for those who could not pay for it. In order to carry out this scheme efficiently it was agreed that more Rural Training Centres be opened and residential quarters for women teachers be provided, while creches be established near schools for the babies.

After having a delightful time at the Taj Mahal Hotel where we had our lunch, we went to hear Mr. Jayakar speak on 'Hindu Women's Right of Inheritance'. After this, we visited the Avabai Petit Orphanage in Bandra, having a long drive through the Mahim Woods.

In the evening the Bombay Presidency Women Graduates' Union and Association of British University Women were At Home, and later there were two cinema lectures delivered by Madame Von Keller of the Odenwald School in Germany, and Dr. Miss Wilson.

Another morning was spent in discussing the social questions. Resolutions were passed expressing great satis-

resolution of condolence was passed—all standing—sympathising with the deaths during the year of three earnest workers in the cause of women's education. The roll-call was then taken and it was interesting to find that 32 constituent areas had sent up 206 delegates. After this, reports were read by the Educational and Social Secretaries and by the Treasurer. The chief educational work that they had done during the year was investigation about the education of children under eight, while the greatest achievement in social reform was the successful propaganda which had been carried on in favour of the Sarda Bill. Considering that 1929 was the first year that the All-India Women's Conference had taken up social work, they really should be congratulated on their earnest endeavour and success. Following the reports of the Conference came the reports from the constituencies of the work done during the year.

The afternoon was occupied by visits to the Seva Mandir, a nursery school for the children of the Labour classes, Victoria Memorial School for the blind, Sir Ratan Tata Industrial Institute for women, where cooking, laundry and embroidery are taught to the poor class Parsi girls, and lastly to the Seva Sadan, a social service centre for women of all creeds. Immediately after we had to go to Lady Sykes At Home. It was a lovely drive up the hill; the sight of the sea from there was simply beautiful. The welcome accorded to the guests by Lady Sykes and her charming and friendly manner were admired and appreciated by all.

One whole morning was devoted to consider the educational resolutions, which I shall mention briefly.

It was suggested that the All-India Women's Conference should send a deputation to the Bombay University authorities, offering their help in drawing up a new syllabus for the Matriculation Examination, and recommending that vernaculars should be made optional with classical languages at every stage in the University course and Domestic

In the evening, while declaring the Conference open, Lady Sykes dwelt at length on the importance of social and educational progress in India. Referring to the defective physique of the rising generation, she said, 'No real progress in remedying this is possible so long as there persists, behind the purdah, a body of conservative and reactionary opinion, which is responsible for a high rate of infant mortality, apathy in taking precautions against malaria and other preventable epidemic diseases, neglect of sanitation, and social evils like child-marriage and the dowry system.' Lady Sykes declared that it was the duty of the members of the Conference not only to support the Sarda Act but to convince and educate others to welcome and accept it. Speaking about female education in India, she drew attention to the fact that while the number of girls in the lower classes was satisfactory, very few girls remained at school after the age of twelve. 'It is surely a calamitous thing', she said, 'to take a girl away from school just as her education begins to enter upon its fruitful stage.'

In a neat little speech Lady Dorab Tata welcomed all the visitors and delegates from the various constituencies and congratulated the Conference on the work it was doing. She felt sure that this Conference would play a great part in the regeneration and renaissance of the great Indian nation.

Then amidst applause Mrs. Sarojini Naidu got up to deliver her presidential address, in which she eloquently described the genius and ideals of Indian womanhood. She said, 'Men made wars and created political and economic divisions for selfish interests and created combinations and groups of friendship and hostility. But all these were temporary shifts, and the purpose of womanhood in the nation's or the world's life was to do away with these temporary barriers'. The last item on the day's programme was a series of radio speeches at the Radio House.

The first business session of the Conference began on the 21st January, and before proceeding with the work, a

less clearly in their hopes and aspirations. I believe that through her books and educational organisation, Miss Mason can help us towards a fulfilment of our ideals. *

Fourth All-India Women's Conference

BY

MRS. HOSAIN ALI KHAN

Honorary Secretary, Women's Association for Educational Advancement.

We have much pleasure in publishing this interesting article. It is our first contribution from the pen of a Hyderabad lady. The writer's grandfather the late Dr. Imadul Mulk, LL.D., held the post of Director of Public Instruction in these Dominions for several years. Her mother the late Mrs. Khedive Jung was one of the pioneers of modern education for Hyderabad girls, while her husband now occupies the Chair of English in the Osmania University. The interest which Mrs. Hosain Ali Khan and some other members of the Hyderabad Women's Association for Educational Advancement are taking in the various problems of women's education augurs well for its future progress in this State.—Ed.

THERE is so much to say about the Educational Conference recently held in Bombay, that I hardly know where to begin and what to leave out. In a short article like this I can only give a rough idea of the busy time we had in Bombay. The mornings were devoted to work, while the afternoons were spent in visits to educational institutions.

After a very pleasant journey we arrived at the Victoria Terminus early on the morning of the 20th of January. Boy Scouts were waiting with buses and cars to take us to our destination. At 9 a. m. we had to be present at the University Convocation Hall for registration, when all the Delegates were given their badges and their invitation cards to the various At Homes and entertainments. In the afternoon the delegates visited the Gamadia School, an extremely efficient and well managed school, where demonstrations were given in Domestic Science, cooking, laundry and needlework. Subsequently, we inspected the Montessori Department of the Fellowship School, which was very interesting.

* A few copies of Miss Mason's books are on order at the Deccan Bookshop, and will shortly be procurable there.

joyous; the verve with which the children tell what they know proves the fact. Everyone of these children knows that there are hundreds of pleasant places for the mind to roam in. They are good and happy because some little care has been taken to know what they are and what they require; a care very amply rewarded by results which alter the whole outlook on education. In our training college, the students are not taught how to stimulate attention, how to keep order, how to give marks, how to punish or even how to reward, how to manage a large class or a small school with children in different classes. All these things come by nature in a school where the teachers know something of the capacity and requirements of children. To hear children of the slums 'telling' *King Lear* or *Woodstock*, by the hour if you will let them, or describing with minutest details Van-Eyck's *Adoration of the Lamb* or Botticelli's *Spring*, is a surprise, a revelation. We take off our shoes from off our feet; we 'did not know it was in them', whether we be their parents, their teachers or mere lookers-on. And with some feeling of awe upon us we shall be the better prepared to consider how and upon what children should be educated. I will only add that I make no claims for them which cannot be justified by hundreds, thousands, of instances within our experience.

Does it not seem that Miss Mason has pointed out to us fundamental principles? And if so, let me at this stage make a special plea for the education of Indian women in this early stage of its advance, on these principles. Here we have, not only the highest ideals in education, but a whole frame work for putting them into practice, proved by nearly forty years of experience, and ready for us even down to the difficulty of reaching those who are far away from existing school buildings, or whose customs do not permit them to go to school. Could we not make plans for carrying Miss Mason's inspiring ideas of education into the Zenanas, behind the purdahs? A vision of Indian women, each recognized as a person with a mind, each growing to maturity, with a love of knowledge for its own sake, each with an ideal of intellectual well-informed wife-hood, mother-hood and home-making so high that only the very noblest and widest education can suitably prepare her, this is I feel sure a vision that all educators see more or

and are not disappointed. Her teaching on "the way of will" and "the way of reason" repays careful study, and survives the modern tendency to an intensive study of psychology, for finding a basis for our actions and those of our children.

Some ten years before she died, Miss Mason had the satisfaction of seeing her ideas adopted in a Council school in Yorkshire, later in a very poor one in Wales, and in a number in Gloucestershire. The results surpassed expectations. Other schools followed the example, and now, recognized by Government and working under the Board of Education are many such schools, both primary and secondary as well as many private schools, an increasing number of boys' preparatory schools, and from last year a girls' public school. The principles underlying the methods of teaching are based widely, so that children privately taught at home, and children in classes, even large ones, can benefit from them alike.

Is it not a subject for thought that children of noble birth with the best the world can give them, and the children of working people, and from the poorest surroundings, and boys and girls of every class in England and in many out of the way corners of the world, should be learning lessons from the same books, working on the same syllabus and with the universal result of delight in work and lessons, and a love of knowledge. I quote again from Miss Mason:—

> "Just as in the War the magnanimous, patriotic citizen was manifested in every man so in our schools every child has been discovered to be a person of infinite possibilities. I say every child, for so-called 'backward' children are no exception. I shall venture to bring before the reader some experiences of the *Parents' Union* School as being ground with which I am familiar. Examination papers representing tens of thousands of children working in Elementary Schools, Secondary Schools and home schoolrooms have just passed under my eye. How the children have revelled in knowledge! and how good and interesting all their answers are! How well they spell on the whole and how well they write! We do not need the testimony of their teachers that the work of the term has been

on her work of preparing and sending out the programmes, and running the machinery of this unique organisation.

So far so well. The children first taught in the Parents' Union School were the offspring of cultured parents; their homes were comfortable and well-to-do, their parents were anxious to give them the best of everything. "But it would be absurd to introduce such a curriculum into the schools of poor children or the homes of the un-educated. What would be the use of teaching them all that? It would not help them to earn their daily bread". Not so thought Miss Mason. She believed that a child is born a person, whether its parents are educated or otherwise, whether it is born to a rich home or a poor one, whether (I add) it is male or female, whether (I add again) it is from the East or from the West.

Any normal child given suitable nourishment for his body, and enough of it, will grow and develop into the mature man or woman, because it is his nature, so that not given suitable or sufficient food, he will either never reach the mature stage at all or he will reach it in a weakened or deformed condition.

And any normal child given suitable and adequate mental nourishment, will grow into the man or woman of mature mind because it is his nature, so that not given suitable mental food, or enough of it, his mind, just as his body, will if it reaches maturity at all, do so in a weakened or deformed condition.

To use again the metaphor, though there is danger in pressing any metaphor too far, suitable food and enough of it is not the only condition of right development, either physical or mental. There must be control and a wise ordering of life, first vested in the authority of parents and teachers, and as soon as may be, transferred to the children themselves. It is the duty of educators to instruct children in the rules, and again we turn to Miss Mason for help,

philosophy, but it is only from a study of her books that we can arrive at the full significance and value of the methods she evolves.

"In devising a syllabus for a normal child, of whatever social class, three points must be considered.—

(*a*) He requires *much* knowledge, for the mind needs sufficient food as much as does the body.

(*b*) The knowledge should be various, for sameness in mental diet does not create appetite (*i. e.*, curiosity).

(*c*) Knowledge should be communicated in well-chosen language, because his attention responds naturally to what is conveyed in literary form.

As knowledge is not assimilated until it is reproduced, children should "tell back" after a single reading or hearing: or should write on some part of what they have read.

A *single reading* is insisted on, because children have naturally great power of attention; but this force is dissipated by the re-reading of passages, and also, by questioning, summarising, and the like.

Acting upon these and some other points in the behaviour of mind, we find that the educability of children is enormously greater than has hitherto been supposed, and is but little dependent on such circumstances as heredity and environment."

To return to this short outline of the development of the P. N. E. U., Miss Manson's early experiments in a "liberal mental diet" for children, met with success and brought great delight to those first schoolrooms. More students came to her for training, more parents asked for her trained students to teach their children, more children joined the "school", albeit it was a school by correspondence, without buildings. It was named, and is known as the Parents' Union School.

Each term in those days the examination papers of the pupils in the various schoolrooms came back to Miss Mason; in them she found proof of her beliefs. The work showed great mental ability, and a spontaneity and joyousness which could only be produced by minds in healthy growing condition. The Parents' Union School has now grown to such dimensions, that there is a staff of examiners. Miss Mason died seven years ago, but those who are well fitted for it, carry

for judging their own work. The examinations were to be conducted so as to be of educational value in themselves—no cramming, no revision even.

Armed then with beliefs in the natural power of children's minds to deal with a vast amount of material if suitably presented, armed too with an understanding of the three legitimate educational instruments:

(*a*) the atmosphere of environment,
(*b*) the discipline of habits formed definitely and thoughtfully, whether of body, or mind,
(*c*) the inspiration of living ideas,

her students went to work. The wide programme of lessons set for a term shows what Miss Mason considered a child capable of. I give the list of subjects set for children in form II; average age 8-10 years. After Bible lessons come Writing, Dictation, Composition, (both oral and written), English grammar, English History, French History, General History, Citizenship, Geography, Natural History, Picture Study, French, Latin, Arithmetic, Geometry, Algebra, Drawing, Recitations, Reading, Musical appreciation, Music, Singing, Drill and Work (meaning hand work, gardening etc.). The child of 8 would gradually work up to the full syllabus for 10 years old. The books used, which I cannot detail here, are chosen with elaborate care and discrimination; of literary value wherever possible, and the best available in each subject. Text books, in the usual sense, have small place in the programme. The question naturally arises how can such a vast number of subjects be studied and mastered by a child in the school hours? Miss Mason found that a child has wonderful powers of concentration, but for a short time only. He is easily tired. Therefore the time for each subject must be short and a change to a different kind of subject will be found refreshing. Children working on the programme mentioned above would have periods of 20-30 minutes only, and occasionally less. I take some paragraphs from a synopsis of Miss Mason's educational

child? Father and mother, sisters and brothers, neighbours and friends, "our" cat and "our" dog, the wretchedest old stump of a broken toy, all come in for his lavish tenderness. How generous and grateful he is, how kind and simple, how pitiful and how full of benevolence in the strict sense of goodwill, how loyal and humble, how fair and just! His conscience is on the alert. Is a tale true? Is a person good?—these are the important questions. His *conscience* chides him when he is naughty, and by degrees as he is trained, his will comes to his aid and he learns to order his life. He is taught to say his prayers, and we elders hardly realize how real his prayers are to a child.

"Now place a teacher before a class of persons the beauty and immensity of each one of whom I have tried to indicate and he will say, "What have I to offer them?" His dull routine lessons crumble into the dust they are when he faces children as they are. He cannot go on offering them his stale commonplaces: he feels that he may not bore them; that he may not prick the minds he has dulled by unworthy motives of greed or emulation; he would not invite a parcel of children to a Timon feast of smoke and lukewarm water. He knows that children's minds hunger at regular intervals as do their bodies; that they hunger for knowledge, not for information, and that his own poor stock of knowledge, is not enough, his own desultory talk has not substance enough; that his irrelevant remarks interrupt a child's train of thought, that, in a word, he is not sufficient for these things."

With this realisation of the nature and power of mind in every child, Miss Mason formulated a scheme, by which parents could have their children taught from this new point of view. She got together a small band of students, and trained and taught them, and sent them out to teach privately in families. But although taught each in his own home, all the children worked on the same programme of lessons, a syllabus set new by Miss Mason from term to term. At the end of each term examinations were set, and the work done in all the different schoolrooms was sent up and judged by an examiner. These exminations were not of a competitive character, but served two purposes: (1) for pulling together with a nice finish the term's work, (2) for giving these isolated schoolrooms a common standard

solid, liquid : has learned in his third year to articulate with surprising clearness. What is more, he has learned a language, two languages, if he has had the opportunity, and the writer has known of three languages being mastered by a child of three, and one of them was Arabic ; mastered, that is, so far that a child can say all that he needs to say in any one of the three—the sort of mastery most of us wish for when we are travelling in foreign countries. Lady Mary Wortley Montagu tells us that in her time the little children of Constantinople prattled in five tongues with a good knowledge of each. If we have not proved that a child is born a person with a mind as complete and as beautiful as his beautiful little body, we can at least show that he always has all the mind he requires for his occasions : that is, that his mind is the instrument of education and that *his education does not produce his mind.* ... ...

The Mind of a School Child.

"But we must leave the quite young child, fascinating as he is, and take him up again when he is ready for lessons. I have made some attempt elsewhere * to show what his parents and teachers owe to him in those years in which he is engaged in self-education, taking his lessons from everthing he sees and hears, and strengthening his powers by everything he does. Here, in a volume which is chiefly concerned with education in the sense of schooling, I am anxious to bring before teachers the fact that a child comes into their hands with a mind of amazing potentialities. ... ...

" Enough, that the children have minds, and every man's mind is his means of living ; but it is a great deal more. Working men will have leisure in the future and how this leisure is to be employed is a question much discussed. Now, no one can employ leisure fitly whose mind is not brought into active play every day ; the small affairs of a man's own life supply no intellectual food and but small and monotonous intellectual exercise. Science, history philosophy, literature, must no longer be the luxuries of the 'educated' classes ; all classes must be educated and sit down to these things of the mind as they do to their daily bread. History must afford its pageants, science its wonders, literature its intimacies, philosophy its speculations, religion its assurances to every man, and his education must have prepared him for wanderings in these realms of gold. ... ...

"It is not only a child's intellect but his heart that comes to us thoroughly furnished. Can any of us love like a little

* In the Home Education Series.

She teaches us:—

'A child is born a person.'

How much does this mean? Everything. A person is a complete being of body and mind. We all know how perfect is the baby body that arrives into the world, but do we recognise that the mind is there from the beginning too? We are rather inclined to think that the baby is a play-thing of our very own, to do as we like with, and only as he gets older and less dependent on us, do we begin to think of his having a mind at all. This is what Miss Mason says herself:—

> "The completeness of the new baby brother is what children admire most, his toes and his fingers, his ears and all the small perfections of him. His guardians have some understanding of the baby: they know that his chief business is to grow and they feed him with food convenient to him. If they are wise they give free play to all the wrigglings and stretchings which give power to his feeble muscles. His parents know what he will come to, and feel that here is a new chance for the world. In the meantime, he needs food, sleep and shelter and a great deal of love. So much we all know. But is the baby more than a 'huge oyster'? That is the problem before us and hitherto educators have been inclined to answer it in the negative. Their notion is that by means of a pull here, a push there, a compression elsewhere, a person is at last turned out according to the pattern the educator has in his mind.
>
> The other view is that the beautiful infant frame is but the setting of a jewel of such astonishing worth that put the whole world in one scale and this jewel in the other, and the scale which holds the world flies up outbalanced. ...
>
> The most prosaic of us comes across evidence of mind in children, and mind astonishingly alert. Let us consider, in the first two years of life they manage to get through more intellectual effort than any following two years can show...
>
> We can realise that to run and jump and climb stairs, even to sit and stand at will must require fully as much reasoned endeavour as it takes in after years to accomplish skating, dancing, ski-ing, fencing, whatever athletic exercises people spend years in perfecting: and all these the infant accomplishes in his first two years. He learns the properties of matter, knows colours and has first notions of size,

The P. N. E. U. and Charlotte Mason's Philosophy of Education.

BY

MRS. J. H. TASKER.

FORTY years ago Charlotte Mason wrote a series of books called " The Home Education Series " with a view to helping parents to bring up their children wisely. These parents found Miss Mason's help invaluable, not only through her books and private lectures, but through a monthly magazine called " The Parents' Review." They felt that the truths that Miss Mason pointed out were fundamental truths, and that in the light of such understanding, the work of educating children became not less responsible, but more inspired. A strong light was thrown on a difficult path, which not only made the road clearer, but showed many delights by the way side.

Parents, teachers, and others who found help from a study of Miss Mason's work, formed a society known as the Parents' National Educational Union. This Union has grown steadily till it is now a large and widely representative body and to it can be traced both directly and indirectly many of the ideas which have altered the educational outlook during the last four decades.

What then in outline is Miss Mason's teaching? Before her death 7 years ago, she gave us her final work on education, and it is called " An essay towards a Philosophy of Education," — not a "curriculum of education," not a " theory of education," not a "new method of education," but a "Philosophy". That indicates an attitude of mind, an outlook on life, and this indeed is what Miss Mason has given us.

extra-mural activities of schools; or education of Adults, he offers excellent advice in regard to Technical Education, which is, that there should be close co-operation between the managers of Industrial concerns and the Heads of Technical Institutions, so that there may be not only better facilities for practical training but for prospective employment. The practical wisdom of this link need not be stressed, as it is patent to all.

Sir Sivaswamy concludes his address by remarking that there must be some lure to attract graduates of ability to the teaching profession. For drafting young men of exceptional ability, it is necessary to offer teachers reasonable remuneration and future prospects. Although the teaching profession is comparatively poorly paid the world over, the pay of the Indian teachers of schools as well as colleges, especially in the Presidency of Madras, is pitifully small. Keenly anxious as Sir Sivaswamy is to improve the lot of the poorly paid teacher, he sounds a note of warning that the spirit of commercialism and trade unionism should not invade the domain of the teaching world for the simple reason that such a unionism shields not merely the fit but also the unfit and in this respect, Sir Sivaswamy's view is diametrically opposed to that of professor Yegyanarayana Iyer, the Vice-Chairman of the Reception Committee, who is an out and out trade-Unionist and a *guild walla.* The last sentences of the address are worthy of being written in letters of gold and every teacher should take them to heart, so that they may serve him as an inspiration and guide:

"The profession of teaching has always been held in long honour in this country. Their (teachers') status in society was not and, ought not to be, dependent on the salaries paid to them. Nothing should be done which is likely to be considered derogatory to the ideals and traditions of the noblest profession in the world".

He is dissatisfied with the training imparted in the Training College and remarks: "If the training in the Teachers' Colleges (Saidapet, Madras) is to be judged by its results, it is open to serious doubt whether the Teachers' College is doing its work with efficiency". An unpalatable remark, but never-the-less true!

Sir Sivaswamy is equally vehement in denouncing the Inspecting Staff which he considers very inadeqate for proper supervison. He wants to do away with "stereotyped character" and "mechanical routine" of the Inspection Reports and advocates the appointment of really efficient Inspecting officers "who have a fairly good all-round knowledge of many of the subjects included in the Secondary School Curriculum and who can themselves give model lessons and advice in school work." One wonders how many of those who are now Inspectors can stand this test.

Sir Sivaswamy also drew the attention of the audience to the causes of the lack of efficiency of schools and colleges. The promotion of unfit students, partly due to parental pressure and partly to fear that the school fees may become less, aided schools being the worst sinners in this respect; the dependence of the Universities on examination fees; the modern, many sided activities of the school—he has, however, a word of praise for the Boy Scout movement for its social service phase and the civic responsibility it engenders; the wasting of valuable time and the neglect of the opportunities provided by the schools and colleges for the acquisition of knowledge, culture and discipline—these are, in Sir Sivaswamy's opinion, the main obstacles that stand in the way of maintaining the required level of efficiency.

Although Sir Sivaswamy, in his address, does not touch on such subjects as Girls' Education; Education for the abormal and subnormal classes like the blind, deaf and dumb, mentally defective and criminal classes; the feasibility of a scheme of non-sectarian religious instruction; the

Sir Sivaswamy then took up the burning question of the day, the correlation of education to employment. It is patent that neither Government service nor the learned professions can absorb all the graduates manufactured by the Indian universities, which are multiplying at a more rapid pace than is desirable. He pertinently remarked that "the difficulty does not arise in the case of young men endowed with plenty of means or brilliant abilities. It is the average student who suffers and who finds too late in the day that the time and money spent on his collegiate education have been fruitless, and so he thought that it was to the interest of the large majority of our young men and of the country "that they should be diverted to industrial, commercial, or agricultural walks of life and educated for these walks". He advocated that a vocational bias should be imparted to Secondary Education. As matters stand at present, neither the parents nor the average teachers, much less the boys themselves, are able to chalk out their future programme in life and to offer subjects which are congenial to their taste and for which they show aptitude. To prevent wastage of ill-directed energies, Sir Sivaswamy suggested that the problem of discovering special aptitudes of pupils by means of psychological tests should be tackled by Departments of Public Instruction, either by importing experts from abroad or deputing Indian teachers to the countries which specialise in Child Psychology.

Sir Sivaswamy then suggested ways and means to liberalise Secondary Education, to widen the mental horizon of students and make them good and useful citizen. He advocated the lengthening of the secondary course syllabus and the inclusion of some compulsory subjects such as Nature Study and Science which remain either unstressed or optional. He suggested that the book on Science "should cover the subjects of Physics and Chemistry in daily life, plant life, animal life, Physiology and Biology" and above all, teachers should be trained in the real sense of the word.

teachers and the inadequacy of the Inspecting Staff". All educationists will subscribe to the view of Sir Sivaswamy that "one of the most important reforms required in the primary schools is the adaptation of the curriculum to the conditions of the village life". The Inspecting Staff should, in his opinion, not only be increased but improved in *quality* also. He doubted "whether members of the Inspecting Staff would themselves be quite capable of efficient teaching in accordance with the needs of local environments." To improve the quality or tone of teaching, Sir Sivaswamy suggested that a more *intensive* effort should be made "to secure real increase of literacy or in a multiplication of schools on the present lines."

Sir Sivaswamy then tackled Secondary Education. He explained why the old Matriculation Examination, which was a qualifying test for Government service, was abolished and in its place the School Final Leaving Examination was instituted with the object of diverting students, who were unfit for Universities to other channels. He averred that, judging from the results, the S. S. L. C. Examination had been a failure, because it had not prevented unfit students from entering the portals of the University. Nor did it "succeed in preparing students for any callings by providing any satisfactory preliminary courses". He remarked that "the enormous wastage of students during the University course is a proof either of the inefficiency of the system of Secondary Education or the unfitness of many of the students who complete the secondary course for collegiate study" and then added that "not merely is there a marked deterioration in the knowledge of English of the average graduate, but there is a lamentable deficiency in the essential elements of a liberal culture". In his opinion, "the fault lies not in the system of Collegiate Education but in the system of Secondary Education". He does not believe in early specialisation which, he considers, has been carried too far to the detriment of a general liberal education.

a layman, who takes a keen and abiding interest in education, can rise equal to the occasion and make a useful contribution to educational problems. Sir Sivaswamy made an admirable President and his address will, I am sure, go down into the annals of the All-India Federation of Teachers' Associations' Conferences as a bold and thought provoking one, characterised by vivid exposition, clarity of views, breadth of vision and forensic skill.

The address was a rapid survey of the educational system as it obtains to-day in India in general and in the Madras Presidency in particular. Sir Sivaswamy first took up the Hartog Committee Report and examined it critically. He said that he saw "no reason for quarrelling with any of the findings of the Committee" and pointed out that the misgivings entertained by some Indians that the Committee were hostile to Indian aspirations were not justifiable. He then dilated upon the political bearings of the Hartog Committee's Report on the "potentialities for political progress" and discussed the standard and type of education that is required for the production of "a competent electorate capable of choosing proper representatives and understanding and deciding between the rival programmes of political parties". Sir Sivaswamy then examined the educational bearings of the Report. He agreed with the Committee who assert that there has been "an enormous *wastage* and *stagnation* of pupils in the primary schools, meaning by *wastage* the premature withdrawal of children from the school before the completion of the primary course, and by *stagnation* the retention of a child in a lower class for a period of more than one year". This wastage and stagnation Sir Sivaswamy attributed to "the poverty of the parents, their inability to appreciate the advantages of keeping the boys at school for a number of years, the inevitable inefficiency of the single-school-teacher system, the want of adjustment between the curriculum and the environments of village life, the low qualifications of the

Corporations, Local Boards, Private Institutions and Mission Schools, there can be no standardization of pay. Mr. Iyer's panacea for inequality in pay and prospects in the different kinds of schools is to have a Teachers' Association for every school, every district having its own Guild absorbing all Teachers' Associations, and all District Guilds must be affiliated to the Provincial or Presidency organisation, and above these, there should be the All-India Federation of Teachers' Associations which, in its turn, should find a place in the Pan-Asiatic, nay, International or World Organisation. In order to ensure professional solidarity, all teachers must, without a single exception, be members of Teachers' Associations. There should be no professional "dissenters." Mr Iyer elucidated his point by means of an apt simile. He compared the Federation of Teachers' Associations to a building of many storeys in each of which there are many rooms which can house every kind of Teachers' Association. In the end, Mr. Iyer admonished teachers to learn to subordinate their inclinations to the decision of the majority; to have full confidence in the workers and not speak ill of those who do honorary work or attribute motives to them; to do some little work from day to day and not be content with spectacular demonstrations; to lay a little more stress on discharging duties than on rights and privileges; not to grow discontented with their lot early in life and fall into a rut, out of which escape is impossible; to ward off ennui, to take to some special line of study or cultivate some hobby which keeps them young; to do their honest bit of work and devote themselves to some noble cause, thus qualifying themselves for better treatment at the hands of others.

The Presidential Address by that veteran Madras lawyer-politican, Sir. P. S. Sivaswamy Iyer who has, on many occasions, evinced a keen interest in educational problems, next engages my attention. Although some carping critics have questioned the choice of a non-educationist for the presidentship, a careful perusal of the address shows that

S. K. Yegayarayan Iyer, M. A., President of the South Indian Teachers' Union, read the Welcome Address. No one can conjecture what turn the Address of Welcome would have taken, had the Carnegie of Southern India been afforded an opportunity to give expression to his views. Perhaps, Sir Annamalai would have delivered the usual, humdrum welcome address, dwelling upon the salient features of education, or he might have indulged in a *resumé* of educational development in the Presidency to which he belongs.

No such thing was attempted by Mr. Iyer. Mr. Iyer is, above all, frank and naive in his address. He harped upon only one point, which makes the work of the reviewer very easy. The central theme of his address is the "guild aspect" of the educational problem or rather Teachers' Associations. Mr. Iyer's contention is that teachers "want to live a decent life with no worry or anxiety about the security of their tenure with ample opportunities for self-improvement". He deplores that even this simple demand of theirs is not fulfilled, that members of the teaching profession have many masters to serve, that there is no uniformity of pay and prospects, and that there is no common definite policy. He blames the teachers that there is no professional solidarity or professional morality which obtains, say, in the Bar Council, or Medical Registration Council. Mr. Iyer's idea is that the teaching *cadre* should be looked upon as one state department and all teachers recognised as state servants, and he quotes the case of the neighbouring island of Ceylon wherein there is no difference in pay between teachers in Government Service and those serving under Local Boards and Municipalities. There should according to Mr. Iyer be a standardisation of salary, enforcing it upon managements by making it a condition precedent for the recognition of a school. It is very problematical whether Mr. Iyer's wish would be fulfilled, at least in the near future! So long as there are Municipalities or

Mathematics in the New Method were striking. Special mention must be made of Miss C. Gordon's suggestions of Early Lessons in numbers. Under Elementary school work the splendid collections of Mr. S. Jagannatham, Kindergarten Assistant, Teachers' College, Saidapet, covering the fields of Language, Child Education, Number Teaching, Visual Instruction, Hobbies and Nature Study were worth perusal and study. An interesting exhibit under the head "Educational Charts and Statistics" was that of the Finance Tree of British India sent by the Secretary, Teachers' Association, Chidambram High School, and no less instructive were the charts submitted by Mr. G Sundra Iyer, illustrating the percentage of wastage in Elementary Education and Expenditure on Education in India. The exhibits under the section "Apparatus and Appliances" were not of a very high order. The "Vocational Education" Section was strong and specimens of Printing, Foundry, Sheet metal work, Turning, Fitting, Carpentry, Rattan work and, Weaving and Knitting were shown. There were some very fine exhibits under the Section "Manual Training". It must not for a moment to be supposed that for the "Fine Arts" section exhibits were sent from Arts schools. Since these were the work of either pupils or drawing masters in Secondary and Training schools in the Madras Presidency, they should not be judged by the standard of professionals. Nevertheless, the pictures and paintings sent by Miss Krishna-Bai of Rupa Griha, Rajhmundry, were splendid.

An interesting *annexe* of the Exhibition was that a number of enterprising publishing firms, both English and Indian, had opened stalls to advertise their books and educational appliances.

Coming to the Addresses, in the absence of the Chairman of the Reception Committee, Sir S. R. Annamalai Chettiar, Rajah of Chettinad, the Vice-Chairman Prof:

The Exhibition was divided into the following sections:- (1) Girls' School work; (2) Experiments in Child Psychology and Educational Methods; (3) Elementary School work; (4) Educational Charts and Statistics; (5) Apparatus and Appliances: History, Geography, Language, Mathematics and Science; (6) Vocational Education; (7) Manual Training and Scout Craft; (8) Fine Arts.

Since, owing to the kindness of the Exhibition Committee, I was appointed one of the judges in the matter of awarding shields and medals for the "Girls' School Work" Section, along with Mr. Vakil of Bombay, Miss Krishna Bai, B. A., L. T., of Rajhmundry and Mrs. Nanjamma of Mysore, I was privileged to see more than what the casual observer usually does. In the "Girls' School work" section, the palm must be awarded to St. Christopher's Training College, Kilpauk, Madras both for the variety and excellence of the exhibits which covered almost all the subjects of the curriculum. Under the History section, the Chronological Chart, from 5000 B. C to 400 A. D., which was a pictorial illustration tracing history from the Glacial period through the different stages of civilization, (Egyptian, Mesopotamian, Achean, Grecian and Roman) was original and arresting. Miss Barrie of the Lady Willingdon Training College, Madras, is to be congratulated on patiently conducting experiments in Child Psychology and Educational methods, which were reflected in the group-work Charts, Diagrams, Results of Intelligence Tests, Daily Observation Records of Children's work, Civil Surveys, the Principles of the New Examinations applied to Craft Work Tests etc., not the least important being the time-tables showing how time should be apportioned between Instruction and Expression work, Class Teachers' Record Books, and the Children's Books, comprising the Daily Time Table Book, Assignment Books and Subject Work Books. The Montessori material exhibits put up by the National Theosophical College, illustrating the various stages of teaching

organ of the aforesaid Association. Since Mr. Chandawarkar, my co-delegate, has submitted a separate report on the resolutions passed by and the papers read at the Conference and the concluding speech of the President, I shall confine my remarks to the All-India Education Exhibition, the Welcome Address by Prof: S. K. Yegyanarayana Iyer and the Presidential Address of Sir P. S. Sivaswamy Iyer.

The All-India Educational Exhibition held under the auspices of the 5th Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations in the Hindu High School, Triplicane, was opened by Mr. R. G. Grieves, Director of Public Instruction, Madras. This Exhibition was a fair index of what teachers and pupils can do or are doing in schools. It was an object lesson for the young aspiring teacher as to how he should equip himself with materials which make the lessons at once interesting and instructive and how to manipulate and adapt the materials at his command to the pupils' use. The Secretary and members of the Exhibition Committee deserve to be congratulated on the unstinting efforts they made to make the exhibition a success. At their request, the Directors of Public Instruction of British Provinces and Indian States had asked the schools under their control and guidance to send exhibits to the exhibition. Naturally, as the session was held in Madras, the response from the Southern Presidency, including the South Indian States, was the greatest. Almost all the Madras schools, Boys' and Girls' and Government as well as Aided, took part in the Exhibition. Not only Elementary Schools, High Schools, Training Schools and Colleges, but Technical Institutes also cheerfully responded to the call. Even individual exhibitors connected with schools lent their helping hand. So Madras loomed large in the exhibition, and in view of the disproportionately large exhibits from the Presidency of Madras, it may be questioned whether the exhibition had an All-India stamp and character.

and if at the Conference only their final reports come up for consideration, much time can be spared for other useful activities. The Hyderabad Teachers' Association has found by experience that the appointment of such sub-committees leads to better results than the passing of resolutions or reading of papers. Then again, there are different stages of instruction—Primary, Secondary, Collegiate and Post-graduate and different fields of education—literary, training of teachers etc. A division of labour is therefore necessary. The present programme of work seems to be too ambitious and unwieldy. The organisers of the Conference would do well to adopt a more scientific plan of work which would lead to intensive rather than extensive reform in the different stages of instruction and different fields of education.

Needless to say, I have offered these few suggestions with the best of intentions. I am fully conscious of the fact that the organisation of an All-India Conference like this has it own peculiar difficulties and limitations. Nevertheless, I venture to think, that the suggestions made by me are not impracticable.

II

BY

SYED ZAHOOR ALI, B. A., B. T.,

Principal, Darul Uloom High School.

HAVING had the honour of being elected one of the two delegates—Mr. G. A. Chandawarkar, M. A., of the Residency Middle School being the other—by the Hyderabad Deccan Teachers' Association, I deem it a pleasure to write a brief report for the *Hyderabad Teacher*, the official

A few observations.

The All-India Federation of Teachers' Associations brought together a large number of teachers, professors, inspectors and other educational workers from all parts of India and thereby gave ample proof of the growing spirit of solidarity in the profession. If in the conference the teachers sought pedagogic advice it was as freely given as it was eagerly received. If the teachers were there to liberalise their views or to clarify their vision, they found ample opportunities for doing so. The Federation is not only helping teachers to safe-guard their interests but to direct their activities in the proper channel. It is making them gradually realise that with proper organisation they can become a power in the land. The statesman-like utterances of the President, the sage-like pronouncement of the Vice-Chairman, the educational films, the enjoyable excursions to places of educational interest, the scholarly papers read and discussed, the important resolutions moved and passed, the enthusiastic vernacular and English speeches, the excellent boarding and lodging arrangements made for the delegates, the well-organised Educational Exhibition and last but not least, the atmosphere of fraternity and good-will in which the delegates found themselves, all these combined to make the Conference a grand success, on which the organisers deserve our hearty congratulations. However, one may be permitted to observe that at the conference too many resolutions came up for discussion and the time allotted for them being utterly inadequate, they were passed, with few exceptions, in great hurry. Five resolutions adopted after fruitful discussion are a thousand times better than thirty resolutions passed hurriedly. In this connection, one may suggest that at future conferences fewer resolutions should come up for discussion. Another suggestion I wish to make is that previous to each Conference sub-committees be appointed for the consideration of the subjects selected for discussion

whose duty it is to see that the scales of justice are kept even? Have any of these so-called leaders ever come forward to say that the judges of High Courts should work without salaries or on a nominal salary, because it is a nobler profession? Is there anything nobler than seeing, for instance, that people who die are, if possible, prevented from dying, that persons suffering from dreadful diseases are relieved of their pain and suffering? Has it ever been proclaimed on any platform that doctors should not receive fees? Then why should the members of the teaching profession alone be asked to sacrifice, particularly when it happens to be a profession which requires rich intellectual and emotional qualities for the efficient discharge of its duties? It is impossible to expect that anybody could teach poetry, literature, drama effectively or feel enthusiastic over the great achievements of history and civilisation, if he has not seen some of the good things of life, and I hope that none of you, from any false sense of religion or virtue will ever agree to the proposition that a member of the teaching profession should work in poverty." In conclusion, he requested all the teachers to attend in large numbers the Conference of Asiatic Federation of Teacher's Associations to be held at Benares in December 1930.

Messrs Kodak Ltd: gave two Cinema shows which were attended by a large number of delegates. Some Eastman class-room films and comics were projected on the screen. 'The Panama Canal', "Water-power" and "Iron Ore to Pig Iron" films were much appreciated If similar films on Indian subjects are prepared, they will be very useful for school children in this country.

The social programme of the Conference included an entertainment given to the delegates at the Wesley College, Royapettah by Mr Muthiah Chettiar, son of Sir Annamalai Chettiar. The delegates also visited the Pencil Factory, the Madras University Library and the Museum.

In Mr. S. Satyamurti's paper on "The Mother-tongue as the medium of instruction" an appreciative reference was made to the Osmania University in these words: "I would commend to the Government of Madras the example of H. E. H. the Nizam whose Government are successfully attempting the task of making available in Urdu all the latest text-books in Science and other subjects". Such appreciation from a publicist and an educationist of Mr. S. Murti's reputation is highly encouraging. Other papers of importance were the following:— (1) "Five arts in Education" by Miss Krishna Bai; (II) "The teaching of English" by Dr. Michael West of Dacca; (III) "New Education in Russia" by Mr. C Ranganatham; and (IV) "Visual Instruction" by Mr. Devi Shankar Aiyar.

All the papers read and discussed clearly indicated that the old order is changing and that the new type of teacher should be one who has a broader out-look on life and keeps himself in close touch with the modern developments in educational practice and theory.

Principal Sheshadri's address.

After Messrs. Khattry of Cawnpore, Inamdar of Amaraoti and Banerji of Bengal had thanked the volunteers and the Reception Committee for the splendid reception given to all the delegates, Principal Sheshadri delivered an eloquent address in the course of which he referred to "the growing sense of unity in the profession all over India". He exhorted the teachers "to make up their minds to advance intellectually and to become educational teachers and not merely be content to be the servants in the profession". He recommended that proper facilities should be given to teachers for travel, for purchasing books and for living a decent life. Referring to the spirit of sacrifice demanded of a teacher he observed:—

"Is there anything nobler than the career of a judge whose duty it is to punish the wicked and reward the good,

requests the Governments, Rajas and Nawabs and the general public to tackle the problem of the education of the defectives and to save them from perpetual bondage, dependence and humiliation for their maintenance."

(v) "This Conference is of opinion that wherever possible Parents' Associations should be started with a view to bring about greater co-operation between parents and teachers." This resolution was moved by the writer of this article and seconded by Prof: Kulkarni of Gwalior.

The papers read.

No less than twenty-eight papers on various educational subjects were read and discussed. The first group of papers read related to the imparting of physical instruction in schools. The necessity of making physical education compulsory was felt by all. Some speakers, however, drew attention to such difficulties as inadequacy of staff, the unsuitability of the present school hours and the lack of suitable play-grounds. In this connection, it may be mentioned that the delegates witnessed a demonstration of physical exercises directed by Mr. G. F. Andrews, Assistant to the Advisor on Physical Education to the Government of Madras.

The next paper read was by Dr. F. H. Graveley, Superintendent of the Madras Government Museum, on "The Museum as an aid to school-teaching". The third paper read was one by Rao Bahadur Ram Sivan on "Agricultural Education," who recommended that proper facilities should be given to teach the subject in all schools, particularly in the rural schools. Miss A. M. Peterson of Porto Novo in her thought-provoking paper on "National Education" observed that the present system of education was one-sided and therefore defective. She enthusiatically pleaded for the introduction of a system of 'education best suited for the Indian genius'.

There was a resolution on *Sex Education* which was hotly discussed. One speaker pointed out that it would be dangerous to teach sex-hygiene to school boys, but the resolution was carried by a large majority. Another resolution on which there was a prolonged discussion was one relating to school inspection, which demanded that there should be 'Subject Inspectors' to work in co-operation with the ordinary Inspector. In this connection, reference was made to the success of the American system of appointing subject inspectors. The amended resolution ran thus: "This Conference is of opinion that the methods of school inspection now current are capable of improvement and do not help the schools adequately to improve their efficiency and outlook and that a new system must be tried of having a number of subject inspectors to work in co-operation with ordinary inspectors." Another resolution urged the necessity of popularising Adult Education and requesting the Government to start, in consultation with non-official educational bodies, a campaign for popularising adult education. Other important resolutions that were passed by the Conference are as follows :—

(i) "This Conference appoints a committee to report on the findings of the Hartog Committee"

(ii) "This Conference holds that greater emphasis should be laid on the value of school libraries as a very powerful instrument for the education of the children and that both the Government and the school managers should make liberal library grants to their schools to provide up-to-date popular juvenile literature and periodicals."

(iii) "This Conference requests the provincial Governments and Indian States to institute special funds to enable teachers to undertake occasional long distance educational tours."

(iv) "This Conference regrets the paucity of the schools for the defectives in the country and earnestly

The Fifth Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations.

I

BY

G. A. CHANDAWARKAR, M. A.,

Head-Master, Govt: Residency Middle School, Hyderabad-Dn.

The above conference was held in Madras on the 27th, 28th and 29th December, 1929 under the presidency of Sir P. S. Sivaswami Aiyar.

The resolutions at the Conference.

A large number of resolutions on varied subjects came up for discussion and nearly twenty-four of them were disposed of in the course of three hours. There was a heated discussion on the following resolution:—

"It is the opinion of this conference that the medium of instruction and examinations in the Secondary and Higher stages of education should be the mother-tongue and it urges on the Government and Universities the compulsory adoption of the same."

Several amendments were proposed, some suggesting deletion of the word 'compulsory' and some the wording "Higher stages of education". Both the amendments were lost by a majority of votes and the original resolution was then carried. Mr. Syed Zahur Ali, Principal of the Darul Uloom High School, Hyderabad-Deccan, spoke in Urdu on the importance of, and the progress made by, the Osmania University where Urdu is the medium of instruction. The general sense of the meeting was that the vernacular should be made the medium of instruction even in the college classes.

ideal place for cotton manufacture. It may take half an hour to get all this out, but it will be time well spent.

Another suggestion is that boys should be confronted with statements of whose truth or falsity they are to judge.

For example. Are the following statements true or not? Correct them as far as you can.

1. Madras is a much busier port than Bombay.
2. Daulatabad is one of the oldest towns in Hyderabad.
3. The rainfall of Adilabad is greater than that of Raichur.
4. The direction of the South Indian rivers shows that the Deccan slopes from East to West.

Such an exercise should be corrected at once so that a wrong idea may not linger in the boys' minds. Questions of this kind should train a boy to be more critical in his general reading and not to believe a thing merely because he sees it "in print".

There is no space here to deal with other subjects, but History and Mathematics may be mentioned as splendid material for the training of the critical faculty. The abolition of the Middle School Examination brings a new opportunity and a new responsibility to all of us. There is less excuse than ever for cramming and a much better chance for real mind training.

ged to judge for themselves how far it is true; they should be asked to give concrete examples both for and against

(*b*) A question like the following would be a very useful exercise. Read the following two extracts, reconcile them if possible, or give reasons for rejecting one rather than the other.

(1.) "No people can become great without Liberty. Servitude strangles genius and prevents the free expansion of the human mind. Freedom creates an atmosphere in which alone a nation can truly grow".

(2.) "Liberty is too dangerous a thing to be given to all. Many are not trained to use it wisely and in their hands it may lead to disaster and ruin. A skilful despot may be of greater service to a country than an ill-trained democracy."

(*c*) I have found a debating class of great service in this connection. Here a boy must decide the question for himself after hearing all that can be said on both sides. In such lessons I should put more emphasis on right thinking than on correct speech.

Geography. This subject should be taught almost exclusively on the inductive method—the reason for things being far more important than bare facts. To say that Lancashire is the seat of the manufacture of cotton in England is not a very illuminating item of information. But to get the boys to see *why*, is a real bit of education. Questions such as these should be asked. What kind of climate has Lancashire? Where does raw cotton come from? What is needed to drive machinery? After a lot of probing the boys will have discovered (largely by their own answers to leading questions) that cotton can be best spun in a damp climate like that of Lancashire: that cotton comes largely from America and that therefore it can be easily landed at Liverpool: coal is found near at hand and that therefore everything conspires to make Lancashire an

"read, marked, learned and inwardly digested" his mental pabulum, so long as he can disgorge it at the time of examination. He does disgorge it more or less successfully, but his mind is not very different from what it was, when the process of forcible feeding began.

The true purpose of education is to train a boy to think. In a recent speech Sir William Barton quoted the following epigram which we heartily endorse:— "Education means that which you have left, when you have forgotten all you have learned." Let a boy forget the Wars of the Roses and all his mathematical formulae provided he can think clearly and judge wisely. There must, of course, be many facts he must learn. He cannot make judgments if his mind is uninformed. But everything depends upon *how* he learns his facts. All through his school days a boy must be encouraged to form judgments for himself, to make up his own mind, to weigh the pros and cons of a question and give his own decision. As a Westerner I marvel at the wonderful power of memorising which so many Indians possess. But there is a great danger in it. It may supersede the power of reasoning and of independent thought—and it must be admitted that often it does.

A good teacher will always be on the lookout for an opportunity to present to his boys matters on which they must pass a judgment. Every subject on the Time Table furnishes such opportunity. Here are some brief indications as to how it may be done.

English. (*a*) Passages from the text book may be selected for critical analysis. The following is a passage from the text book in use this year:—

"Nature seems to have taken a particular care to disseminate her blessings among the different regions of the world, with an eye to mutual intercourse and traffic among mankind." It is not enough simply to explain the meaning of the words in this passage. The boys should be encoura-

Training the Critical Faculty.

BY

REV. L. SIMPSON, M. A.,

Principal, Wesleyan Mission High School.

"They wrote and wrote and wrote,
But though they wrote it all by rote,
They didn't write it right".

THE unfortunate students of whom this was said, had evidently prepared carefully for an examination, but had not learned to think clearly. There are times when I feel that I should like to strangle the man who invented examinations, for they have done a great deal to strangle real education. Like a menacing Fury, Examination has taken her stand at the school door threatening with dire penalty all those who cannot pay their tribute, and at the same time offering reward to those who can. So her shrine is crowded with eager worshippers, some of them even having recourse to talismans and mantrams in order to win her favour.

Getting through the examination is the only aim of many of our boys. Exams there must be, (though examination reform is long overdue), but if instead of being an *aid* to instruction they become its *aim*, they are dangerous. They must be kept in their right place as tests, not of the number of facts remembered, but of the growth of intelligence. The idea current in some quarters seems to be that in so much time, so much information has to be pumped into a long suffering pupil, much in the same way that a turkey is forcibly fed to fatten it for the Christmas market. Whether the turkey assimilates the food or not, doesn't matter, so long as it looks fat. And in many cases, alas, it doesn't much concern the instructor whether the boy has

Lastly comes the *Practice* of the Art, using materials previously acquired.

To illustrate these processes from Arithmetic: the Multiplication tables contain a mass of identities which have to be explained by means of the ball-frame, beads, coins etc., and then the class has to be drilled in them; the students will then have to memorise the identities, and lastly they must be used in problems which require practice. It is for want of adequate attention to these several processes that arithmetic teaching proves a failure in the case of the majority of students.

What we want is a combination of the old and the new; sufficient of the old to secure facility and of the new to obtain true comprehension.
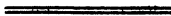
learnt *viz:*—8 x 8=64 and 8 x 9=72=9 x 8, and in 9-table only one product *viz*:—9 x 9=81 is to be learnt afresh. Repetition would soon fix this. In learning the table of 9, the children would be led to note the following facts from the table.

9	1	9
9	2	18
9	3	27
9	4	36
9	5	45
9	6	54
9	7	63
9	8	72
9	9	81
9	10	90

(1) The units figures are in descending order:-
9, 8, 7, 6, 5, 4, 3, 2, 1, 0.

(2) The tens-figures are in ascending orders:-
1, 2, 3, 4, 5, 6, 7, 8, 9.

(3) The number of tens in the product is one less than the multiplier.

(4) The sum of the digits in the product in each case is 9.

Plenty of mental arithmetic with repetition will be found more effective for securing permanent impressions.

Individual or collective repetition of some kind there must be, and that repetition should be *attentive* and *effortful* and it should take place with a steady determination to improve. Therefore, testing should be frequent and regular. The teacher should know which of his children know the tables well and which do not. Time is an important factor. The children should be urged to work as fast as possible with absolute accuracy.

Arithmetic should be taught as an art as well as a science. The essential processes involved in the attainment of an art are:— (i) Instruction, (ii) Drill, (iii) Exercise and (iv) Practice.

By *Instruction* is meant the requisite explanation and knowledge of the material to be used in the art.

By *Drill* is meant the process of impressing the requisite information of the material relating to the art.

By *Exercise* is meant a process by way of differentiating the student's share of work as distinct from that to be done under the control and supervision of the teacher in the class-room.

0 0 0 0 0 0 0 0	2 taken 4 times is 8 or 4 taken 2 times is 8	2 x 4 = 8 = 4 x 2. 0 0 0 0 0 0 0 0
0 0 0 0 0 0 0 0 0 0	2 taken 5 times is 10 or 5 taken 2 times is 10	2 x 5 = 10 = 5 x 2. 0 0 0 0 0 0 0 0 0 0

and so on.

Thus 2 x 3 can be verified by the child who can count 2 three times or 3 two times and so find the total to be the same in both cases; so with the other numbers. This will considerably decrease his work in building up the tables of further numbers. The leaps between two successive products are very small, and the mind is generally agile enough to make them.

The easy tables might include those of 2, 3, 4, 5, and 10. The table of 11 also is very easy to be memorised owing to the reduplication of figures in the product each time; as, 11 x 4 = 44, 11 x 8 = 88.

The harder tables might include those of 6, 7, 8 and 9. In learning the table of 6, more than half of the portion (6/10th, to say exactly,) is already known to the children for—

6 x 1 is the same as 1 x 6
6 x 2 ,, 2 x 6
6 x 3 ,, 3 x 6
6 x 4 ,, 4 x 6
6 x 5 ,, 5 x 6
6 x 10 ,, 10 x 6

The remaining portion of the table can be built up in a short time and remembered easily. In learning the table of 7, 7/10ths is already known to the children and 3/10th is to be learnt afresh viz:— 7 x 7 = 49, 7 x 8 = 56 = 8 x 7, and 7 x 9 = 63 = 9 x 7. The reduction of the work will be an incentive to learn new portions. In the table of 8, only two new products are to be

themselves. It is no use writing on the blackboard a table, say, 5 times table, and asking the boys to copy it and learn it by heart without making them understand it properly. The teacher should create a situation whereby the children might feel the necessity of learning the tables so as to acquire speed and accuracy in Arithmetic. First, each table should be built up by the children in the form of a series of addition sums. A portion only of any one table should be attempted in one lesson. The working of the table should be repeated several times as a counting exercise, *e.g.*, 5 taken once is 5, 5 taken two times is 10, 5 taken three times is 15, and so on. This will greatly facilitate the acquisition of higher tables, because the child becomes acquainted with the series of multiples of the number up to 10. The result should be tabulated by the teacher on the black board with the help of the boys.

It is not quite necessary that the Tables should be taken in the serial order of numbers. They may be grouped into (1) easy tables and (2) hard tables. The table of 10 is very easy from the constant recurrence of 0 and from the similarity of figures in the product and multipliers. The table of 5 also is very easy from the alternate recurrence of 5 and 0.

Let the children make up the tables of 2 and 3 by making use of concrete objects like marbles, sticks, seeds, or balls on the frame. In making up a table of 2, the child can learn many things, for example :—

0 0	2 taken once is 2	2 x 1 = 2.
0 0 0 0	2 taken two times is 4	2 x 2 = 4.
0 0 0 0 0 0	2 taken 3 times is 6 or 3 taken 2 times is 6.	2 x 3 = 3 x 2. 0 0 0 0 0 0

complaint from various guardians is often heard that due attention is not paid to the teaching of multiplication tables and hence their children find it difficult to solve everyday bazaar problems with sufficient promptness and accuracy; they often say that this part of arithmetic is totally neglected in primary schools.

On the other hand, the teachers who have undergone training and learned some principles put forward this excuse, that, if the children learn the tables by heart, their memory is unduly taxed. They should bear in mind that a certain amount of memory work is necessary in the lower classes and that the time spent on the multiplication tables and fraction tables is not wasted. There are still some teachers who resort to the method of making the children repeat tables simultaneously in parrot fashion. This method is old fashioned and ineffective. The practice of teaching the tables by mere oral repetition is not satisfactory because it does not develop the intelligence of the children and also it fails to secure their interest.

It is not suggested that all the tables shoud be learnt before the ordinary exercises on Arithmetic are begun. The tables cannot be learnt in a day or in a week. They require *systematic*, *persistent practice* day after day. Every effort should be made to secure *attentive repetition* and to make the children think about the numbers in concrete terms.

A thorough knowledge of multiplication and fraction tables is the main factor in acquiring speed and accuracy in practical mental arithmetic. No boy who has these tables at his fingers' ends would find it difficult to answer orally every-day problems with sufficient speed and accuracy. These tables should, therefore, be systematically taught to the children in the Primary stage.

"Learn by doing" should be the principle observed in teaching multiplication and fraction tables. Teachers should take care that each table is built up by the children

or reduced to hod-bearing; and an Architect is hired, and on all hands fitly encouraged: till communities and individuals discover, not without surprise, that fashioning the souls of a generation by Knowledge can rank on a level with blowing their bodies to pieces with Gunpowder; that with Generals and Fieldmarshals for killing there should be world-honoured Dignitaries, and were it possible, true God-ordained priests for teaching."

Importance of Multiplication Tables in Arithmetic.

BY

D. C. BHOGLE, B. A., B. T.,

Assistant, Teachers' Training College, Hyderabad-Dn.

IT is generally found that many young boys fail to give an exact or even approximate answer to an arithmetical problem of everyday life unless they have a slate and pencil or a paper and pen to work at it; also pupils seem unable to work with speed and accuracy even simple problems on the first four rules. The failure to memorise tables is one of the contributory causes of inaccuracy in arithmetic.

Before the establishment of the training institutions, these tables were learnt by heart by almost all the children in primary schools, and were repeated simultaneously every evening before the school dispersed. The idea of education in those days was the children should be able to read and write and solve everyday problems promptly and accurately. The idea even now is the same, but a change has occurred in the way of its realisation. Now-a-days, a

All the boys in this list showed benefit from a carefully organised programme of games. Of the thirteen cases despaired of by the teacher, there was not one boy who was not greatly improved by the application of some commonsense remedy. There were only two cases of low mental capacity, and they would certainly have been suited by a special class, with progress at their own pace. Boys have as many different grades of intelligence as they have of physical stature, and it would be well if classes were formed according to mental age, and not chronological age. The solution is to get away from the steriotyped class-teaching method, and let every boy progress at his own rate.

A word may be added, in conclusion, against the tendency to regard physical exercises and games as a cure-all. Recent investigations by Dr. Brae Hanson, Chief Inspector of Physical Education for Danish schools, have led him to the conclusion that there is a distinct type of boy who is not naturally inclined for robust exercise. Such a type remains healthy and alert mentally, and may actually be adversely affected by compulsary games. A pupil in whom there is a rheumatic or a pre-rheumatic tendency, or a boy suffering from lack of proper food, may be further retarded by injudicious application of exercises.

Physical exercise has its proper place in the teacher's duties; it must be part of his equipment and training that he may know its manifold benefits and distinct limitations. When the various problems of education are visualised, the point which assumes ever-increasing prominence is the need for a supply of the very best men as teachers, who shall receive adequate, scientific, and practical training, to equip them for their task of moulding the next generation. But there seems little hope of such an ideal at present, when the educational service seems the Cinderella of the services in most countries. Still we may work for the day which was foreshadowed by Carlyle, " when the Hodman is discharged,

special "retards' class" might be formed in many schools, under a specially qualified teacher. This should not be looked upon as a permanent class, but as a convalescent room, where a child who has fallen behind mentally may be cured and restored to his proper class. Here a child who is mentally incapable of proceeding at the pace of his brighter brothers may be allowed to proceed at his own pace.

School medical clinics have long since proved their usefulness. I may quote one typical case of a class of twenty four boys, in form III of an Indian High School, and, I may mention, a long way from Hyderabad State. The report of the form-master classified thirteen boys as dull and backward, and incapable of making progress. An examination of the boys in question yielded the following results :

(1) Two cases of slight deafness, which the teacher had not suspected. This was due to the presence of adenoids and enlarged tonsils. After the neeessary operation, both boys improved greatly in school work and general health.

(2) One distinct case of of defective eyesight. For months the boy had actually been unable to read what was written on the blackboard, but did not like to say so. An immediate improvement was effected by giving him a seat in front of the class, and ultimately, after the provision of glasses, he rose to second place in the examination.

(3) Two distinct cases of malnutrition, due to iusufficient food in poor homes. Provision of a mid-day meal at school yielded exceedingly beneficial results.

(4) Four boys who were manifestly not getting enongh sleep. They came from families of good position, but were attending cinemas, late dinners, and social functions. They were in a condition of chronic fatigue. On this being pointed out to their parents, an immediate improvement was brought about by extra sleep.

Under the heading of Psychological cases must be considered slow mental developement, undue suppression—often misnamed discipline, misunderstanding on the part of the teacher or parent, and fear. The teaching profession is sometimes to blame in the matter of causing many children to become backward. Lack of understanding, faulty methods, and poor teaching ability may be direct causes of backward children. It is dangerously easy to create an "inferiority complex" in a nervous child, and exceedingly difficult, when once that has been done, to restore the lost self-respect. Hence it is very important that students in training, who do not show a real aptitude for teaching, should be discouraged at the onset.

The methods of preventing all those conditions are, as a rule, fairly obvious. Social reforms in home and school will eliminate many, though not all, types of backwardness. But, in the first place, it is necessary that the individual characteristics and ability of each child should be understood and noted, and a useful step towards this end would be the application of an intelligence test before admittance to the infant school. The greatest and most beneficial movement in England during recent years has been the establishment of nursery schools, for the education of children between the ages of three and five years. Apart from the benefit which many children derive by being removed from unsatisfactory home influences, such schools give the infant the chance to make a good start by reaching normal developement at the age of five years. In the case of a child whose *mental* age is less than five years, he may remain in the nursery school for a year longer. There is little to be gained by forming a class of children on a chronological five year basis, when several of them are young mentally, and have been "retards" ever since the days of babyhood. Smaller classes in infant and junior departments would help to prevent the creation of such "retards" in school, by making individual attention possible, while a

In his visits to schools for teaching practice, the conduct of a class in physical exercises is included, and all students are compelled to pass a final practical examination as teachers of physical exercises, showing that they are competent to undertake the physical, as well as the scholastic and moral education of their pupils. It is now universally admitted that this is the teacher's duty, almost his most important duty, and must not be left to any "drill instructor" or visiting specialist, very often in the past a person of inferior education and status, with very little knowledge of boys. Education is not divided into water-tight compartments, and the teacher who is not familiar with the games and physical exercises of his boys will never fully gain their confidence and respect, or get the best results in class-room work.

In all schools, the pressing problem, whether recognised or not, is that of the backward child. The average teacher works on a misleading estimate, recognising in his form only two types: boys who are clever and boys who are stupid, or those who are good workers and others who are not. Many are quite ignorant of the elementary fact that educational backwardness is usually traceable to some distinct cause, sometimes physical, and sometimes mental. Miss Muir, of the Educational Institute of Scotland, divides children into three classess of backwardness: (1) Sociological (2) Psychological (3) Physiological. The first category is usually due to bad housing conditions, a low standard of home life, and malnutrition. In this connection, too, the school buildings are not always what they might be. Dark and stuffy class- rooms have a depressing effect on children, and an adverse effect on education. The capable teacher will continually be on the look-out for physical defects in children who appear slow. It is seldom that a medical officer, even where inspection does exist, is able to make a complete examination. He must be guided in his diagnosis by the observations of the teacher, with regards to physical defects.

succeed with one class of pupil will be hopelessly ineffective with another. Visits are frequently paid to special schools for defective and backward children, medical clinics where physical defects are treated, welfare centres for the special care of infants and the education of the expectant mother. Side by side with this, a steady course of practical teaching is going on. During his first two years, the student is paying at least one visit weekly to a school where he conducts a carefully prepared lesson with a class of about thirty children. This lesson is supervised by a member of the College staff, who gives helpful suggestions and criticisms afterwards, and indicates any necessary improvements in method or manner. Three periods, each of one month, are given up entirely to practical teaching, during the student's college course. For a month he is in daily attendance at a public primary or secondary school, where he takes two lessons daily. He is visited daily by his College tutor, who compiles a record of the student's progress as a practical teacher. The final period of teaching practice is near the end of the training course, and the student is now visited by an Inspector of the Board of Education, as well as his College Tutor. They grade all students as A, B, C, or D, divisions which correspond generally to Excellent; Very Good; Average; Poor. The student then faces his written examination, and, if successful in all branches, receives his Teacher's Certificate, and is free to apply for employment in a Primary School. The intending secondary school-master should wait for another year to complete his degree, though most primary teachers also do this.

Throughout a student's career, he is trained in practical and manual work, physical training, and hygiene. His course includes two study periods weekly on the laws of health, and the general physical condition of school children. He also attends each week three practical periods of physical exercises under the college Tutor in that subject, and a lecture on the principles and methods of physical training.

one year to a Primary School of good standing, and attached for instruction to an experienced form-master. For some two or three months, the student will do no more than observe the various lessons which are taken by the form-master, and will have important points dealing with method and results illustrated in a simple and non-technical manner. Then his first practical steps will probably consist of the organisation and supervision of simple playground games, designed to give him the necessary feeling of confidence. Gradually he will work up to his first handling of a class-room lesson, in the preparation of which he will be helped by the form-master, who will indicate stages and methods which the lesson should take, and give helpful suggestions afterwards. Towards the end of this probationary year, the student will be taking two lessons daily, and, when his course is finished, the Headmaster and form-master will submit a report to the Education Authority as to whether the student is likely to develope into an efficient teacher. Should this report be satisfactory, he will be sent to a Training College to *commence* his professional training.

The following is a brief sketch of the training course at St. Mary's College, Middlesex. Before admission, the student is interviewed personally by the Principal, and must again submit to a searching medical examination. The course covers three years for the majority of students, for practically all must now take a degree, in addition to training. The student will take Inter B. A. or Inter B Sc. in his first year, and complete his final degree in the next two years. Meanwhile lectures are delivered daily on the theory and principles of education, and every branch of Pedagogy is dealt with in the class room. At the same time, visits are paid weekly to schools and institutions of every description, and the methods of the best teachers are shown by special demonstration lessons. Every step is taken to make the student familiar with different types of children, and to bring home to him the fact that methods which may

The Teacher, and his Equipment.

BY

W. TURNER, M. A., F. I. H., D. P. E.,

Professor of English, Nizam College.

GREAT as has been the advance in the science of education during the present century, it is still no more than fifty years since it was first realised in Europe that the education of the young calls for highly specialised knowledge, and an assiduous apprenticeship on the part of the teacher. The owner of a large factory or mill would shudder at the idea of placing an inexperienced man in charge of one of his engines or looms; the young horse is never given over for training to any except an experienced horsebreaker; yet in the field of education it seems possible for anyone who has passed such an elementary standard of scholastic attainments as Inter or B. A. to enter the profession boldly as a fully-fledged teacher. He may at once take charge of machinery more delicate and intricate than any in the factory, and proceed to mould a complex living organism which is more sensitive and susceptible to lasting impressions than the thoroughbred colt.

It may be of interest to give a sketch of the training which is insisted upon by the English Board of Education, for all who desire to enter the teaching service of the state, in Primary or Secondary School. On attaining the age of seventeen, and passing the equivalent of London Matriculation, a boy may be selected by his local Education Authority for a year's service as "Student-teacher." He must also pass a strict medical examination, and show that he has taken an active part in the games and out-of-door activities of his secondary school. He will then be sent for

The Hyderabad Teacher.

LIST OF BOOKS PURCHASED FOR THE LIBRARY OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION.

(Continued from the previous issue.)

1. Principles of Education by Raymond.
2. Indian School Organisation by Wren.
3. A Cyclopaedia of Education by Paul Monroe Vols. I, II and III.
4. Principles and Methods of Teaching by Welton.
5. Manual of Teachers by Richey.
6. First Book of Rural Science by Green.
7. The Psychology of Education by Welton.
8. Text Book of Experimental Psychology Vols. I and II.
9. Essays on Education by Herbert Spencer.
10. The Nation's Schools by H. Bompas Smith.
11. The Herbartaian Psychology by John Adams.
12. Education by Edward L. Thorndike.
13. Sanderson of Oundle.
14. Bedales: A Poineer School by D. H. Badley.
15. The Education of Man by Friedrich Froebel.
16. The Remaking of Village India by Brayne.
17. The British Empire by Basil Williams.
18. Educate your Child by H. McKay.
19. Language in Education by Michael West.
20. Rural Education by Arthur W. Ashby and Byles.
21. On the Writing of English by George Townsend Warner.
22. The Proceedings of The All-India Federation of Teachers Associations by M. R. Paranjpe.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA No. 14

Vol. IV. January, 1930 A. D. / Isfandar, 1339 F. No. 3.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan, Esq., M. A.,

Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

P. V. R. SEBASTIAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1930.

Single Copy Annas 12. (Postage Extra.)

رجسٹر شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۷۴

جلد (۴) شمارہ (۴)

زیر سرپرستی جناب فضل محمد خان صاحب ایم اے ناظم تعلیمات سرکار عالی کے ممالک محروسہ

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

دائرہ ادارت:۔

سید علی اکبر ایم اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن ملا بی اے۔ بی ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبدالنور صدیقی بی اے۔ بی ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم شیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتمی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو پیدا کرنا۔
(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصولڈاک سالانہ (سکہ انجمہ)
صرف اردو حصہ (۱۴) فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ر) صرف اردو (۸ر)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(س) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیے۔
(ص) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عہ	صہ ۸ر	سے
نصف صفحہ	صہ	عہ ۱۲ر	صہ ۸ر
ربع صفحہ	عہ ۸ر	عہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ خورداد ۱۳۲۹ف م اپریل ۱۹۲۰ء

فہرست

جلد ۴ — شمارہ ۴

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ حیدرآباد دکن

کی

چوتھی سالانہ کانفرنس کا نظام العمل

پنجشنبہ ۲۸ر امرداد ۱۳۳۹ف م ۳ر جولائی سنہ ۱۹۳۰ع

پہلا اجلاس ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے دوپہر تک

(۱) افتتاح نمائش — ۲۰ منٹ

(۲) قرأت و پرارتھنا — ۵ منٹ

(۳) خطبۂ استقبالیہ — جناب مولوی سید ظہور علی صاحب بی اے بی ٹی صدر دارالعلوم و صدر استقبالیہ کمیٹی — ۲۰ منٹ

(۴) رپورٹ انجمن — سید محمد شریف صاحب مشہدی ناظر مدارس بلدہ معتمد عمومی — ۱۰ منٹ

(۵) تحریک اظہار افسوس بر انتقال پر ملال جناب کے پی شاستری صاحب بی اے ایل ٹی صدر مدرس مدرسہ مفید الانام و جناب احمد الدین صاحب بی اے بی ٹی ایل ایل بی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ — عالیجناب صدر کانفرنس — ۵ منٹ

(۶) خطبۂ صدارت — عالیجناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد سرکار عالی صیغۂ کوتوالی و امور عامہ — ۴۰ منٹ

(۷) تقریر انگریزی بعنوان "شخصی حفظان صحت" — جناب ڈاکٹر لطیف سعید صاحب ایم بی سی ایچ بی (اڈنبرا)

(۸) تحریک "کانفرنس ہذا سفارش کرتی ہے کہ سائنس کو بشمول حفظان صحت طبقۂ وسطانیہ کی تعلیم کے لئے لازمی مضمون قرار دیا جائے اور ہر مدرسہ وسطانیہ میں ایک مستند سائنس ٹیچر کے تقرر کے علاوہ ایک مکمل معمل مہیا کرنے کا فوری انتظام فرمایا جائے"۔

محرک:- جناب مسٹر ہیوز ڈن صاحب گرامر اسکول۔

موید:- جناب سردار رضا صاحب بی اے بی ٹی مددگار مدرسہ دارالعلوم بلدہ۔

دوسرا اجلاس

بعد دوپہر ڈھ بجے سے ساڑھے چار بجے تک

(۱) رپورٹ سب کمیٹی متعلقہ تعلیم جغرافیہ — معتمد صاحب کمیٹی گور ۲۰ منٹ

(۲) ″ ″ ″ ″ تاریخ — ″ ″ ۲۰ منٹ

(۳) تحریک ”یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ السنہ مشرقیہ کی تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے کے لئے علوم مشرقیہ کی اسناد رکھنے والے ان مدرسین کی تعلیم کے لئے جو اس وقت سررشتہ میں ملازم ہیں عثمانیہ ٹریننگ کالج میں تعلیم کا انتظام فرمایا جائے“

محرک :- جناب سید فخرالحسن صاحب ملا۔ بی اے۔ بی ٹی صدر مدرس مدرسۂ وسطانیہ چنچل گوڑہ۔

موید :- جناب مولوی عبدالمجید صاحب مددگار مدرسہ دار العلوم۔

جمعہ ۲۹ مرداد ۱۳۳۹ف م ۴ جولائی ۱۹۳۰ء

پہلا اجلاس صبح سوا نو بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک

۱۵ منٹ

(۱) تحریک ”اس کانفرنس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ ناقص القوی اطفال کی تعلیم کے لئے مستقر بلدہ میں ایک مدرسہ معہ ایک دارالاقامہ کے قائم کیا جائے“۔

محرک :- جناب ڈی وی ہارڈیکر صاحب صدر مدرس مدرسہ دیویک وردھنی گولی گوڑہ۔

موید :- مولوی غلام دستگیر صاحب بی اے۔ اول مددگار مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ۔

(۲) تقریر بزبان اردو :- بعنوان ”مدرسہ کی جماعت میں حکومت خود اختیاری“ — ۳۰ منٹ

جناب سید فخرالحسن صاحب ملا۔ بی اے۔ بی ٹی صدر مدرس مدرسۂ وسطانیہ چنچل گوڑہ

(۳) تحریک :- ملک سرکار عالی میں ناخواندہ اشخاص کی کثیر تعداد کے لحاظ سے کانفرنس ہذا تحریک کرتی ہے کہ مستقر بلدہ اور اضلاع میں بھی تعلیم بالغان کی ترویج و توسیع کے لئے پرزور تدابیر اختیار کی جائیں۔“ — ۱۰ منٹ

محرک :- جناب سید ظہور علی صاحب بی اے۔ بی ٹی صدر دار العلوم بلدہ۔

موید:- جناب مولوی معین الدین صاحب قریشی ایم اے صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ آصفیہ ملک پیٹھ۔

(۴) رپورٹ سب کمیٹی متعلقہ علم ریاضی۔ معتمد صاحب کمیٹی مذکور ۶۰ منٹ

(۵) تحریک:- "یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ تعلیم تجارت (کامرس) کو امتحان ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کی طرح عثمانیہ میٹرک کے امتحان میں بھی بطور اختیاری مضمون شریک فرمایا جائے"۔ ۱۰ منٹ

محرک:- جناب باقر محی الدین صاحب سٹی کالج

موید:- جناب سید غلام محمود صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج۔

دوسرا اجلاس

بعد دوپہر ۲ بجکر تیس منٹ سے پانچ بجے تک

(۱) تحریک:- "جملہ مدارس میں پیشوں کی تعلیم جاری کرنے کے خیال سے یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے تاوقتیکہ پیشوں کی تعلیم دینے والے مدرسین کی تعلیم کا انتظام اندرون ملک نہ ہو۔ ان مدرسین کے لئے جو اس مضمون سے خاص دلچسپی رکھتے ہوں برٹش انڈیا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف کی کافی تعداد منظور فرمائی جائے"۔

محرک:- جناب سید مجتبیٰ حسن صاحب نقوی بی اے۔ بی ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نامپلی۔

موید:- جناب نظیر حسین شریف صاحب ناظر مدارس بلدہ

(۲) تجدید تحریکات سابقہ ۱۰ منٹ

(۳) اعلان مضامین منتخب کردہ مرکزی انتظامی کمیٹی برائے کانفرنس آئندہ ۳۰ منٹ

سائنس اخلاقیات ڈرائنگ

(۴) تقریر انگریزی بعنوان "تعلیم اور شہریت" جناب ڈبلو ٹرز صاحب ایم اے منصرم پرنسپل نظام کالج ۴۰ منٹ

۲۰ منٹ

(۵) تقسیم انعامات نمائش

(۶) عالیجناب صدرنشین صاحب جلسہ کی آخری تقریر۔

(۷) شکریہ۔

افتتاحیہ

کچھ اپنے متعلق اس شمارہ سے حیدرآباد ٹیچر کی زندگی کے چار سال پورے ہو جاتے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جن اغراض و مقاصد کی تکمیل کا بیڑا اُس نے اُٹھایا تھا اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ اور سررشتہ تعلیم و معلمین کی خدمت کا حق جس طرح چاہیئے ادا ہوا۔ اس طویل عرصہ میں ہم نے طباعت و کتابت اور مضامین کا معیار بلند کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اور ہر ممکنہ طریقہ سے رسالہ کو مفید و بہتر بنانے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ اور پانی کی طرح روپیہ اس توقع پر بہاتے رہے کہ آج نہیں تو کل رسالہ کی تعلیمی خدمات کی قدر ہو گی۔ لیکن جس سرپرستی، ہمدردی اور دستگیری کا آسرا لگائے بیٹھے تھے وہ نصیب نہ ہوئی اور آج بھی ہم انجمن اساتذہ بلدہ کے دست فیض کے رہین منت ہیں۔ ہم ان عہدہ داران تعلیمات سرکار عالی کے بیحد شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں رسالہ کو جاری فرماکر اپنی تعلیمی دلچسپی و معارف نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس طور پر رسالہ کی جتنی اشاعت ہوتی ہے اس سے مصارف کی پابجائی ممکن نہیں۔ ہماری نہ صرف یہ تمنا ہے کہ "ٹیچر" انجمن اساتذہ کی منت کشی سے بے نیاز ہو جائے۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اسکی خوبیوں میں ترقی ہو اور فائدہ رسانی و سودمندی میں حیدرآباد ٹیچر یورپ و امریکہ کے تعلیمی رسالوں کا ہم پلہ ہو جائے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ جمہور اساتذہ ہمارا ہاتھ بٹائیں صدر مہتمم صاحبان اسمات و مہتمم صاحبان اضلاع و صدر مدرسین ثانویہ اپنے ماتحت مدارس کے لئے مستقل خریداری منظوری فرمائیں۔ اور مدرسین ذاتی طور پر رسالہ کے خود بھی خریدار بنیں اور اپنے دوستوں کو رسالہ کی معاونت کی ترغیب دیں۔

مسٹر کے پی شاستری سرگباس بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ تعلیمی سال کا آخری حصہ ہمارے لئے بے حد منحوس ثابت ہوا اور ہماری انجمن کے دو نوجوان رکن نذر اجل ہو گئے۔ پہلے مسٹر کے پی شاستری صاحب گئے۔ یہ سرگرم اور جوشیلے نوجوان

مدرسۂ فوقانیہ مفید الانام کے صدر مدرس تھے اور انجمن اساتذہ کے صدر انتظامی کمیٹی کے رکن خصوصی تھے سال حال تعلیم جغرافیہ پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ آپ اس کے معتمد منتخب ہوئے تھے۔ کمیٹی مذکور کے اجلاس ہو ہی رہے تھے کہ آپ مبتلائے نمونیہ ہو کر دیکھتے ہی دیکھتے چل بسے۔

مولوی احمد الدین مرحوم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایل ایل بی

مسٹر شاستری کی بے وقت جوانمرگی پر اظہار غم کرنے کے لئے تجویز پیش ہونے والی ہی تھی کہ مولوی احمد الدین صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ نے ہمارے زخم خوردہ دل کو نیا داغ دیا۔ مرنے سے چند روز قبل مرحوم بورڈ کے اجلاس میں مدارس وسطانیہ اور ان کے طلبہ کے حقوق کے لئے جی توڑ کر لڑے۔ آہ ابھی ان کی دلکش آواز ان کا شگفتہ چہرہ۔ ان کی دلاویز مسکراہٹ آنکھوں کے سامنے کھیل رہی ہے۔ دفعتہً درد معدہ و امعاء میں مبتلا ہو گئے اور قبل اس کے کہ ڈاکٹر و حکیم مرض کی تشخیص کریں ہنستے بولتے راہی عدم ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے والے کو موت نظر آتی ہے۔ کم از کم مرحوم کو تو یقیناً معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اب دنیا کو الوداع کہنے والے ہیں۔ مرنے سے کچھ دیر قبل اپنے بعض دوستوں سے کہنے لگے "اچھا خدا حافظ اب میرا وقت آگیا ہے" جب لوگوں نے ڈھارس دینے کو کہا ار گھبراؤ نہیں۔ اللہ جلد شفا دیگا" تو ہنس کے کہا "اچھا بھئی نہ مانو کل صبح تک معلوم ہو جائے گا" تھوڑی ہی دیر بعد ایک ہچکی آئی اور خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

مرحوم بڑے ملنسار، پرخلوص اور مرنجان مرنج تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی قابل رشک تھی۔ فرض شناسی اور تعلیمی شغف کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ مرنے سے کچھ پیشتر بھی مدرسہ اور امتحان کا ذکر کر رہے تھے۔

مرحوم نے صرف ۳۵ سال کی عمر پائی۔ اور اپنے عزاداروں میں بیوہ تین صغیر سن بچے اور احباب کی کثیر تعداد چھوڑ گئے۔

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

علم کیا ہے؟

از

جناب مولوی سید علی محمد صاحب اجلال

(مدرس مدرسۂ وسطانیہ چنچل گوڑہ)

یہ بلند پایہ نظم حضرت اجلال نے مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر پڑھی تھی
ہم مولانا کے بے حد شکر گزار ہیں کہ آپ نے یہ نظم حیدرآباد ٹیچر کے لئے ہمیں عنایت فرمائی۔

مدیر

علم کیا اک بحر ہے اور بحر ناپیدا کنار — جس کی ہر ہر موج ہے راز بقا کی پردہ دار
جس کے دامن میں حقائق کے ہیں گوہر بیشمار — مستتر ہیں جس کے ہر قطرہ میں در شاہوار

دیدۂ عرفان ہر اک گرداب کا آغوش ہے
جس کے ہر طوفاں میں اک روحانیت کا جوش ہے

علم کیا ہے درحقیقت ایک اعلیٰ نور ہے — جو حجاب قدس میں گنجینۂ مستور ہے
جو فضائے عالم تجرید میں محصور ہے — جس کی منزل عرش کی منزل سے بھی کچھ دور ہے

ماہو ہے مبداء فیاض عالی کا وہی
ہے سبب تکوین آثار جلالی کا وہی

عقل اول کیا ہے پہلی علم کی تصویر ہے — صورت لوح و قلم کیا اُس کی اک تحریر ہے
عرش کیا ہے علم کی اک معنوی تعبیر ہے — عالم ارواح و النفس اُس کی اک جاگیر ہے

کوکب و افلاک و انجم میں اُسی کی ہے چمک
آب و باد و خاک و آتش میں اُسی کی ہے جھلک

انتظام عالم علوی و سفلی دیکھئے — جوہر و اغراض کی شیرازہ بندی دیکھئے
اجتماعی منظر باقی و فانی دیکھئے — نفس کے آغوش میں اور جسم خاکی دیکھئے

ہیں یہ سب علم آلہٰی کی کرشمہ سازیاں
جس نے حرفِ کن سے پیدا کر دیا سارا جہاں

میرے دل سن بات کہتا ہوں میں تجھ سے دور کی — مظہر علم و عمل ہو گا اگر منظور کی
چاہتا ہے گر پڑیں تجھ پر شعائیں نور کی — کان میں آنے لگیں تیرے صدائیں طور کی

کر ریاضت نفس کی اخلاق کی تصویر بن
بہر تحصیل معارف قلب پُر تنویر بن۔

اعلان

انجمن اساتذہ بلدہ کی سالانہ کانفرنس میں جو حضرات شریک ہونا چاہتے ہوں وہ براہِ کرم فیس رکنیت انجمن اساتذہ مبلغ للعہ میرے پاس وسط امرداد ۳۹ سنہ فصلی تک روانہ فرما دیں۔ اس رقم میں رسالہ ٹیچر کا ایک سال کا چندہ بھی شامل ہو گا۔ فقط

سید محمد شریف مشہدی

معتمد عمومی انجمن اساتذہ

حیدر آباد دکن

جسمانی نشو ونما

(از)

مولوی سیّد محمّد ہادی صاحب ایم۔ اے (کنٹب)
صدر مہتم ورزش جسمانی و ناظم بوائے اسکوٹ ممالک محروسہ سرکار عالی

اگرچہ کہ ہر انسان کے ڈھانچے کی وضع اور اُس کی قامت ابتدا ہی سے مقررہ ہوتی ہے لیکن وہ اپنی حد مقررہ کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ انسان اُن اُصول پر کاربند نہ ہو جو ترقی جسم کے لئے بنائے گئے ہیں۔

جب بچّہ پیدا ہوتا ہے اُس کے اعضا عمدگی سے ترتیب دئے ہوئے ہوتے ہیں بعد میں ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ اُن کو اس حد تک ترقی دی جائے جس حد تک وہ ترقی پا سکتے ہیں۔ ہم کو اس کا تو علم نہیں کہ قدرت ان کو کن اصول پر اور کس طرح ترتیب دیتی ہے لیکن اُن اصول سے رفتہ رفتہ واقف ہو چلے ہیں کہ ان کو کس طرح ترقی دی جانی چاہیئے۔

یوں تو جسم کی نشو ونما کے لئے بہت سے ذرائع ہیں لیکن تعلیمی نقطۂ نظر سے ورزش[1] سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ لہذا تعلیم ورزش جسمانی پر جو مضمون لکھا جائے اس میں ورزش کو نہایت اہم جگہ دینا ضروری ہے۔ ہوا۔ غذا اور لباس کی اہمیّت سے سب آگاہ ہیں اور جو واقف بھی نہ ہوں تو بہت جلد واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص شہر میں زندگی بسر کرتا ہے جہاں مکانات قریب ہیں اور ہوا صاف نہیں ہے اس کو اس بات کا احساس رہتا ہے کہ ہوا کی گندگی اس کی صحت کو خراب کر دے گی لیکن وہ اپنے پیشہ اور دیگر ضروریات کے سبب اسی جگہ زندگی بسر کرنے پر مجبور رہتا ہے۔ یا ایک شخص ہے کہ وہ عمدہ۔ کافی اور صاف غذا نہیں کھاتا ہے کیونکہ

---

[1] Exercise

افلاس کے سبب اس میں قدرت نہیں کہ اتنی غذا ہر وقت مہیا کر سکے کہ اس کا پیٹ بھر جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ معلوم رہتا ہے کہ جس قسم کی غذا وہ کھا رہا ہے اس سے نقصان ہوگا اور اس کی صحت خراب ہو گی۔ لیکن مجبور رہتا ہے ورزش کی نسبت وہی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی نسبت اکثر غلط فہمی واقع ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ اس کے اصول پر پابند نہ ہونے سے وہی سزا ملتی ہے جو صحت کے اصول توڑنے پر ملتی ہے تاہم اس کی سزا کا اثر دیر میں محسوس ہوتا ہے اور بعض اوقات مجرم اُس کی بھی جانچ نہیں کر سکتا ہے کہ جو سزا اُسے مِل رہی ہے وہ کس جرم کے ارتکاب میں ہے۔ مختلف اشخاص کی جسمانی حالت مختلف ہوتی ہے۔ ایک ورزش کو بعض اشخاص بہت دیر تک کر سکتے ہیں اور تکان محسوس نہیں کرتے۔ اِسی کو دوسرے اشخاص تھوڑی دیر کرنے کے بعد تھک جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سب یہ تو جانتے ہیں کہ ورزش ضروری چیز ہے لیکن اس کا علم نہیں رکھتے ہیں کہ وہ کس وقت کس طریقہ پر اور کس حد تک کی جانی چاہیئے بدقسمتی سے بہت لوگ ایسے بھی موجود ہیں جنہیں ورزش سے فطرۃً نفرت ہوتی ہے اور اگر وہ ابتدا ہی سے اِس نفرت کو دُور کرنے کی تدبیر نہ کریں تو آگے چل کر انہیں بڑی بڑی تکالیف جھیلنی ہوتی ہیں۔ اِن ہی وجوہات سے اور اس وجہ سے بھی کہ آج کل انسان کو دماغی کام بہت کرنے ہوتے ہیں ورزش کو موکلان صحت میں ممتاز درجہ دیا جاتا ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسرت کس کو کہتے ہیں۔ اس کا کیا کام ہے اور وہ اس کام کو کیوں کر کرتی ہے؟

ورزش کی تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ وہ پٹھوں کی ایک حرکت ہے جو پٹھوں کو سکیڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی بدولت جسم کے تمام زندہ اعضا پوری طرح جنبش کھاتے ہیں۔

پٹھوں کی ترتیب کو دو اقسام پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ پٹھے ہیں جو اختیاری ہیں اور دوسرے وہ جو غیر اختیاری ہیں۔ اختیاری پٹھے وہ ہیں جو انسان کے مرضی کے مطیع ہیں اور جو انسان کے ہڈیوں والے حصے پر ہوتے ہیں۔ اِن کا کام یہ ہوتا ہے

کہ جس حصّہ سے وہ وابستہ ہیں اس کو حرکت دیں۔ غیر اختیاری پٹھے وہ ہیں جن پر انسان کا قابو نہیں بلکہ وہ کسی اور قوت تحریک پر کام کرتے ہیں۔ یہ جسم کے جوفوں (غاروں) میں پائے جاتے ہیں اور دورانِ خون اور ہاضمہ کو درست رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہمارا مطلب اختیاری پٹھوں سے ہے لہذا ہم ان ہی کا ذکر کریں گے۔

آگے ہم نے بیان کیا ہے کہ کسرت سے مراد پٹھوں کی حرکت ہے لیکن یہ حرکت اس قدر زور کی ہونی چاہیے کہ جتنے پٹھوں سے کام لیا جاتا ہے وہ سب سکڑ جائیں۔

ہمارے جسم کا ڈھانچہ مختلف ذروں سے بنا ہوا ہے اور ہر ایک ذرہ پیدا ہوتا ہے زندہ رہتا ہے اور پھر مر بھی جاتا ہے ہر ذرہ ایک معینہ مدت تک اپنی قوت قائم رکھتا ہے اور پھر اس نس سے علیحدہ کیا جاتا ہے جس کا وہ ایک حصّہ ہوتا ہے اور بے عضو ہو جانے کے بعد اجابت کے ذریعہ جسم سے باہر نکل جاتا ہے اور یہ سب عمل جسمانی حرکت پر منحصر ہوتا ہے۔

جب یہ بتایا جا چکا کہ جسم میں جو ذرے ہوتے ہیں وہ اس طرح جسم کی حرکت سے باہر پھینک دئے جاتے ہیں تو یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا کہ ان ذروں کے بجائے دوسرے ذرے کس طرح پیدا کئے جاتے ہیں وہ نظام جس کے ذریعہ جسم کو غذا پہنچتی ہے اور جس کے عضو اس غذا کو خون میں تبدیل کرتے ہیں وہی ان مردہ ذروں کے عوض زندہ ذرے بھی پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح انسان اپنی پوری قوت کو پہنچتا جاتا ہے بہ نسبت مردہ ذروں کے تازہ ذروں کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے اور جسم میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔

پس ورزش نہ صرف خراب ذروں کو برباد کرنے کا اہم ذریعہ ہے بلکہ تازہ ذروں کو پیدا کرنے والا کارکن ہے کیوں کہ دوراں خون کی رفتار بڑھاتی ہے جس کی بدولت تمام جسم کو غذا ملتی ہے۔

ورزش نہ صرف پٹھوں کو حرکت دیتی ہے بلکہ اس میں اور ایک صفت ہے

جس کو قوت برداشت کہہ سکتے ہیں۔ انسان دنیا میں محنت مشقت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ بہت ساری چیزیں وہ اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے اور اس کے لئے وہ اپنے اختیاری پٹھوں کو کام میں لاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو اپنی تیار کردہ چیزوں کے وزن کو اٹھانے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا ورزش کے ذریعہ یہ قوت ترقی پاسکتی ہے۔

ورزش کا اصلی تعلق جو اختیاری پٹھوں سے ہے وہ تو معلوم ہو چکا لیکن حقیقی ورزش کا یہ بھی ایک مقصد ہے کہ پٹھوں کی جو حرکت ہو وہ اس قدر زور کی ہو کہ تنفس میں تیزی پیدا ہو یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ غیر اختیاری پٹھے جو جسم میں خون دوڑاتے ہیں ان کے کام میں تیزی پیدا کرے۔ ورزش کے وقت تنفس بہت بڑھ جاتا ہے۔ ہر سانس کے ساتھ خراب مادہ جو خون میں ہوتا ہے کاربانک ایسڈ[2] کی صورت میں خارج ہوتا ہے اور اس کے بجائے آکسیجن (Oxygen) جو ہوا میں ہوتا ہے جسم میں لیا جاتا ہے۔ پس ورزش خراب ذروں[3] کو تباہ کرتی ہے اور ان اجزا کو مارتی ہے جن پر اس کا اثر چل سکتا ہے۔ خراب ذروں کو جسم کے باہر کرتی ہے اور ان کی جگہ نئے اور تازہ ذرے پیدا کرتی ہے۔ وہ اختیاری پٹھوں کی طاقت کو بڑھاتی ہے غیر اختیاری پٹھوں کی قوت کار میں اضافہ کرتی ہے اور تمام جسم کی صحت اور طاقت کو دوران خون کے بڑھانے سے درست رکھتی ہے۔

سب سے پہلے جو مواد تعلیم جسمانی کی نسبت ہمیں ملتا ہے وہ ان ورزشوں سے ملتا ہے جن کو یونانیوں اور رومیوں نے اختراع کیا تھا۔ ان کا طریقہ اُن نتائج پر منحصر ہے جن پر انہوں نے غور و خوض کیا۔ اُن کا مقصد ایسے طریقے کے اختراع سے تھا۔ جو انفرادی قوت کو بڑھائے انفرادی جسمانی خوبی پیدا کرے شخصی جرأت کو ترقی دے جس میں شخصی کوشش و زور کی انتہائی ضرورت ہو اور جس کے ذریعہ شخصی شہرت حاصل ہو۔

---

۱ Resistence ۲ Carbonic Acid ۳ Tissues

اسی سبب سے اس زمانے میں کشتی۔ پیدل کی دَوڑ اور سواری یہ چیزیں نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس تعلیم کا عین مقصد یہ تھا کہ یونان اور رومہ کے بچے عہد طفلی ہی سے جنگ کے لئے تیار کئے جائیں۔ دوسرے مقاصد کی جانب اُنہوں نے غور ہی نہیں کیا۔

یہ ضروری ہے کہ موجودہ زمانہ کی طرح اس زمانے میں بھی ایسے اشخاص موجود ہوں گے جو فطرتی امراض کے سبب یا کسی حادثہ کے سبب بعض جسمانی نقائص میں مبتلا ہوں گے ایسے اشخاص کے لئے اُنہوں نے کوئی طریقہ ایجاد نہیں کیا بلکہ انہیں از کار رفتہ سمجھ کر اپنی حالت پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے صرف ایسے کھیل ایجاد کئے جو ہونہار بہادر اور چست و چالاک نوجوانوں اور بچوں کے لئے موزوں تھے۔

لیکن یہ انصاف سے بعید ہے کہ توانا اور چالاک بچے ہی کسی ورزش سے فائدہ اُٹھائیں اور ناتواں و بیمار اس نعمت سے محروم رہیں۔ لہٰذا زمانہ حال میں جو ورزشیں ایجاد کی گئی ہیں اُن کا مقصد یہ ہے کہ ہر کوئی اُن سے بہرہ مند ہو اور خاص کر ایسے اشخاص جو ناتواں ہوں اور جن میں کوئی نقص ہو کیونکہ ایسے ہی لوگ مستحق بھی ہوتے ہیں جس طرح زمانہ گزشتہ میں تندرست اور توانا اشخاص کی ضرورت اس غرض سے محسوس ہوتی تھی کہ جنگ کے موقعہ پر یہ لوگ کام آسکیں اسی طرح آج کل زندگی کی جدوجہد کے لئے تندرستی لازمی ہے۔ روزی کمانے کے لئے دماغی محنت بجد کرنی پڑتی ہے اور حافظہ پر بار ڈالنا ہوتا ہے۔ اگر انسان تندرست نہ ہو تو اس محنت اور بار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ابتدا سے انتہا تک آج کل روزی کمانے اور پیٹ پالنے کے لئے مقابلے کرنے پڑتے ہیں اور دماغ پاشی کرنی ہوتی ہے اگر اس دماغی محنت کے ساتھ جسمانی ورزش نہ کی جائے اور کچھ وقفہ کے لئے دماغ کو آرام نہ دیا جائے تو انسان چند ہی سال میں اِس بار سے جاں بحق ہو جاتا ہے اور اگر زندہ بھی رہا تو اُس کی زندگی بے سود ہوتی ہے۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ملک میں ایسے افراد پیدا کریں جن کی صحت درست ہو تاکہ وہ اپنے مفوضہ کاموں کو بخوبی انجام دیں اور

ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہوں۔

دیکھنا یہ چاہیئے کہ جب زندگی کی جد وجہد کے لئے تندرستی ضروری ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ جسمانی ورزش کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ لوگ دماغی تعلیم کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ جتنا بھی وقت ملتا ہے وہ اسی میں صرف کیا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنا تھوڑا سا وقت ورزش و کھیل میں صرف کرتا ہے۔ تو وہ ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تندرست و توانا جسم میں پرزور اور روشن دماغ بھی پیدا ہو؟ ضرور ممکن ہے۔ سائنس اور تجربہ نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جسم اور دماغ میں بہت بڑا تعلق ہی نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ہیں۔ دماغ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ جسم بھی ترقی نہ کرے اور اگر کسی شخص نے اعلیٰ دماغ فطرتی طور پر پایا ہے تو وہ اس سے ہرگز بہرہ مند نہیں ہو سکتا اگر اس کی صحت درست نہ ہو۔ اسی طرح جسم بھی اسی وقت عمدہ حالت میں رہ سکتا ہے جب کہ انسان ورزش کے ساتھ دماغی کام بھی انجام دیا کرتا ہو۔ جس طرح جسم کے اعضا اگر ان سے کام نہ لیا جائے کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں اسی طرح اگر دماغ سے بھی ایک مدت تک کام نہ لیا جائے تو وہ بیکار ہو جاتا ہے۔

اگر والدین سے یہ سوال کیا جائے کہ بچوں کو تعلیم دینے سے ان کا کیا مقصد ہے تو یہی جواب ملے گا کہ بچے اعلیٰ اور عمدہ تعلیم پائیں۔ اگر ان کی یہی مراد ہے تو ان کو سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کے لڑکے کا جسم تندرست و توانا رہے کیوں کہ جسم کے ساتھ بچے کا دماغ بھی ترقی پائے گا اور اس قابل بن جائے گا کہ اس پر جو بار عائد ہو اس کا متحمل ہو سکے۔ یہ خیال غلط ہے کہ صرف ان ہی اشخاص کو ورزش سیکھنا چاہیئے جو فوجی پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہوں کیوں کہ ان دنوں ایک ڈاکٹر یا ایک بیرسٹر کو بھی بعض اوقات اتنی ہی جسمانی محنت کرنی پڑتی ہے جتنی کہ ایک سپاہی کو اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہونہار بیرسٹر اور ڈاکٹر کو بعد میں پچھتانا پڑا ہے کہ کاش انہوں نے بچپن میں ورزش کی ہوتی تو اپنے پیشے کو بہتر انجام دے سکتے۔

بارہا تجربہ ہوا ہے کہ والدین اپنی اولاد کی دماغی قوت کو قبل از وقت ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور بچّوں کو مجبور کرتے ہیں کہ ان کو جو کچھ بھی وقت جسمانی ترقی کے لئے ملتا ہے اس کو دماغی تعلیم میں صرف کریں۔ ان کی یہ کوشش کہ بچّوں کی دماغی قابلیت قبل از وقت ترقی کرے بچّوں کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے کیوں کہ آئندہ چل کر بچّوں کا دماغ زیادہ بار کے سبب نہ صرف کاہل ہو جاتا ہے بلکہ ان میں خودستائی اور شہرت پسندی جیسی بُری عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ بچّوں کو دماغی قابلیت حاصل کرنے کی ترغیب نہ دی جائے بلکہ یہ مقصد ہے کہ والدین کو چاہیئے کہ دماغی اور جسمانی تعلیم کو جدا نہ سمجھیں اور دونوں کو برابر اہمیت دیں کیوں کہ ان دونوں تعلیم کا انحصار ایک دوسرے پر ہے۔ (باقی دارد)

تعلیم مُطالعۂ قدرت

(۲)

یہ ایک عمل تجسّس ہے جس کی وساطت سے مناظر قدرت اور دیگر قدرتی اشیاء کی پوری پوری حقیقت اور ماہیت نفع نقصان اور طریقۂ استعمال معلوم ہوتا ہے اس کے جاننے کے لئے آلات یا وسائل کی ضرورت ہے۔

پہلے وسائل جو ہم کو حاصل ہیں وہ جسمانی اوزار ہیں جو جسم انسانی پر پانچ مختلف اعضاء میں صورت پذیر ہیں۔

قدرت نے اِن حواس ظاہری کے علاوہ حواس باطنی بھی عنایت کئے ہیں جنہیں حس مشترک۔ خیال۔ حافظہ۔ واہمہ۔ متصرفہ۔ کہا جاتا ہے یہ قوئ دراصل کسی گزشتہ واقعہ کو پیش نظر کرنے یا مناسب تدابیر اختیار کرنے کے کام آتے ہیں۔ مگر حصول علم کا زیادہ حصّہ حواس ظاہری کی باقاعدہ تربیت پر موقوف ہے کیوں کہ جب حواس ظاہری کمزور ہوتے ہیں یا زیادہ تربیت یافتہ نہیں ہوتے تو لامحالہ حواس باطنی بھی ضعیف ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں مختلف العقل آدمی نظر آتے ہیں۔

اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک آدمی ہے جس نے ولادت کے زمانہ سے گاؤں میں ہی نشوونما پائی اور دوسرے گاؤں کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی بلکہ بدقسمتی سے اپنے گاؤں میں ہی رہ کر تعلیم و تربیت پاتا رہا۔

ایک دوسرا شخص ہے جس نے بچپن کا زمانہ ایک گاؤں میں لڑکپن دوسرے گاؤں میں جوانی ایک شہر میں گزاری اگر دونوں سے کسی چیز کی حقیقت و ماہیت دریافت کی جائے تو ظاہر ہے کہ دوسرے آدمی کی رائے پہلے سے زیادہ آگاہی اور تجربہ پر ہوگی اس کا سبب یہی ہے کہ پہلے آدمی کے حواس ظاہری نے اس قدر چیزوں کا احساس کرنے نہیں پایا جس قدر دوسرے کے حواس ظاہری نے چیزوں کی حقیقت کا ادراک کیا ہے۔ اس لئے پہلا جو کلیہ بناتا یا جن نتائج کا استخراج کرتا ہے وہ ناواقفیت پر دال ہوتے ہیں برخلاف اس کے دوسرے کی رائے بہت صائب ہوتی ہے۔ اس کے قطع نظر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مقدمات مشاہدات پر قائم کئے جاتے ہیں اور نتائج کا استنباط حواس باطنی پر موقوف ہے جب تک حواس ظاہری کی باقاعدہ تربیت نہ کی جائے نتائج کے استنباط کی اُمید رکھنا جس کا تمام تر تعلق حواس باطنی سے ہو سعیٔ لاحاصل ہے۔

ماہرین نفسیات نے حواس ظاہری کی باقاعدہ تربیت کا بہترین ذریعہ تعلیم مطالعہ قدرت کو گردانا ہے۔ اگرچہ مطالعہ قدرت کسی خاص مضمون کی تعلیم نہیں ہے پھر بھی دوسرے مضامین کے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ایک سنگ بنیاد ہے۔ بہت سے ماہرین سائنس اس پر متفق ہیں کہ (۱۵) سال سے کم عمر طلبہ کو سائنس کے کسی خاص شعبہ میں تعلیم دینے سے کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی اُن کا خیال ہے کہ "سائنس کے عوض مطالعہ قدرت کی تعلیم دیجائے چوں کہ اس مضمون کی تعلیم سے بچوں میں صحیح مشاہدہ کرنے۔ بیان کرنے۔ اور نتائج اخذ کرنے کی عادت پڑجاتی ہے اور آئندہ سائنس کے کسی خاص شعبہ میں تعلیم کے موزون بن جاتے ہیں"

بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں اس مضمون کی تعلیم کتاب کے ذریعہ اسباقِ

اشیار کے نام سے دیجاتی ہے جو مطالعہ قدرت سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔ کیوں کہ اسباق اشیاء میں دوسروں کے تجربات ومشاہدات بیان کئے جاتے ہیں۔

اور مطالعہ قدرت کی تعلیم میں بچے بغیر کسی کتاب کے اصل شئے کی نسبت اپنی ذاتی سعی اور تحقیقات سے نتائج اخذ کرتے ہیں اس ذریعہ سے بچوں میں اپنے گردونواح سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ بغور مشاہدہ کرنے کی عادت کو ترغیب ہوتی ہے۔ قدرتی اشیاء کا اپنی ذات سے تعلق معلوم کرتے ہیں۔ مل جل کر صفائی سے کام کرنے کی عادت پڑجاتی ہے۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا سیکھتے ہیں۔ ذاتی سعی (جو ہمارے بچوں میں مفقود ہے) ترقی پاتی ہے۔ شروع ہی سے ہوشیاری کی عادت اور صحیح استدلال کی قوت نشوونما پاتی ہے۔ اپنے ملک کے ادب کو سمجھنے لگتے ہیں۔ اظہارِ خیال میں سہولت اور ادائی بیان میں صحت پیش نظر ہوتی ہے۔

غرض بچہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ آج تک میں نے جو کچھ سیکھا وہ میری اپنی کوشش کا ثمرہ ہے۔ بچوں میں ایسے خیال کی پیدائش نفسی نقطۂ نظر سے جو قدر وقیمت رکھتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس لئے مشتے نمونہ از خروارے، طریقۂ تعلیم مطالعہ قدرت کے چند وسائل حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں۔

طریقۂ تعلیم جو جماعت میں استعمال کیا جائے عموماً ہر ایک سبق کے شروع میں کچھ نہ کچھ تمہید ہوتی ہے اس اصول کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ مطالعہ قدرت کے سبق کو کس طرح شروع کیا جائے:۔

(۱) مطالعہ قدرت کے سبق میں مصنوعی تمہید کی ضرورت نہیں جس چیز پر سبق پڑھانا ہو اصل شئے طلبہ کے سامنے پیش کی جائے اور بچوں کو مشاہدہ کرنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ کافی وقت دیا جائے۔

(۲) سبق ہمیشہ ایسی چیزوں سے شروع کیا جائے جو بچوں کی عمر واستعداد کے موزوں اور اُن کے گرد وپیش میں آسانی سے فراہم ہونے والی ہوں۔

(۳) جس چیز پر سبق پڑھانا ہو بچوں کو دکھلائے اور صاف طور سے کہدے

کہ مشاہدہ کرنے میں اُس چیز کو کچھ نقصان نہ پہنچائیں۔
(۴) جب ابتدائی مشاہدے سے بچوں میں دلچسپی پیدا ہو جائے تو بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور چند موزوں سوالات کے ذریعہ مشاہدہ کی ہوئی باتیں دریافت کرے اور جن باتوں سے وہ غافل رہے ہیں اُن کے مشاہدے کی طرف رہنمائی کرے
(۵) سادہ اور آسان سوالات بلحاظ (جانور) اُن کے عادات اُن کے نشو ونما پانے کے طریقہ اُن کے اعضا اور کام وغیرہ پر ہونے چاہئیں۔
(۶) ہر بات پر کافی مباحثہ کے بعد زیادہ باتیں بچوں ہی سے نکلوائی جائیں۔
(۷) اختتام سبق پر یہ دیکھنے کے لئے کہ استاد کی تعلیم سے طلباء کہاں تک مستفید ہوئے ہیں سبق کو دہرانا ضروری ہے۔
(۸) خلاصۂ سبق تختہ سیاہ پر لکھنا ضروری نہیں بلحاظ ضرورت اُس کا استعمال کیا جاسکتا ہے مگر خلاصۂ تختہ سیاہ طلبہ کی مدد سے تیار کریں البتہ لفظی غلطیاں مدرس درست کردے جہاں تک ممکن ہو اصطلاحات نہ استعمال کی جائیں۔
(۹) اشیاء کے خاکے اور ماڈل بنوائے جائیں۔
(۱۰) تصویر کھنچوائی جائے مگر مشاہدہ کے بعد۔
(۱۱) جس چیز کا مشاہدہ کرنا ہے اگر وہ چھوٹی یا بہت بڑی ہو تو اُس کی ایسی تصویر یا ماڈل پیش کیا جائے جس میں وہ باتیں نمایاں ہوں جن کا بتلانا مطلوب ہے۔
(۱۲) لڑکوں کو موقعہ دیا جائے کہ سوالات پوچھکر اپنی غلطیاں درست کرلیں لیکن اس قسم کی اجازت اثنائے سبق میں نہ دی جائے ورنہ سبق کا تسلسل ٹوٹ جائے گا البتہ سبق کے اختتام پر یا سبق کے بعض خاص مواقع پر اُن کے فطری ولولہ کی تشفی کے لئے سوالات کا موقع دیا جائے کیوں کہ ایسے سوالات سے بچوں کے دلی جوش کا پتہ چلتا ہے اور اُستاد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بچوں کے ذہن کی کہاں تک پہونچ ہے۔

خاکہ۔ تصویر۔ ماڈل کا استعمال۔ (۱) اگر بچوں میں نمونہ تقسیم کردیا گیا ہو یا اُن کے سامنے بڑی شئے پیش ہو تو خاکہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

(۲) ایسی تصاویر یا خاکے بچّوں کے سامنے پیش نہ کئے جائیں جن میں صرف اُن چیزوں کا مشاہدہ ہو سکے جو اصل شئے سے بھی ممکن ہے۔

(۳) بچّوں کو اصل شئے کے کسی خاص حصّہ پر متوجہ کرنے کے لئے خاکہ کی ضرورت ہوتی ہے یہی کیفیت ماڈل کی ہے۔

(۴) خاکہ۔ تصویر۔ ماڈل کا استعمال حتی الامکان بہت کم ہو اُن کا استعمال صرف اُس وقت جائز ہو سکتا ہے جب کہ اصل شئے بچّوں کے سامنے پیش نہ کی جا سکے۔

(۵) یہ چیزیں (خاکہ۔ تصویر۔ ماڈل) صرف اس وقت تک جماعت میں موجود رہیں جب تک کہ اُن کا مشاہدہ ہوتا رہے بعد ازاں فوراً ہٹا لینی چاہیئے۔

استعمال تختۂ سیاہ | تختۂ سیاہ کا استعمال یا تو مدرس کی مدد کے لئے ہو سکتا ہے یا بچّوں کے لئے۔

(۱) اگر اس کا مقصد مدرس کی رہنمائی ہے تو سبق کے خاص خاص عنوان تختۂ سیاہ پر لکھنے میں مضائقہ نہیں مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ مدرس خود اپنا سبق ایسا تیار کرے کہ تختۂ سیاہ کے مدد کی ضرورت نہ پڑے۔

(۲) اگر اس کی ضرورت بچّوں کے لئے متصور ہو تو تختۂ سیاہ کی ضرورت بعض خاص حالتوں کے سوا زیادہ ضروری نہیں اس لئے کہ چھوٹی جماعتوں میں مطالعہ قدرت کے سبق میں مثل زبان دانی کے اسباق کے مشکل الفاظ کا استعمال ناجائز اور اصطلاحات کا بتلانا ناموزوں ہے صرف بڑی جماعتوں میں اختتام سبق پر بچّوں کی مدد سے خلاصہ تختۂ سیاہ لکھا جا سکتا ہے۔

اعادہ | عام دستور ہے کہ ہر حصّہ سبق پر اعادہ کی ضرورت ہے اور اس پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ مدرسین کے اسباق جب تک اُن میں اعادہ کی صراحت نہ ہو نامکمل سمجھے جاتے ہیں لیکن مطالعہ قدرت کے اسباق میں سوائے اختتام سبق کے اعادہ اس قدر ضروری نہیں کیونکہ جن اسباق میں استاد بچّوں کے معلومات کی غرض سے خود بیان کرتا ہے اُن میں اعادہ کی ضرورت ہے لیکن مطالعہ قدرت کا منشاء معلومات میں اضافہ کرنا

نہیں بلکہ بغور مشاہدہ کی عادت کو ترغیب دینا اور اُن کے تحقیقاتی نتائج میں اُن کی مدد کرنا ہے اس لئے اثنائے سبق میں صرف مشاہدات اور تحقیقات کئے جائیں اختتام پر اعادہ کیا جاسکتا ہے۔

مطالعہ قدرت کا دیگر مضامین سے ارتباط

پڑھنا (زباندانی) مطالعہ قدرت کا ایک مقصد بچّوں کی قوت بیان کو تربیت دینا ہے۔ ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس مضمون سے بچوں کی قوت بیان کی تربیت کس طرح کرسکتے ہیں۔

(۱) جب بچے مشاہدہ کرتے ہیں تو اُنہیں اپنے مشاہدہ کو بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جن سے زبان دانی اور پڑھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

(۲) وہ زبان دانی کی کتابیں جن میں مطالعہ قدرت سے مواد فراہم ہو زباندانی کی موئد ہیں۔

(۳) مشہور نیچرلسٹ (Naturalist) کی کتابیں دیکھنا۔

(۴) اُستاد کا اپنے تحقیقات اور تجربات و مشاہدات کا طلبہ سے بیان کرنا۔

لکھنا مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کے رنگ، شکل، خاصیت کی بابت جو کچھ بچّوں نے نتائج کا استخراج کیا ہے مضمون نگاری سے ارتباط پیدا کرایا جاسکتا ہے۔

حساب اس تعلق کی تمام تر ذمہ داری استاد کی ہے اگر استاد اپنی دانشمندی سے پھولوں کے مشاہدہ کے وقت بچّوں سے یہ دریافت کرے کہ مرکب پتیوں میں کتنے برگچہ ہیں۔ ان کی ترتیب شاخوں پر کیا ہے۔ ہر ایک پھول میں کتنی پنکھڑیاں اور سوئیاں ہیں نیز مدرسہ کے باغ میں بیج گن کر بوئے جائیں اور اُن کے اوگنے کے زمانہ سے بڑھنے ضائع ہونے پھلنے پھولنے کی کیفیت کا پیمائشی چارٹ تیار کرایا جائے اور ترکاریوں اور پھولوں کو تول کر وزن کا تصور دلایا جاسکتا ہے۔

جغرافیہ دراصل مطالعہ قدرت کی ایک شاخ ہے ابتدائی جماعتوں میں تو مطالعہ قدرت اور جغرافیہ کے مضامین میں امتیاز کرنا نہایت مشکل ہے اس کو دوسرے الفاظ

میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مطالعہ قدرت اور جغرافیہ کے مضامین ایک ہی ہیں یہ اُستاد کا فرض ہے کہ ایسے قدرتی مناظر جنگلی جانور اور درختوں کی نسبت جن کو بچوں نے کبھی دیکھا ہے اور نہ دیکھنے کا امکان ہے تصاویر کے ذریعہ جغرافیہ کے ضمن میں پڑھائے۔

مطالعہ قدرت کے مضامین حسب سہولت نباتات۔ حیوانات۔ جمادات مناظر قدرت سے منتخب کئے جا سکتے ہیں البتہ انتخاب مضمون کی صورت میں جغرافیہ کے مدرس سے مشورت ضروری ہے اگر جغرافیہ کا مدرس مناظر قدرت کا مشاہدہ جغرافیہ کے ضمن میں کرائے تو نباتات حیوانات کے متعلق مشاہدہ مطالعہ قدرت کے ضمن میں کیا جائے۔

ڈرائنگ | مطالعہ قدرت اور ڈرائنگ کا کام ساتھ ساتھ ہونا چاہئیے۔

(۲) یہ لازمی نہیں کہ ایک ہی گھنٹہ میں دونوں کام ہوں۔

(۳) ڈرائنگ کا کام مطالعہ قدرت کے پہلے یا بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۴) ڈرائنگ کا کام پہلے کیا جائے تو مطالعہ قدرت کے سبق میں تیزی ہوگی کیونکہ مشاہدہ کا بہت کچھ حصہ ڈرائنگ کرتے وقت ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۵) ڈرائنگ کا کام مطالعہ قدرت کے بعد ہو تو ڈرائنگ زیادہ صحیح ہوگی اور یہی طریقہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

مطالعۂ قدرت کی تعلیم کو امداد

عجائب گھر | بعض نمونہ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ دستیاب نہیں ہو سکتے اگر وہ عجائب گھر میں موجود ہوں تو بوقت ضرورت مطالعہ قدرت کے اسباق اُن پر دئے جا سکتے ہیں۔

عجائب گھر کے لئے چیزوں کا جمع رکھنا | چھوٹے بچوں کا طبعی میلان ہوتا ہے کہ وہ نئی چیزوں کو جمع کریں اس طبعی میلان کی نشو ونما کے لئے مدرس کو چاہئیے کہ بچوں کے ذریعہ لائی ہوئی چیزوں میں سے کارآمد چیزوں کا انتخاب کرے پھر بچوں سے اُن چیزوں کو باقاعدہ رکھوائے اُس کے بعد اُن کی ترتیب خود مدرس کرے۔

سیر کرنا | عمدہ تعلیم کے لئے دوراں سیر کی تعداد گاؤں میں مہینے میں ایک دو دفعہ اور شہر کے مدارس میں سال میں چھ مرتبہ حسب ذیل موقعوں پر مفید ہے۔

(۱) ٹھیک اُس وقت جب کہ موسم برسات کا آغاز ہوتا ہے تاکہ آس پاس کی زمین۔ پودے۔ جانور۔ اور کرۂ باد وغیرہ کا مشاہدہ کیا جائے جو سب پانی کا انتظار کر رہے ہیں۔

(۲) عین برسات میں جب کہ مینھ کی جھڑیاں لگی ہوں تاکہ بارش کا اثر زمین۔ پودوں، درختوں پر ظاہر ہو سکے۔

(۳) فصل کاٹنے کے ذرا پہلے تاکہ غلّہ جب خوشہ میں ہوتا ہے تو اُس کی کیا حالت ہوتی ہے اور کس طرح چڑیاں۔ کیڑے۔ مکوڑے زراعت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۴) آغاز موسم سرما یا آخر میں تاکہ درختوں کھیتوں چشموں وغیرہ کا مشاہدہ کیا جاسکے خاص طور پر موسم سرما کی ترکاریوں کی دیکھ بھال۔

(۵) موسم بہار کے شروع میں تاکہ پودوں جانوروں اور قدرت کی ہر شکل میں نئے آثار زندگی مشاہدہ کئے جاسکیں۔

(۶) موسم گرما میں تاکہ آب و ہوا کی خاص حالت معلوم ہو جائے (ایسے دورہ تعطیلات میں کئے جائیں تاکہ کم از کم دو چار گھنٹہ صرف کئے جاسکیں)

سیر کا طریقہ | ایک دن پہلے اُستاد جماعت میں کہدے کہ فلاں چیز کے مشاہدے کے لئے تم کو فلاں جگہ چلنا ہوگا اُس کو صاف طور سے کہنا ہوگا کہ اُس چیز کے خاص حصّہ کو بغور دیکھنا ہے گو مدرس اور باتیں بتائے مگر اصل شئے کے مشاہدہ کا منشا جس کے لئے مدرس اور بچے جارہے ہیں فوت نہ ہونے دے جہاں تک ممکن ہو طلبہ کے شوق مشاہدہ کو اُبھارے۔

(۲) دورہ پر چلنے کے پہلے ہر لڑکے کے پاس ایک پنسل اور کاپی ہونی چاہیئے تاکہ جو کچھ وہ دیکھیں اُس کو درج کرتے جائیں۔

(۳) مدرس کے پاس ایک چھوٹا صندوقچہ بھی رہے جس میں مختلف چیزوں کے نمونہ اِکٹھا کئے جائیں جس کا باقاعدہ مشاہدہ بعد کو ہوگا۔

تعلیم مطالعہ قدرت کی سہ منزلہ تقسیم

پہلی منزل۔ ۵ سے ۸ برس کے طلبہ کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔
دوسری منزل۔ ۸ سے ۱۱ " " " " "
تیسری منزل ۱۱ سے اوپر " " " " "

پہلی منزل والے طلبہ کا مختصر نصاب۔ اس منزل میں طلبہ کی عمر سات برس سے کم ہوتی ہے اور تجسس کا طبعی میلان زیادہ ظہور میں آتا ہے لہٰذا طلبہ کی اس عمر میں جانوروں کی دیکھ بھال اور کرداریت میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اس لئے انہیں مطالعہ قدرت کی تعلیم کھیل کود میں دی جائے مثلاً

باغ کی دیکھ بھال۔ زندہ جانوروں کا مشاہدہ اور اُن کے حرکات وغیرہ۔ نقشہ کشی (اور بہت سے کھیل ہو سکتے ہیں جو مُدرس موقع اور وقت کی مناسبت سے خود طلبہ کے لئے فراہم کر سکتا ہے بشرطیکہ مضمون سے دلی لگاؤ ہو)

دوسری منزل والے طلبہ کا مختصر نصاب تعلیم اِن بچوں کی تعلیم میں اِس بات کا خیال رہے کہ طرز اختصار سادہ اور جلد ہو۔

انڈے دینے والے جانور۔ مویشی۔ کیڑے۔ مکوڑے۔ پودے۔ پھول۔ ترکاریاں۔ بیج وغیرہ۔

تیسری منزل والے طلبہ کا مختصر نصاب تعلیم بچے دینے والے جانور۔ درخت۔ موسمی میوہ جات۔ نبات الصحرا نبات الماء۔ ایک دالیہ۔ دو دالیہ بیجوں کا امتحان۔ مٹی کی ترکیب مٹی کے اقسام۔ اقسام کے پھول۔ پتوں کے اقسام۔ نظام الاوراق۔ نظام العروق۔ بیج بونے کے طریقہ۔ جڑوں کا دباؤ۔ پودوں کا رطوبت خارج کرنا۔ قطب نما کا استعمال۔ جھیجھر بنگی بادل۔ بارش وغیرہ۔

محمد اکبر
مدرس مدرسہ تحتانیہ کمان ساجدہ بیگم

جغرافیہ اور اُسکا طریقہ تعلیم

از مولوی غلام دستگیر صاحب فاروقی بی۔اے

(گذشتہ سے پیوستہ)

طریقہ تعلیم جماعت سوم | جماعت سوم میں جس نصاب جغرافیہ کی سفارش کی گئی ہے اُس میں زمین کی گولائی، اُس کی جسامت، براعظم و بحر اعظم کے نام اور گھر کا جغرافیہ داخل ہیں۔

زمین کی گولائی کا تصور دلانے کے بہت سے طریقے مروجہ جغرافیہ کی کتابوں میں درج ہیں یہاں اُس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ کتابوں میں تو بہت سے طریقے دئے گئے ہیں مگر مدرس کو چاہیے کہ اُن میں سے صرف وہ مثالیں لے، جو طلبہ کی عمر اور استعداد سے بڑھ کر نہ ہوں۔

جماعت سوم کے طلبہ کوئی بڑی عمر کے نہیں ہوتے اور اس عمر میں اُنہیں کسی چیز کی لمبائی اور چوڑائی کے بڑے بڑے فاصلوں کو پڑھنے اور یاد کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی لہذا زمین کی جسامت یعنے اُس کی لمبائی اور چوڑائی کو دلچسپ طریقہ سے ذہن نشین کرنے کے لئے کسی سیاح کے سفر کا ذکر کرنا سودبخش ہوگا۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک سیاح نے ایک ریل گاڑی میں جس کی رفتار فی گھنٹہ ۴۰ میل تھی زمین کے اطراف (۶۲۵) گھنٹوں میں سفر کیا۔ اب تم خود بتا سکتے ہو کہ اس کی لمبائی کیا ہے اور اگر چاہو تو تم بھی ریل اور دیگر ذرائع آمد و رفت کے ذریعہ دنیا کے اطراف سفر کر سکتے ہو۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض سیاحوں نے ہوائی جہاز۔ موٹر حتیٰ کہ سیکل پر بھی زمین کے اطراف سفر کیا ہے۔ لوگ ان کی اس ہمت اور بہادری کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

غالباً تجربہ کار مدرسین اس حقیقت سے ناواقف نہوں گے کہ براعظم و بحر اعظم کے محض نام کا ذکر طلبہ کی توجہ کا جاذب نہیں ہوتا۔ اس لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ نفسیاتی اُصول کی بناء پر پہلے۔ براعظم یا بحر اعظم کی چند خصوصیات کا ذکر ہو اور بعد میں نام

بتایا جائے۔ یہ نام بتانا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ انگوٹھی میں نگ جڑنا۔ مثلاً براعظم ایشیا کا نام بتانا مقصود ہو تو پہلے یہ کہا جائے کہ ہماری ریاست ہندوستان میں ہے اور یہ ایک ایسے براعظم میں ہے جو تمام براعظموں میں بڑا ہے۔ اس میں دنیا کے اونچے اونچے پہاڑ۔ بڑے بڑے میدان اور دریا کھارے اور میٹھے پانی کی بڑی بڑی جھیلیں ہیں۔ اس ایک براعظم میں جتنے لوگ آباد ہیں اتنے لوگ دوسرے دو براعظموں میں نہیں پائے جاتے۔ اس کے بعد نام بتایا جائے۔ افریقہ کے متعلق طلبہ سے کہا جا سکتا ہے کہ دیکھو ایک دوسرا براعظم ہے جو بڑائی کے لحاظ سے براعظم ایشیا کے بعد ہے۔ غالباً تم نے حبشیوں کو ضرور دیکھا ہوگا جو اسی براعظم میں پائے جاتے ہیں۔ اس براعظم میں ایک جانور ہوتا ہے جس کا نام تو تم نے سنا ہوگا اور تم میں سے بعض نے اس کو دیکھا بھی ہوگا۔ اس کو شتر مرغ کہتے ہیں۔ یہاں اس کے غول کے غول پائے جاتے ہیں۔ اس جانور کے پر بڑے ہی خوبصورت ہوتے ہیں چنانچہ ایک سیر پر کی قیمت دو ہزار روپیے ہوتی ہے۔ دوسرے براعظموں کی بھی چند دلچسپ خصوصیات بیان کر کے ان کا نام بتایا جائے۔

بحر اعظموں کے نام بتانے کے وقت بھی یہی طریقہ ملحوظ رکھا جائے مثال کے طور پر ہم صرف ایک کی خصوصیات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے نقشہ میں بحر اوقیانوس بتا کر یہ کہے کہ گو یہ بحر اعظم سب سے بڑا نہیں ہے مگر اس میں جہاز اس کثرت سے چلتے ہیں کہ دنیا کے کسی دوسرے بحر میں اتنے جہاز نہیں چلتے۔ انہیں جہازوں کے ذریعے موٹریں سیکلیں۔ کتابیں قسم قسم کا سامان قمیص اور شیروانی کے خوبصورت کپڑے ہمارے ملک میں آتے ہیں۔ اور یہاں سے روئی اور غلہ دوسرے ملکوں کو جاتا ہے۔

اس جماعت سے گھر کا جغرافیہ شروع ہوتا ہے۔ نصاب کے متعلق ہم یہاں صرف اس قدر کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ موجودہ نصاب بلحاظ جماعت بہت زیادہ ہے

جانا چاہیئے جس میں وہ رہتے ہیں۔ چونکہ جماعت چہارم میں بھی ملک ہی کا جغرافیہ پڑھایا
جاتا ہے اس لئے باقی کے اضلاع یہاں پڑھائے جا سکتے ہیں۔
یوں تو عام طور پر جغرافیہ کی ہر بات کو عملی بنانے کی کوشش کی جائے مگر
س جماعت میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ ہونا ضروری ہے تاکہ ابتدا ہی سے طلبہ کو
گھر کے جغرافیہ سے ایک گونہ لگاؤ پیدا ہو۔ اور وہ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات کو عمدگی سے
سمجھ جائیں اس لئے کہ انہیں معلومات کی بنا پر بدیسی جغرافیہ کی عمارت تیار کی جاتی ہے
علاوہ ازیں تمام جغرافی امور اس طرح بیان کئے جائیں کہ وہ سب ایک زنجیر کی کڑیاں
معلوم ہوں جو ایک قدرتی رشتہ میں منسلک ہوں۔
غالباً تجربہ کار مدرسین اس بات سے واقف ہوں گے کہ جب کسی ملک یا براعظم
کا جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے تو حسب ذیل امور علی الترتیب بیان کئے جاتے ہیں:۔
(۱) تاریخ (۲) محل وقوع (۳) حدود اربعہ (۴) طبعی حالات جس میں پہاڑ، میدان
اور دریا وغیرہ شامل ہیں (۵) آب و ہوا (۶) پیداوار (۷) پیشے اور صنعت و حرفت (۸) تجارت
(۹) ذرائع آمد و رفت (۱۰) مشہور مقامات (۱۱) عام حالات جس میں حکومت۔ مذہب، زبان، تعلیم
تعلیم وغیرہ شامل ہیں۔ پس جیسا کہ پہلے ہم نے ذکر کیا ہے یہ تمام امور اس طرح بیان کئے
جائیں کہ مابعد واقعہ اپنے ماقبل واقعہ کا نتیجہ ہو۔ مثلاً۔ اگر کسی ملک میں بارش کی کمی ہو گی
تو نتیجتہً پیداوار بھی کم ہو گی (تاوقتیکہ دیگر مصنوعی ذرائع آبپاشی اختیار نہ کئے جائیں)
اور اس کمی بارش کا نتیجہ ضرور صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ پر پڑے گا۔ اب ہم انہیں
اصول کی روشنی میں گھر کے جغرافیہ کا مطالعہ کریں گے۔
چونکہ جغرافیۂ سلطنت حیدرآباد فی الوقت جماعت سوم، چہارم اور پنجم میں پڑھایا
جاتا ہے اس لئے ہم اس کے پڑھانے کے طریقے کو بجائے جماعت واری کے ایک
ہی جگہ لکھنا مناسب سمجھتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اس امر کے متوقع ہیں کہ حضرات مدرسین
اس طریقۂ تعلیم کو طلباء کی عمر اور جماعت کے لحاظ سے کمی و بیشی کے ساتھ استعمال

گھر کے جغرافیہ کا طریقہ تعلیم

ملک کی تاریخ | طلباء میں گھر کے جغرافیہ سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اُن کو اُن کے ملک کی نہایت مختصر تاریخ سے واقف کیا جائے اور یہ تاریخ قصہ کے پیرائے میں بتائی جائے۔ بہتر ہوگا کہ تاریخ بتانے سے پہلے ملک کے مخصوص بادشاہوں، سورماؤں، مدبروں اور عمارتوں کے نقشے اور تصاویر بتائی جائیں اور انہیں تصاویر کے متعلق اس طور پر بیان کیا جائے کہ ملک کی تاریخ کا ایک اجمالی مگر دلچسپ خاکہ طلباء کی نگاہوں کے سامنے پھر جائے۔

محل وقوع | عام طور پر نیچے کی جماعتوں میں محل وقوع کو غیر اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ملک کے اکثر جغرافی حالات کا مدار اس کے محل وقوع پر ہوتا ہے اور یہ چیز طلباء کو آگے کی جماعتوں میں تفصیل سے معلوم ہوسکتی ہے مگر ابتدائی جماعتوں میں اس کی موٹی موٹی باتوں کا بتانا ضروری ہے تاکہ اس کی اہمیت طلباء کے ذہن نشین ہو جائے۔ اس موقع پر بجائے طول البلد اور عرض البلد کے ہم نقشے کے ذریعہ سے یہ بتا سکتے ہیں کہ ہمارا ملک دکن کے وسط میں واقع ہونے سے ہم دکن کے ہر ملک میں بسہولت آ جا سکتے ہیں۔ یہ سہولت سطح مرتفع دکن کے کسی اور ملک کو حاصل نہیں ہے۔ جماعت کے وسط میں تمام طلباء سے مساوی فاصلہ پر کھڑے ہوکر ہم اس سہولت کو اور واضح کر سکتے ہیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر ہم اس موقع پر انگلستان کو دنیا کے نقشہ میں بتا کر یہ واضح کرنے کی کوشش کریں کہ منجملہ دیگر اسباب ترقی کے انگلستان کا تقریباً دنیا کے وسط میں ہونا بھی اس کی مشہورِ عالم ترقی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

حدود اربع | حدود اربع کو محض رٹا دینے سے مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے پڑھانے میں بھی دلچسپی کی چاشنی کی ضرورت ہے۔ اور وہ اس طرح حاصل ہوسکتی ہے کہ طلباء کو اولاً اچھے اور خراب پڑوس کے اثرات بتائے جائیں۔ بعد ازاں یہ

سلسلہ میں قدرتی حدود مثل گوداوری اور کرشنا اور مصنوعی حدود کے درمیان کا فرق اور اُن کے فوائد بتائے جائیں۔ دوران سبق میں مدرس تختۂ سیاہ پر ملک کے حدود کا اندراج کرے اور طلباء اپنے اپنے خاکوں میں مُدرس کا اتباع کریں۔

طبعی حالات | ہمارے ملک کے طبعی حالات میں ہم صرف پہاڑ دریا اور میدان بتا سکتے ہیں پہاڑوں اور دریاؤں کی تعلیم کو حسب ذیل طریقہ سے موثر بنایا جاسکتا ہے۔

عموماً شہر کے اور خصوصاً اضلاع کے طلباء نے اپنی بستی یا گاؤں میں دیکھا ہوگا کہ جب کبھی باؤلی وغیرہ کھودی جاتی ہے تو نیچے سے پتھر کی بڑی بڑی سلیں برآمد ہوئی ہیں۔ اُن کی اس سابقہ معلومات کی مدد سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ انسان اپنی رہائش کے لئے غیر شہر میں زمین منتخب کرتا ہے۔ جب ہمارے ملک کی رہائشی اور سکونتی زمین کی یہ حالت ہو تو اُفتادہ اور غیر سکونتی زمین کس قدر پہاڑی ہوگی۔ اس خیال کو مقامی پہاڑوں کے سلسلہ یا پہاڑون کے مشاہدہ سے اور واضح کیا جاسکتا ہے۔ بعد ازاں ملک کا طبعی نقشہ بتایا جائے جس میں پہاڑ نمایاں طور پر ظاہر کئے گئے ہوں۔ پھر مُدرس کو چاہیئے کہ تختۂ سیاہ پر ملک کا خاکہ اُتارے اور اس میں خاکی چاک سے پہاڑوں کے سلسلے کو درج کرے۔ اس وقت اس امر کا خاص خیال رکھے کہ سلسلہ پہاڑ جن جن اضلاع میں سے گذرے ان اضلاع کے نام اور اُن کے حدود تختۂ سیاہ پر ظاہر کئے جائیں تاکہ طلباء کو ایک ہی جگہ میں وہ تمام اضلاع معلوم ہو جائیں جن میں سے ایک سلسلۂ کوہ گذرتا ہے۔ طلباء سے ان اضلاع کے نام دریافت کرنے کے بجائے جن میں سے سلسلہ سیاوری پربت گذرتا ہے یہ مناسب ہے کہ ان سے یہ سلسلہ تختۂ سیاہ پر کھینچوایا جائے اور اضلاع کے نام درج کروائے جائیں۔ اس طریقہ تعلیم سے بے سمجھے رٹنے کے مذموم طریقہ کی اصلاح ہوگی۔ اور جب ایک وقت صحیح اور آسان طریقہ معلوم ہو جائے گا تو وہ ہمیشہ اسی طریقہ پر عمل رہ کر اپنے وقت اور صحت کو اور دوسرے کاموں کے لئے محفوظ رکھ سکیں گے۔

جس طریقہ کی ہم نے سطور بالا میں سفارش کی ہے وہی طریقہ دریاؤں کی تعلیم

کے وقت بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس وقت دریاؤں کے فوائد اور موجودہ زمانہ میں ہم اُن سے جو کام لے رہے ہیں اُن کا تفصیلی ذکر نہایت ضروری ہے۔ طلباء کو یہ معلوم ہے کہ ہماری کھیتی باڑی اور ہمارے باغ پانی کی وجہ سے سرسبز و شاداب ہیں۔ اب ہمارے فرائض میں یہ داخل ہے کہ ہم ان کو یہ بتائیں کہ دریاؤں سے تالابوں میں کس طرح پانی محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے کاموں میں سے عثمان ساگر اور حمایت ساگر کا ذکر کر کے طلباء کو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ان تالابوں کی وجہ سے جہاں شہر حیدرآباد ایک طرف موسیٰ ندی کی قیامت خیز طغیانیوں سے مامون ہو گیا ہے تو وہاں وہ آب نوشیدنی کی قلت کے خطرہ سے بھی محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کے سوا نظام ساگر کے عظیم الشان تالاب کا ذکر کر کے اور اس کا نقشہ بتا کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں اس تالاب سے ملک کو بے حد زراعتی اور معاشی فوائد حاصل ہوں گے۔ اسی سلسلہ میں اِن نہروں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جن سے ملکی زراعت کو ترقی ہو رہی ہے۔ اس طریقہ تعلیم سے طلباء کو ایک طرف قدرت سے محبت ہو گی جو اُن کی اس عظیم ترین ضرورت کی سربراہی کرتی ہے تو دوسری طرف اپنے بادشاہ وقت سے بھی جس نے اپنی پدرانہ شفقت سے اپنی عزیز رعایا کو اس قدرتی نعمت سے بہرہ اندوز ہونے کے کافی مواقع بہم پہنچائے ہیں۔

کم عمر بچے بارش کے ختم پر پیر پر مٹی جما کر چڑیوں کے گھونسلے بناتے ہیں۔ اور بعض بچے چکنی مٹی کے بیل وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ گھونسلے تو جلد سوکھ جاتے ہیں مگر بیل جلد نہیں سوکھتے۔ ان کی ذاتی معلومات اور مشاہدہ کی بنا پر بذریعۂ نقشہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں پہاڑوں کے درمیان زمین ہے جو دو اقسام پر مشتمل ہے۔ ایک تو وہ جس سے کم عمر طلباء چڑیوں کے گھونسلے تیار کرتے ہیں اور ایک وہ جس سے بیل بناتے ہیں۔ طلباء اس امر کا خود اندازہ کر لیں گے کہ کس قسم کی زمین کو زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ اور کس کو کم اب مدرس کو چاہیئے کہ تختۂ سیاہ پر ملک کا خاکہ اُتارے اور اُس کو دو برابر حصوں پر تقسیم کرے۔ مرہٹواڑی کا حصہ

سبز چاک سے ظاہر کیا جائے اور تلنگانے کا زرد چاک سے۔ اگر طلباء کو موٹا خاکی کاغذ اور رنگین چاک کے ٹکڑے دئے جائیں تو وہ بھی مُدرس کی تقلید کرسکتے ہیں۔ اس سے طلباء میں دلچسپی اور کام میں سہولت پیدا ہوگی۔ اس موقع پر عملی تجربہ کی بناپر مرہٹواڑی اور تلنگانہ کی زمین کے فرق کو اچھی طرح طلباء کے ذھن نشین کر دیا جائے۔ اس فرق کے صحیح علم پر گھر کے جغرافیہ کا بہت بڑا حصہ نسبتاً کم وقت اور کم محنت سے حاصل ہوسکتا ہے

آب وہوا | جغرافی حالات Geographical Conditions) میں طبعی حالات کو جو اہمیت حاصل ہے آب وہوا کو اس سے زیادہ حاصل ہے۔ اس لئے کہ قدرتی ساخت کا مدار بالکلیہ آب وہوا پر ہے۔ چونکہ ہمارا ملک سطح مرتفع ہے جس کی بلندی تقریباً ۱۵۰۰ فٹ سے ۲۵۰۰ فٹ تک ہے اور جو آب وہوا کو معتدل بنانے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے یہاں کی آب وہوا بسہولت سمجھائی جاسکتی ہے۔ طلباء یہ جانتے ہیں کہ گرما کے موسم میں دھابوں یا کھلے بنگلوں پر سونے سے زیادہ گرمی نہیں ہوتی۔ ان کے اس علم سے فائدہ اُٹھا کر مدرس یہ بتاسکتا ہے کہ ہمارا پورا ملک بمنزلہ ایک بلند بنگلے کے ہے اس لئے یہاں گرمی اور سردی میں شدت نہیں بلکہ اعتدال ہے۔ اسی ضمن میں تبخیر و تکثیف کا عمل کیا جاکر (جو ایک چائے کی پیالی اور ایک برف کے ٹکڑے سے ہوسکتا ہے) بارش کا تصور دلایا جائے اور کھلے میدان و گھنے جنگل کی بارش کا مقابلہ کرکے تلنگانہ اور مرہٹواڑی کی بارش کا تناسب طلباء کے ذھن نشین کیا جائے۔ اور بتایا جائے کہ تلنگانہ میں جنگلات کی کثرت کے باعث نسبتاً مرہٹواڑہ سے زیادہ بارش ہوتی ہے اور یہ انتظام قدرت ہے کیونکہ تلنگانہ کی زمین ریتیلی ہونے کی وجہ سے یہاں کی زمین کو زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ برخلاف اس کے مرہٹواڑہ کی زمین سیاہ اور چکنی ہے اس لئے اس کو کم بارش کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تلنگانہ میں بڑے بڑے تالابوں کی بہتات ہے تاکہ ان میں بارش کا پانی محفوظ کیا جاسکے۔ طبعی حالات اور آب وہوا پر خاص زور دے کر از سرنو تلنگانہ اور مرہٹواڑہ کے جملہ حالات کا مقرونی طریقہ سے مقابلہ کرکے بتایا جائے کہ تلنگانہ میں جتنے اضلاع ہیں وہ بلحاظ اپنے طبعی حالات۔ آب وہوا۔ پیداوار

اور صنعت و حرفت کے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ اور یہی حالت اضلاع مرہٹواڑہ کی ہے۔ پس صرف تلنگانہ یا مرہٹواڑہ کے جملہ جغرافی حالات کا جاننا مرادف ہے ان کے جملہ اضلاع کے جغرافی حالات کے جاننے کے۔ یہی طریقہ خطہ واری طریقہ کہلاتا ہے جس کی ماہرین جغرافیہ پر زور سفارش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تعلیم جغرافیہ اس طریقہ سے نہ صرف صحیح اصول سے حاصل ہوتی ہے بلکہ سہل الحصول ہوجاتی ہے اور یہ واقعہ ہے۔

پیداوار | پیداوار میں زرعی، معدنی، نباتی اور حیوانی ہر چہار شامل ہیں۔ ان کو بھی طلبار کے مشاہدہ اور تجربہ کی مدد سے بڑھایا جائے۔ چونکہ یہ چاروں چیزیں ملکی دولت کے منبع ہیں اور ان کی ترقی پر ملک کی ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے لہذا دوران تعلیم میں طلباء میں اس قسم کا جوش پیدا کیا جائے کہ وہ بڑے ہو کر اُن کی افزونی میں بہرہ وافر لیکر خود کو اور ملک کو فائدہ پہنچائیں۔

طلباء عام طور پر کھانے پینے کی وہی چیزیں استعمال کرتے ہیں جو ہمارے ملک میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سے دریافت کیا جائے کہ وہ اجناس اور میوہ جات میں کیا کیا استعمال کرتے ہیں۔ وہ بہت سے اجناس مثل جوار، چاول، باجرہ اور گیہوں وغیرہ کہیں گے اب اُن سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہمارے ہی ملک کی پیداوار ہے اس لئے ہم ان کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب کبھی ان سے زرعی پیداوار پر سوال کیا جائے گا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے حافظہ پر بار ڈالیں یہ سوچ لیں گے کہ وہ کون کونسی اشیاء استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد ہی وہ ان اجناس کے نام بے کم و کاست گنوادیں گے اضلاع کے طلباء کو مختلف قسم کے اناج کے کھیت دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور یہ کہ کھیتوں کے متعلق ان کو کچھ علم بھی ہوتا ہے۔ ان کے اس علم کی روشنی میں زرعی پیداوار کی خاصی توضیح کی جاسکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں تلنگانہ اور مرہٹواڑہ کی پیداوار کا فرق معہ وجوہ بتایا جائے۔ طلباء سے پیداوار کے دو نقشے تیار کروائے جائیں۔ ایک میں عام پیداوار ہو اور دوسرے میں خطہ واری۔ طلباء مختلف اجناس گوند سے نقشوں پر لگائیں اور ان نقشوں کو مثل اور نقشوں کے اپنے رہائشی کمرہ میں آویزاں کریں۔ ہماری سرکارنے

زراعت کو ترقی دینے اور اہل زراعت کی معاشی حالت کو درُست کرنے کے لیے جو جو کام کئے ہیں مثل قیام محکمۂ زراعت و انجمن ہائے زرعی. ذرائع آبپاشی کا اجرا تقسیم تقاوی اور زراعتی تجربوں کا ذکر کر کے طلبار کے دلوں میں اس پیشہ کی محبت کا بیج بویا جائے تاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں اس کثیر المنفعت پیشہ میں بطیب خاطر حصہ لے سکیں۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ انگلستان کی ترقی کا راز اس کے لوہے اور کوئلہ کے معادن میں مضمر ہے. ہمارے ملک میں بھی ان قدرتی خزانوں کی کچھ کمی نہیں. اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ باشندگان ملک ان قدرتی دفینوں کی ضرورت سے لاپروا ہیں. یہ بات حضرات مدرسین کے فرائض میں داخل ہے کہ ملک کی معدنیات سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھانے کا شوق اپنے زیر تعلیم طلبار کے دلوں میں ابتدا ہی سے پیدا کر دیں. جب یہ نونہال پروان چڑھیں گے تو یہ ابتدائی شوق ضرور رنگ لائے گا. معدنیات کی تعلیم بھی زرعی پیداوار کی تعلیم کے طریقہ پر دی جا سکتی ہے مثلاً لوہے اور تانبے کے برتن اور انجن کے کوئلے وغیرہ پر سوالات کر کے بتایا جا سکتا ہے کہ یہ دھاتیں بھی ہمارے ہی ملک کی پیداوار ہیں. مقوّے پر ضلع واری دھاتوں کا نقشہ اتارنا اور اتروانا فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہیں۔

صنعت و حرفت جغرافیہ دان حضرات کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ انگلستان میں جو غلہ پیدا ہوتا ہے اگر وہاں کے باشندے اس کو استعمال کریں تو وہ بمشکل ایک ہفتہ کفایت کرے گا بس ظاہر ہے کہ انگلستان کی دولت کا راز اس کی زراعت میں نہیں بلکہ اس کی مصنوعات میں ہے۔

آج کل طلبار کریم نگر کی چاندی کی اور بیدری گنڈیاں استعمال کر رہے ہیں۔ عیدین اور تہوار کے زمانے میں جامہ وار. لشر اور ریشم کے کوٹ اور شیروانیاں پہنتے ہیں اضلاع کے طلبار نانڈیڑ کے میلے. مختلف مقامات کے کمبل اور سوتی کپڑا استعمال کرتے ہیں. ان کے ذاتی تجربہ کو کام میں لا کر مدرس یہاں کی صنعت کی شہرۂ آفاق شہرت سے طلبار کو واقف کر کے ان کو ملکی صنعت کے فروغ کی طرف مائل کر سکتا ہے. ضلع واری مشہور مصنوعات کا نقشہ مختلف مصنوعات کے ٹکڑے چسپاں کر کے تیار کروایا جائے تاکہ

مصنوعات کا صحیح تصور طلباء کے ذہن نشین ہو جائے۔ اور یہ نقشہ بھی مدرسہ اور ان کے رہائشی کمرہ میں آویزاں رہے۔ اس موقع پر محکمۂ صنعت و حرفت کی کارگذاریوں کا ذکر بھی ہو۔

تجارت | طلباء کی سابقہ معلومات کی مدد سے انہیں یہ بتایا جائے کہ انسان کے پاس جو چیز نہیں ہوتی وہ دوسروں کے پاس سے لیتا ہے اور جو چیز ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے وہ معاوضہ کے ساتھ دوسروں کو دیدیتا ہے۔ اسی اصول کے تحت ہمارے پاس سے غلہ۔ کپاس اور کھال وغیرہ باہر جاتے ہیں اور باہر سے موٹر، سیکل۔ انجن پہننے کے کپڑے۔ آرائش کا سامان۔ اور نوشت و خواند کی چیزیں ملک میں آتی ہیں۔ مناسب ہو گا کہ مقامی حالات کے لحاظ سے طلباء کو اسٹیشن پے جا کر سامان کے درآمد و برآمد کا عینی مشاہدہ کروایا جائے۔ اب چونکہ ملک کے اکثر حصّوں میں ریل جاری ہو چکی ہے اس لئے اس پر عمل کرنا بعید از قیاس نہیں معلوم ہو سکتا۔ اسی سلسلہ میں اندرونی اور بیرونی تجارت کا تصور دلانا بے محل نہ ہو گا۔

ذرائع آمد و رفت | طلباء ایک گاؤں سے لے کر دوسرے گاؤں کو یا ایک ضلع سے دوسرے ضلع کو جاتے ہیں۔ بہت کم طلباء ہوں گے جنہوں نے تھوڑا بہت سفر نہ کیا ہو۔ اکثر طلباء تو بنڈیوں اور کھاچروں میں سفر کر چکے ہیں۔ اس وقت مدرس بجائے تختہ سیاہ پر ریلوے لائین اتارنے کے کسی ایک اپنے یا اپنے عزیز کے سفر کا تجربہ بیان کرے۔ دوران بیان میں اس لائین کو بھی نقشہ پر اتارتا جائے جس کے ذریعہ سفر کیا گیا ہے۔ اور اس پر کے مشہور مقامات درج کرتے جائے۔ اسی طرح جملہ ریلوے لائینوں کا ذکر ہو اور ان کو تختہ سیاہ پر اتارا جائے۔ طلباء اپنی بیاضوں میں اُستاد کی تقلید کریں۔ موجودہ زمانہ میں اس خصوص میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے اس کا ذکر نہایت ضروری ہے کیوں کہ اس سے ملک کی معاشی حالت میں ترقی ہو رہی ہے اور آئندہ خاصی ترقی کی توقع ہے۔

تربیتِ دماغ اور ورزش جسمانی

یہ بسیط مضمون "ماوِ نو" جلد دوم، باب دہم، صفحہ ۱۲۰ کا ترجمہ ہے۔

فاضل مصنف نے، اس باب میں، دماغی و جسمانی قویٰ کی تربیت کے موضوع سے نہایت تفصیل و تشدید کے ساتھ بحث کی ہے۔ نیز اُن کے وسائل کو جس عالمانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ مصنف نے مصنوعات، وسائل و ورزش جسمانی نقاشی و موسیقی اور علمی و فنی تکمیل اور دستی مشاغل قرار دئے ہیں جو عہد حاضر کے مذاق اور میلانات کے اعتبار سے جاذب توجہ ہیں۔ مضمون زیر عنوان کا پیرایۂ بیان دلکش اور ماہرانہ اسلوب کا حامل ہونے کے لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔

(متین)

ہمارا دماغ ایک چراغ کی مانند ہے جو ہماری زندگی کو روشن کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے جو لوگ دماغی امراض میں مبتلا ہیں، وہ دیوانوں اور احمقوں کی مانند بڑے ہی بدنصیب اور قابلِ رحم ہوتے ہیں! اس میں شک نہیں کہ اس چراغ جسم کو روغن کی ضرورت ہے، اگر ہم اس میں روغن نہ ڈالیں گے تو وہ ذرا سی دیر میں ٹمٹما کر بجھ جائے گا........

تعلیم و تدریس ایک طرف سے ہمارے دماغی قویٰ کو کام میں لگاتے اور اُن کی پرورش کر کے درجۂ کمال پر پہنچاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف سے اُن قویٰ کو بھی جو بمنزلۂ روغن چراغ کے ہیں کام میں لایا جاتا ہے۔ اگر ہم اِس کی جگہ پُر کر کے اُن قویٰ کی تعمیر نہ کریں گے تو بہت جلد ہمارا جسم ناتواں اور علیل ہو کر ہمارے چراغ عمر کو گل کر دے گا۔

اسی خیال کے مدنظر، اگر ہم اپنے دماغ کو ترو تازہ رکھنا چاہتے ہیں تو اُس کا روغن ختم اور اُس کی قوت گھٹنے نہ دیں۔ ہمیں اس کو قوت پہنچاتے رہنے، اُس کے روغن میں روز بروز اضافہ کرنے، اُس کی چرخیوں سے واقف ہونے اور اُن میں روغن لگانے کی سخت ضرورت ہے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم ذیل کے وسائل اختیار کریں۔

۱۔ ورزش جسمانی | دماغی قویٰ کا نشو و نما بغیر قوائے جسمانی کی ترقی کے ممکن نہیں۔ اس وجہ سے کہ تعلیم و تعلم ایک نوع کی دماغی ورزشیں ہیں اور یہ ورزش بغیر کامل ورزش جسمانی کے ناممکن و بے فائدہ ہے۔ اس نقطہ نظر سے ہم حفظِ صحت، نگہداشت اور جسم کو تقویت دینے کے شرائط کی رعایت کے ذریعہ ہی قوائے دماغی کی حفاظت کرسکتے اور اس صرف شدہ روغن کی وساطت سے اُن کو قائم بھی رکھ سکتے ہیں۔ اعضا یا جسمانی قویٰ بمنزلہ قوائے دماغی کے خدمت گزاروں کے ہیں۔ حکومت کرنا، حکم لگانا اور حکم دینا انہی سے متعلق ہے اور ان احکام کی اطاعت اور ان کی بجاآوری کا تعلق بھی قوائے جسمانی سے ہے۔ لحاظ اس خیال کے جس قدر ہمارے جسمانی قویٰ مضبوط، قابلِ کار، چست، تندرست اور توانا ہوں گے اُسی قدر ہمارے دماغ سے احکام و اوامر بہتر اور زود تر جاری ہوکر دماغ کی قوت و سنجیدگی میں اضافہ کریں گے اور یہ طبیعی خاصّہ ہے کہ ایک ایسا دماغ فہمِ مطالب اور حفظ معلومات میں زیادہ قابل ہوتا ہے۔

اس صورت میں تربیتِ جسمانی یعنے ورزش (جمناسٹک، اسپورٹس اور اقسام اقسام کے کھیل) اور صحت جسمانی کی حفاظت، قوائے دماغی کی نشو و نما اور تعلیم و تدریس کی تسہیل کے ساتھ تعلق ہی نہیں رکھتی بلکہ اس کا لازمہ ہے۔

ہم نے ایسے بہتیرے عقلمند اور ارباب علم و فضیلت اشخاص دیکھے ہیں جن کے وجود سے ہماری قوم کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں پہنچا۔ حالانکہ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ اپنے علم و دانش سے فائدہ اُٹھاتے! وہ ہمیشہ گوشہ نشین، سُست، آرام طلب اور احدی بندے رہے ہیں۔ اُن کے دماغی قویٰ از حد کام کئے ہوئے، بہت سی باتیں اور معلومات اخذ و حفظ کئے ہوئے لیکن بے انتہا تھکے ہوئے ہوتے ہیں، گویا کہ وہ زندہ نہیں ہیں، بات کرنے کی بھی قوت نہیں رکھتے، اکثر اوقات بیمار، بے سکت، ڈرپوک، پریشان، نااہل، زبوں حال، اور عاجز نظر آتے ہیں! ...... وہ کیوں ایسے ہوگئے ہیں؟ اس سبب سے کہ انہوں نے اپنے قوائے دماغی کو غیر معمولی اہمیت دے کر علوم و فنون کے حاصل کرنے میں زحمت اُٹھائی، قوائے دماغی کو کام میں لگا کر ان کو حد سے زیادہ

صرف کیا اور حفظِ صحت کا مطلق خیال نہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا مزاج نادرست ہو کر
قوت تحلیل ہو گئی۔ افیون کی خانمان سوز بلا، جو نسل ایران کی قومیت کے درخت کو لپیٹ کر
اُس کو جڑ سے اُکھیڑ رہی ہے، اس دلخراش حالت کے پیدا کرنے کا بڑے سے بڑا سبب ہے
ایران میں، میری نظر میں ورزش جسمانی کی ترویج افیون کا استعمال ترک کر دینے کے لئے
بہترین علاج ہے۔

اس طرح کے لوگ جس قدر بھی عالم، فاضل اور کامل ہوتے ہیں اُن سے کس
نوع کے فائدہ کی توقع ہو سکتی ہے۔ کونسی ذہنی قوت کا جس کا فعل و عمل سے قریبی تعلق
ہے، اُن میں پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ عمل و اقدام اُن سے بعید ہے، عزم، ارادہ، متانت اور
شخصی استقلال کا بھی اُن کے ساتھ بہت کم تعلق ہے۔ یہ لوگ باعتبارِ زندگی مُردہ ہیں۔ ان
میں نادان آدمیوں کی طرح بھی کام کی قابلیت اور زندہ دلی نہیں ہوتی جس سے اپنی قوم
اور نفس کی خدمت کر سکیں۔

ورزش جسمانی اور حفظِ صحت کے فوائد اُن سے بہت زیادہ ہیں جن کو یہاں بیان
کیا جا سکتا ہے۔ ممالک یورپ میں مدارس کے لئے حفظانِ صحت اور ورزش جسمانی سے
متعلق خاص خاص کتابیں تالیف اور شائع کی گئی ہیں! بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے
ملک میں جو چند قدم خطا اور کجی کے ساتھ تعلیم کی راہ میں اُٹھائے گئے ہیں، اس مسئلہ سے
لازمی طور پر اعتنا نہیں کی گئی اور نہ اب تک بھی کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ ایسا مسئلہ نہیں جس
کے سمجھنے کے لئے اہل یورپ کی کتب کی محتاجی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ جب تک ہم نے
اُن سے نہیں سُنا۔ ان کے فائدوں سے واقف نہ ہو سکے۔ یہ دلیل بہت روشن اور
واضح ہے، کیا آپ نے نہیں دیکھا ہے کہ جس وقت ہمارا دماغ زیادہ کام کر کے تھک
جاتا ہے تو کسی شئے کے فہم و ادراک پر قادر نہیں ہوتا، لیکن جونہی ہم نے چند گھنٹے
تفریح میں گزار دئے یا کھیل میں مصروف رہ کر اپنے دماغ کو فرحت دینے میں مشغول ہو گئے
تو فوری ہمارا ذہن صاف اور روشن ہو جاتا ہے اور اس سے ہمارا دماغ تر و تازگی حاصل
کرتا اور سخت و پُر زحمت مطالب کا سمجھنا ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے؟ کیا یہ ذکل جو

ایران کے اکثر شہروں میں ہیں باوجود اس کے کہ وہاں ابھی حفظانِ صحت کے شرائط مقرر نہیں ہیں پھر بھی کچھ کم خدمت کر رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں ان کو متروک قرار دینا یا اُن سے مانع نہ ہونا چاہیئے بلکہ ان میں اصلاح کرنا اور ان کی نسبت شوق دلانا چاہیئے۔

پھر آپ خود دیکھیں گے، اگر مدرسہ یا بیرونِ مدرسہ بین فن تربیت کے قواعد کے مطابق حفظ صحت اور ورزش جسمانی کے شرائط کی رعایت اور اُن کی جانب توجہ کی جائے گی تو ہمارے فرزندوں اور نونہالوں کا کس قدر فائدہ ہوگا!

یہ بات بدیہی ہے کہ یہ شخصی افادہ نتیجہ میں بہت کچھ نوعی و اجتماعی فوائد رکھتا ہے وہ قوم جس کے افراد — خاصکر اس کے اہل علم اور نوجوان۔ مخصوص جسمانی قوت اور کامل صحت کے مالک ہوتے ہیں، وہ قوم جو مقدرات کو سنوارنے میں بھی قوت و متانت کی مالک ہوتی ہے، وہ قوم جو کسی وقت مغلوبیت و محکومیت کی زیر بار نہیں ہوتی، وہ قوم جو جبر و قہر کے مقابل اپنی آزادی و استقلال کو ہاتھ سے نہیں کھو بیٹھتی؛ اس کا ہر ہر فرد اس کی حفاظت کے لئے ایک بہادر اور ایک زبردست قہرمان ہوتا ہے وہ باعزت و شرف موت کو تنگی، قید اور ذلت پر ترجیح دیتا ہے۔

ایسے ہی افراد، اپنی قوم کے لئے ایک باعزت اور فرض شناس لشکر تیار کر دیتے ہیں جن کی قوتِ قلب، جرات و شجاعت، زحمتوں اور مصیبتوں کا حقیر سمجھنا، عزم و ارادہ اور ثابت قدمی و استقامت اس قوم کی ظاہری خصلتیں ہوتی ہیں۔

ایسی ہی قوم ہرگز نہیں مرتی، ہرگز دیگر اقوام و ملل میں تحلیل و ہضم ہو کر فنا نہیں ہوتی اس کی کمرِ ہمت ہرگز نہیں ٹوٹنے پاتی اور ہرگز اس کی پشت زمین پر نہیں آرہتی۔ ایسی ہی قوم دیگر اقوام کے مقابل کشادہ پیشانی، سنجیدہ دلی، درخشاں رخساری، اور نگاہی سحر آمیزی کے ساتھ استادہ ہو کر اپنے آپ کو ان کا ہمسر و ہمدوش بنا دیتی ہے!

جرمانی قوم ایک ایسی ہی قوم کا نمونہ ہے اور یہ اُس کا تفوق، جسمانی ورزشوں کا باعث ہے جنہیں (۱) اولاً اُس نے تمام مدارس میں لازمی قرار دیا ہے اور (۲) ثانیاً قومی انجمنوں اور ورزشی اکھاڑوں کی طرف سے ہر جگہ عام طور پر ان کی تعلیم ہوتی ہے۔ محاربہ عظیم کے

بعد سے خاص خاص اخباروں، کتابوں، تاریخی وفنی فلموں، کھیلوں کے جاری رکھنے کا شوق دلاتے ہیں۔

ہمارے خیال میں ہر شخص جو ذرہ برابر بھی علم سے واقفیت رکھتا ہوگا وہ ان مطالب کے پڑھنے کے بعد ممکن ہی نہیں کہ حفظان صحت اور ورزش جسمانی کے فوائد سے انکار کرے۔ ہمارے ملک کے مدارس اس باب میں نہایت سخت اور اہم فرض رکھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے ایک طرف سے ایران کی جدید نسل کی تربیت کا ذمہ لیا ہے اب ملک کو (جہالت کے پنجے سے) نجات دلانے کے لئے بزرگ، بلند ہمت اور جری افراد کو تیار ہو جانے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف سے کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے گھر قواعد تعلیم و تربیت سے ناواقف ہیں اور بچوں کو مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے اس فضا میں، جو حفظ صحت اور فن تربیت کی مخالف ہے، بڑا ہونے دیں یہی وجہ ہے کہ بچے مدرسہ داخل ہونے کے وقت حقیقتہً کامل تندرستی سے محروم اور اکثر علیل و بیمار، لاغر و ناتواں ہوتے ہیں، ہمارے مدارس کو اس مسئلہ پر زیادہ وقت صرف کرنے اور ورزش جسمانی کے ذریعہ، خاص توجہ نگرانی کے ساتھ بچوں کی اصلاح حال کا خیال رکھنے نیز اُن کے جسمانی ترقی کی جانب خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے ..... اس وجہ سے کہ ہمارے مدارس کا فرض دیگر اقوام کے مدارس کی بہ نسبت دوچند ہے اور ہر ایک ان مدرسوں میں سے جن کو اس فرض کے ادا کی توفیق ہوئی ہے اپنی قوم اور ایران کی آیندہ قسمت سے متعلق خدمت بھی دوگنی اور اس سے بھی زیادہ ہوگی۔

لیکن اس فرض کی انجام دہی کا طریقہ، بدقسمتی سے ہم یہاں مدارس کے حفظان صحت کے قواعد اور ورزش جسمانی کے اُصول کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے، ان دونوں مسائل (میں سے ہر ایک) کے لئے اس فن سے متعلق ایک مبسوط کتاب درکار ہے۔ جو ماہرین فن ہی کی جانب سے لکھی جانی چاہیئے ہم اُس کے یہاں دو تین ہی نکات بیان کریں گے۔

اولاً۔ تشکیلات مدرسہ، مجلس انتظامی اور معلمین کو اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ تندرستی اور حفظ صحت کا سرتا پا نمونہ ہوں۔ جس مدرسہ کی عمارت تنگ و تاریک اور اس کے کمرے اصول حفظ صحت کے مطابق نہ ہوں اور وہ چمن، ستھرا پانی اور پاک و صاف آب و ہوا سے محروم ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ میں تعفن اور بدبو پھیل رہی ہو، ممکن ہی نہیں کہ اس میں تندرست، طاقتور اور ذی فہم بچوں کی تربیت ہو سکے۔

ایسے صدر مدرسین، منتظمین اور معلمین ہمیشہ بیمار اور لاغر رہتے ہیں جو صفائی اور پاکیزگی کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنے آپ کو کثیف حالت میں رکھتے ہیں۔ ان کا لباس ناصاف ہوتا ہے، ان کے سر اور چہرہ سے پاکیزگی سلیقہ مندی اور صفائی ظاہر نہیں ہوتی۔ ان سے بچوں کو حفظِ صحت کے شرائط بجا لانے پر مجبور کرنا نہیں ہو سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ان کو کلمۂ صحت و صفائی کے ورد سے شرم کرنا اور بچوں کے سامنے خجلت زدہ ہونا چاہئے ان سے جس قدر جلد ممکن ہو اپنے آپ کو صفائی و پاکیزگی کا نمونہ ثابت کر دکھانا چاہیئے یا اس مقدس ذمہ داری کے بارگراں کو اپنے کاندھوں سے اُتار دینا چاہیئے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ثانیاً۔ بچوں کو عملی نمونوں اور محسوس مثالوں کے ذریعہ صفائی و صحتِ جسمانی کے فوائد سے واقف کرانا چاہیئے، پند و نصیحت، یا تہدید و جبر کے ذریعہ نہیں۔ ان کو صحت و صفائی کے شرائط پر عمل کرنے کا ہر وقت خواہ گھر ہو یا گھر کے باہر عادی بنانا چاہیئے، ہر موقعِ فرصت میں، نمونوں اور مثالوں کے ذریعہ ان شرائط کا ذکر کر کے ان کے رقابت، غرور اور خودداری کے جذبات اُکسانے چاہئیں۔

ثالثاً۔ ورزشِ جسمانی کو تمام مدارس میں رائج کرنا چاہیئے۔ ایران کی وزارت تعلیم کا فریضہ ہے کہ وہ تمام مدارس کے نظام تعلیم میں اِس کو جبری اور لازمی قرار دے۔

البتہ یہ ورزش ایسے اشخاص کے ذریعہ سیکھنی چاہیئے جنہوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا ہے۔ چونکہ یہ ورزش حفظِ صحت کے قواعد سے متعلق ہے اور اس میں بچوں کے جسم اور مزاج کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے؛ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان خاص خاص معلمین کو جو اس فن میں کافی مہارت رکھتے ہیں اس کی تعلیم سپرد کی جا

ہمارے ملک کو معلمین کی درسگاہوں کی جس قدر ضرورت ہے اُسی قدر ہیں ورزش جسمانی کی ایک خاص تعلیم گاہ کی بھی سخت ضرورت ہے۔ جس مدرسہ میں ورزش جسمانی کا انتظام نہ ہو اُس مدرسہ کی تعلیم سے اُمید خیر نہ رکھنی چاہیئے۔ جب تک کہ ورزش جسمانی کی تعلیم خاص خاص وسائط و آلات کے ذریعہ کسی معلم خصوصی کے تفویض نہ کی جائے گی اس ورزش سے کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا۔

ورزش جسمانی کے علاوہ، تھوڑی سی ورزش اسباق، اعمال، کھیل اور دستی مشاغل کے دوران تعلیم میں لازمی طور پر ہونی چاہیئے تاکہ ہمیشہ قوائے دماغی اور قوائے جسمانی کے درمیان تناسب و توازن قائم رہ کر دماغی قویٰ سے خستگی رفع ہو۔

۲۔ نقاشی و موسیقی | نقاشی کی مشق سے یہ مقصد نہیں کہ ہم طلبہ کو نقاش بننے کے لئے تیار کریں، ان کو نقاشی کی تعلیم دیں اور اس فن لطیف کے قواعد سکھلائیں، بلکہ نقاشی کی مشق سے ہمارا مقصد خطوط کھینچنے، سادہ اور آسان چیزوں کے اجزا کی نقل اُتارنے کی تعلیم ہے۔ اس لئے کہ بچے کے لئے ذہنی اور دستی مشغولیت بھی فراہم ہو اور اُس کے ہاتھ اور انگلیاں بھی تقویت حاصل کریں۔ اگرچہ تعلیم خط "خوشخطی اور املا کی عمدگی سکھلانے میں فائدہ دیتی ہے، لیکن نقاشی کی مشق کے فوائد نہ صرف خوشخطی میں بلکہ قوائے دماغی اور دلی جذبات کی تربیت میں ممد ہونے کے اعتبار سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

جس طرح "تقلید اصوات" نوع انسانی کی قوت ناطقہ اور اُس کے متکلم ہونے کی بنیاد ہے، اُسی طرح "تقلید صور اشیا" بھی خط و کتابت کی بنیاد رہی ہے۔ ابتدائے آفرینش میں انسان نے تکلم اور کتابت کو اسی طریق پر یعنے تقلید اصوات اور تقلید صور اشیا کے ذریعہ سیکھا اور تھوڑی بہت زبان اور کتابت اظہار مطالب کے لئے تیار کی ہے۔

اس لحاظ سے تقلید اصوات کی قدامت اختراع تکلم سے اور تقلید صور اشیا کی اختراع خط سے ثابت ہے۔ یہ حالت وحشی اقوام کے درمیان اب تک بھی دیکھی گئی ہے جس طرح ہم نے گزشتہ فصلوں میں ذکر کیا ہے، بچے بھی اس حالت کے بہترین نمونے

ہوتے ہیں۔ اس طبعی قانون کے مطابق، بچے فطرۃً تصویر بنانے اور ہر ایک چیز کی شکل اُتارنے کو بہت دوست رکھتے ہیں چنانچہ ہم نے بارہا دیکھا ہے جب ایک ربڑ اور پنسل ان کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو وہ فوراً کاغذ پر لکیریں کھینچنا شروع کر دیتے ہیں!

وہ اِس جذبۂ تقلید۔سے جو اُن کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے محض ناواقف ہوتے ہیں۔ . . . . . اس سے پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ حروفِ الف بار کی آواز اور اسی طرح اِن (حروف) کی شکلیں بچوں کے لئے بالکل نئی اور عجیب چیزیں ہوتی ہیں چونکہ وہ بظاہر ایک آواز اور ایک چیز میں کسی قسم کی مشابہت نہیں دیکھتے ہیں اور نہ سنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ الف بار سیکھنا اُن کے لئے بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لحاظ سے بات شروع کرنے سے پہلے بچہ جیسے جیسے ایک عرصہ تک آوازوں کی تقلید کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس کی زبان تھوڑی بہت کھل جاتی ہے اور اُس کے کان بھی مدد دیتے ہیں اس کے بعد وہ ایک ایک لفظ کی نقل شروع کر دیتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے خط اور املا شروع کرنے سے پہلے ایک عرصہ لکیریں اور شکلیں اُتارتے اور اپنی اُنگلیوں سے کام لیتے رہنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ الف بار میں لکھنا اور پڑھنا ایک ساتھ ہونا چاہیئے اور ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے تعلیم خط اور مشقِ نقاشی بھی اس معنے کے اعتبار سے جس کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے الف بار کے ساتھ ہی شروع کر دینی چاہیئے۔

چونکہ تعلیم خط اور مشقِ نقاشی کے ذریعہ فوائد مطلوبہ حاصل ہوتے ہیں اس لئے ذیل کی شرائط کی پابندی ضروری ہے:۔

اوّل ۔۔ ان دو مشقوں میں سے کسی ایک کو لازمی وجبری قرار نہ دیا جائے۔ اور خاصکر نقاشی کی مشق میں قواعد واصول کی پابندی نہ کی جائے اور جو شکلیں دی جائیں وہ درس مقررہ سے نہ ہوں۔

دوم ۔۔ تعلیم خط میں، سرمشق (سلپ کاپیوں) سے مراد ایسے الفاظ نہ ہوں جنہیں بچوں نے نہ پڑھا ہو یا اُن کے معنے نہ جانتے ہوں۔ ایسے الفاظ کی نقل کرنا جن کے معنوں سے بچے ناواقف ہوتے ہیں اُن کے دماغ کے لئے بڑا سنگین بار ہے۔

سوم۔ تعلیم نقاشی بہت سادہ لکیروں سے (مثل ایسی لکیروں کے جو دائیں بائیں، اوپر سے نیچے کو اور ایک گوشے سے دوسرے گوشہ میں کھینچی جاتی ہیں) شروع کرنی چاہیئے معلّم کی ساری کوشش اس بات کے لئے صرف ہو کہ بچے شوق و دلچسپی کے ساتھ کھیل کے طور پر اس کام میں مشغول رہیں یعنے اُن کو مشق کرنے میں پوری آزادی دینی چاہیئے صرف وہ نمونے لکھے، شوق دلائے، آفرین کہے اچھی مشقوں پر نمبر دے اور دوران مشق ان کی رہنمائی کرے۔

یہ مشقین الف بار کے سیکھنے میں بڑی مدد دیتی ہیں اور مفید ہوتی ہیں اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ بچّوں کا خط تھوڑی سی مدت میں بہت ہی اچھا ہو جائیگا اور وہ صحیح لکھنے اور اچھی طرح نقل کرنے میں خاص قابلیت حاصل کریں گے۔ ضمناً بھی اُن کے لئے یہ کام ایک قسم کا کھیل اور فرح بخش مشغولیت کا باعث ہوگا۔

اِن فائدوں کے علاوہ، نقاشی کی مشق ایک لحاظ سے بہت بڑا فائدہ رکھتی ہے جس سے مراد بچّوں میں قوت تمیز، محاکمہ، غور و فکر اور اچھے بُرے کی تمیز (ذوق صحیح) کی پرورش ہے۔ اس لئے بچے اس امر کی اچھی طرح تقلید کریں گے اور ایک دوسرے کے درمیان ممتاز و سفر ور ہو کر غور و خوض کریں گے۔ یہاں تک کہ اُن چیزوں کی لمبائی، چوڑائی، بڑائی چھوٹائی، لکیریں اور گوشے جن کی وہ نقل کرتے ہیں اُن کا نقشہ اچھی طرح ذھن میں جمالیں گے اور اپنے قوائے دماغی کو اس راہ میں کام پر لگا دیں گے۔ اس ضمن میں قوئ بھی بار بار مشق کرنے سے کام کرنے کے عادی ہو جائیں گے اور تکرار عمل کے وسیلہ سے تقویت حاصل کرکے ترقی پائیں گے! ......

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایک بچہ قوائے دماغی جس قدر قوی رکھتا ہوگا اور جس قدر اس کی قوتِ تمیز، فکر، محاکمہ مکمل ہو گی اسی قدر وہ درّاک، ذکی اور زیادہ کام کرنے والا ہوگا۔ اس کا قوت حافظہ بھی (قوی) ہوگا جس کے ذریعہ اس کے دیگر اسباق کا یاد رکھنا اُس کے لئے بہت آسان ہو جائے گا۔

موسیقی کی مشق سے بھی فن موسیقی کے قواعد اور آلات موسیقی کے بجانے کی

تعلیم دینا مقصود نہیں بلکہ اس سے مقصود بچوں کو ہم آواز ہو کر اسباق (یا بچوں کے بعض وطنی و قومی ترانے اور دعائیں) پڑھنے میں مشغول رکھنا ہے چنانچہ اس کام کو اُستاد مکتبوں میں بھی انجام دیتے ہیں۔

یہ نکتہ یعنے بچوں کا اجتماعی طور پر ہم آواز ہو کر پڑھنا بہت زیادہ فائدے رکھتا ہے اور یہ نفسیات کا ایک اہم مسئلہ ہے کیونکہ:۔

اول ۔ یہ کلموں، اشعار اور نغموں کا سیکھنا اور ازبر کرنا آسان کر دیتا ہے اس وجہ سے کہ یہ بچوں کے کان میں بشدت داخل ہوتے اور بار بار دہرائے جاتے ہیں اس طرح سے ان کو ہر دفعہ دس بار پڑھنا پڑتا ہے

دوم ۔ موسیقی کے ہر ایک نغمے کی مانند ایک روحانی اثر رکھتا ہے جذبات کو اُبھارتا اور قوائے دماغی کو قوت بخشتا ہے۔

سوم ۔ کانوں کو اقسام کی آوازوں اور اُن کے زیر و بم سے آشنا کرتا ہے یعنے آوازوں کا فرق معلوم کرنے اور موسیقی کی لَے سے آگاہ کرنے میں بڑی مدد دیتا ہے اور موسیقی شناس ذوق کی پرورش کرتا ہے۔

چہارم ۔ دماغ کو کھیل اور تفریح سے لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دماغ کی خستگی کو دور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے ہمیشہ ہم آواز ہو کر اجتماعی طور پر پڑھنے کی جانب زیادہ طبیعی میلان رکھتے ہیں۔

اسی بنا پر، بچوں کو کبھی کبھی اس نوع کی موسیقی کے ذریعہ مشغول رکھنا بہت بڑا فائدہ رکھتا ہے اور باندازۂ ورزش جسمانی بچوں کی دماغی اور ذہنی صحت میں مدد دیتا ہے

۲۔ <u>علمی و فنی کھیل اور دستی مشاغل</u> ایک مدرسہ، جو صحیح معیار پر قائم اور فن تعلیم و تربیت کے شرائط کے مطابق ہے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ بعض علمی و فنی کھیل اور تھوڑے بہت دستی مشاغل کی مشق طلبہ سے کرائے۔ اکثر میرے ہموطن اس مسئلہ سے تعجب کریں گے اور تعلیم و تربیت کے ساتھ کھیل اور دستی مشاغل کی مناسبت کو جائز نہ سمجھیں گے!.........

اگر ہم فن تعلیم و تربیت کے قواعد و شرائط کما حقہ بیان کرنا چاہئیں تو کئی جلدیں لکھنے کی ضرورت ہو گی۔ لیکن جس طرح ہم نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے اُس سے ہمارا مقصد یہاں تعلیم و تربیت کی اہم بنیادوں کی تشریح و توضیح کرنا ہے نیز اُن بنیادوں کی تعیین کرتے ہیں، ہم نے ایران کے زمانۂ حال کے مدارس اور اُن کے موجودہ نقائص و ضروریات کو پیش نظر رکھا ہے اور اس وجہ سے بھی ہم اس مسئلہ کو ان اہم بنیادوں میں سے تصور کرتے ہیں۔

جو لوگ تعلیم و تربیت کے فن سے واقف ہیں یا جنہوں نے اہل یورپ کے مدارس کو نظر غائر سے دیکھا ہے وہ اس سے کچھ تعجب نہ کریں گے۔

ہم نے کسی گزشتہ فصل میں ذکر کیا ہے: جس وقت طالب علم کسی مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو ہم اُس کی آزادی سے بہت کچھ حصّہ سلب کر لیتے ہیں اور سنگین بار اس کے کاندھوں پر رکھ دیتے ہیں۔ اُس کے وہ تمام کھیل، تفریحین، کود پھاند، دوڑ دھوپ اور خوش فعلیاں جن کو وہ روزانہ گھر، دروازہ، گلی، کوچوں اور بازار میں کرتا تھا اس سے چھین لی جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ تمام باتیں اُس کے لڑکپن کا لازمہ ہیں اور اس کا وجود ان کا خوگر ہو گیا ہے۔ اسی سبب سے جب مدرسہ میں وہ ان عادات کے چھوڑ دینے پر مجبور ہوتا ہے، اس کا وجود ہر روز کی طرح جنبش و حرکت نہیں کرتا اور اپنی ؟ کی غذا سے محروم رہتا ہے تو مجبوراً اس کو بیماری و ناتوانی سے سامنا ہوتا ہے، نتیجہ یہ کہ وہ بے تاب و ناتواں ہو جاتا ہے۔ روز بروز اُس کی قوت گھٹتی۔ اُس کا مزاج خراب ہوتا اور اُس کا جسم نحیف و لاغر ہوتا جاتا ہے! اکثر وہ بچے جو آئے دن ہمارے مدارس میں داخل ہو رہے ہیں انہیں تھوڑے ہی عرصہ میں اس افسوس ناک حالت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُس وقت ہم بجائے فائدے کے مدرسہ سے نقصان اُٹھاتے ہیں کیونکہ بچّے کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں، اس کی استعداد اور قابلیت ملیامیٹ اور اُس کے حواس اور ذھن کند ہو جاتے ہیں۔

اہل یورپ نے بیشمار تجربوں کے ذریعہ ان حالات کی جانچ پڑتال کی، ان کے

اسباب وعلل پر غور کیا اور اُن کا علاج بھی اسی میں دیکھا ہے مدرسہ کو اس محرومی کی تلافی کھیلوں کے ذریعہ کرنی چاہیئے۔ اسی خیال کے نظر کرتے روزانہ چند گھنٹے طلبہ کو اقسام کے کھیلوں میں مشغول رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے جسمانی قویٰ کمزور نہ ہوں اور اُن کا جسم لاغر ہو کر اُن کی عقل، ہوش اور ذکاوت بھی مبتلائے ضعف نہ ہونے پائیں۔

صرف ان کھیلوں کے انتخاب میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس سبب سے ہم نے اس فصل کی ایک ذیلی سُرخی کے تحت علمی وفنی کھیل کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ہماری غایت یہ نہیں ہے کہ یہ کھیل طلبہ کو علوم وفنون کی تعلیم دیں گے بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ زمانۂ حال کے قواعد علم وفن کے مطابق ہوتے ہیں۔ اگرچہ زمانۂ قدیم کے بہت سے کھیل اب بھی موجود ہیں اس میں شک نہیں اُن کے اختراع کرنے کے وقت کسی خاص نتیجہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام کھیل جو اس وقت ہمارے ملک میں مروج ہیں علمی وفنی واقع ہوئے ہیں لیکن تقریباً وہ تمام کے تمام حفظ صحت وفن تعلیم و تربیت کے اصول کے مطابق نہیں ہیں۔ قواعد علم میں تغیر ہو گیا ہے اور ہر زمانہ کی مقتضیات میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔

کھیل کی قسمیں بکثرت ہیں لیکن ان میں سے اکثروں کو جو مدارس میں اور بالخصوص ہمارے مدارس میں (جہاں اُن کے لئے کچھ بھی انتظام نہیں ہے) نہیں ہوتے ہیں، رواج دینے کی ضرورت ہے مثلاً: یورپ کے اکثر مدارس میں پیراکی، دریا میں کشتی چلانا، فٹبال کھیلنا اور سیکل کی سواری وغیرہ کا عمل درآمد ہے اور ان کے مدارس ان کاموں کی معاونت کرتے ہیں اسی وجہ سے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے مدرسہ دنیا جہاں کی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتا ہے۔

ورزش جسمانی (جیمناسٹک) کا فن وہ بہترین علمی وفنی کھیل ہیں جن کی تعلیم فی زماننا تمام ممالک یورپ کے مدارس میں جبری ہے۔

اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ تقریباً اکثر کھیل جو آج کل ایران کے بچوں کے درمیان مروج ہیں مدرسہ میں ان کے لئے اجازت دی جاسکتی ہے صرف طلبہ کے مزاج اور

ان کے قوائے جسمانی کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ البتہ اُن اعمال سے جو اصُول حفظ صحت اور عام رسم و رواج کے خلاف یا کسی بچّہ کی طبیعت کے ناموافق ہیں اجتناب لازم ہے۔ ایران کے بچّوں کے اکثر کھیل اعضاء جسمانی کی قوت پر منحصر ہیں اور بلاشبہ اس قسم کے کھیلوں سے غرض بھی یہی ہوتی ہے؛ لیکن یورپ کے بعض مدارس میں بعض ذہنی کھیل[1] بھی ہوتے ہیں جو بچّوں کے قوائے دماغی مثلاً: قوت حافظہ، دقّت، مُحاکمہ، تمیز، مقایسہ وغیرہ کو قوت بخشتے ہیں۔

جیسے ایک میز پر، دس بیس یا اس سے بھی زیادہ مختلف اور چھوٹی چیزیں، بتّی، ربر، کنجی، مہر، قاب (کیس) سوئی، ڈوری کی قسم سے یا جو ہاتھ آئے اکٹھا کر کے شاگردوں کو اجازت دیں کہ سب کے سب ان کو پانچ منٹ تک دیکھیں پھر ان کو چھپا کر طلبہ کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذ دیکر کہیں کہ انہوں نے جو کچھ میز پر دیکھا تھا اُن کے نام اس کاغذ پر لکھدیں اور جو زیادہ یاد رکھتا ہو وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ چیزوں کے نام لکھے گا اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی قوت فکر اور حافظہ زیادہ قوی ہے۔ اس کو مناسب انعام دیں مشق یا ورزش ذہنی بچّوں کے دماغی قوئی کو ترقی دیتی ہے۔ اسی طرح کہیں کہ ایسا لفظ بناؤ جس کا حرف اول یا اس کا حرف آخر فلان ہوتا ہے یا پنساری یا بزاز کی دُکان کی چیزوں میں سے یا کسی دوسری دُکان کی کوئی ایسی چیز بتاؤ جس کا پہلا حرف فلان حرف ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میووں کی قسم سے فلان میوہ جو اس کو بہت مرغوب ہے جس کا پہلا حرف یا آخری حرف فلان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کو بتاؤ ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس قبیل کی بکثرت مشقیں ہیں جن کا ہمارے درمیان بہت رواج ہے کچھ نقصان نہیں رکھتا اگر کسی وقت طلبہ کو ان کے ذریعہ مشغول رکھیں اور بوساطت اس کے ان کے حافظہ اور حواس کی تربیت کریں ! لیکن اس کام میں افراط کا دخل نہ ہو ورنہ درس کی شکل نہ رہے گی۔

---

[1] اس سے مراد وہ کھیل ہیں جن کے ذریعہ ذہنی تحریک ہوتی ہے۔

لیکن دستی مشاغل، ان سے مراد سادہ اور چھوٹی چیزیں پنکھا، ڈبہ، ٹوکری، اوٹ ٹوکرا، قلم، چمچہ، کتاب کی جلد وغیرہ کاغذ اور مقوی یا تیلیوں اور مٹی سے تیار کرنا ہیں . . .
اس طرح کی مشغولیتیں ایسی چیزیں ہیں جنھیں بچے زیادہ دوست رکھتے ہیں اور اکثر اوقات گھر میں بھی تیار کرتے ہیں . . . . خیال نہ کرنا چاہیئے کہ مدرسہ کے لئے اس قسم کے کھیل اور چیزیں مناسبت نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے جیسا کہ ہم نے کہا ہے مدرسہ میں نہ چاہیئے کہ اس قسم کا فرق گھر کے ساتھ رکھا جائے۔ اس قسم کے مشاغل بچہ کی ترقی اور نشو ونما کے وسائل ہیں۔ اس کو ان چیزوں سے روکنا مثل پانی نہ دے کر پھولوں کو آفتاب کے سامنے رکھ دینے کے ہے!

یورپ کے مدارس میں — خاصکر بچوں کی کلاس میں — بڑے کمرے جن میں آلات، اوزار اور لوازم اس قسم کے کھیلوں اور کاموں کے لئے رکھے جاتے ہیں تیار کئے گئے ہیں اور ہر روز ایک دو گھنٹے طلبہ کامل شوق اور دلچسپی کے ساتھ خاص خاص معلمین کے زیر نگرانی وہاں مشغول رہ کر وقت گزارتے اور چیزیں تیار کرتے ہیں معلمین کو بتاکر ان چیزوں کو اپنے گھر لے جاتے ہیں یا اسی حال میں نمایش کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔
اس قسم کے کھیلوں اور کاموں میں دو تین امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے:-

اول — ان کو بطور صناعی سکھلانے اور ان کی تکمیل کرنے کے لئے طلبہ کو مجبور نہ کرنا چاہیئے۔ طلبہ کو اپنی ساری کوشش اور دماغی قوی کو اس کام میں صرف کرنے کی ضرورت نہیں مبادا وہ درجۂ اعتدال سے گزر کر دوسرے اسباق نہ چھوڑ بیٹھیں اور ان کے سیکھنے سے دلچسپی نہ لیں۔

دوم — یہ چیزیں مختلف اور نئی ہوں، ایک ہی چیز کی مدت دراز تک مشق اور تکرار نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ خستگی پیدا کر کے ذہن کو کند اور تاریک بنا دیتی ہے! ہمیشہ اور ہر روز مشاغل کی نوعیت کو بدلتے رہنا چاہیئے تاکہ اس کے ذریعہ مشغولیت تازہ میں لذت تازہ حاصل کریں . . . .

ان کھیلوں اور ان دستی مشاغل کے فائدے اس سے زیادہ ہیں جن کا ہم

تصور کرتے ہیں۔ ایران کے بچّوں کے اسباب فلاح میں ایک سبب، الف با، اور دیگر اسباق کے پڑھانے میں جن غلط اصول اور مخالف فن طریقہ کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے، یہی ہے کہ وہ بیرون مدرسہ بہت سارے اسی قسم کے کھیل اور مشغولیتیں رکھتے ہیں اور یہ کام دماغی خستگی اور مدارس کے اصول تدریس کے نقائص کی ایک حد تک تلافی کرکے اُن کے ارتفاع کا موجب ہوتے ہیں۔ اسی خیال کے مدنظر، اگر یہی کام اور مشغولیتیں اندرون مدرسہ اسی آزادی وشوق کے ساتھ جس طرح کہ وہ باہر رکھتے تھے رکھیں گے تو اس سے ان کا بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ نیز اس انتظام کی صورت میں بچوں کے درمیان جذبہ رقابت، ترغیب وتشویق کا وسیلہ ہو جائے گا۔ غور وخوض، واقفیت اور تمیز سیکھیں گے استفادہ، انتظام اور تیزی کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہو جائیں گے . . . . . .
چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بڑے سے بڑے کام کا اندازہ کریں گے۔ اور اس طرح سے ان کی معلومات بڑھ جائے گی۔ صناعی کے ابتدائی کاموں سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرلیں گے۔ ان کے ہاتھ اور آنکھوں میں قوت آئے گی۔ وہ سب سے زیادہ اپنی محنتوں اور کاموں کے فوری نتیجہ کو دیکھیں گے اور اس نتیجہ کا حاصل کرنا ایک نوع کی لذت ومسرت اُن کے دل میں پیدا کردے گا۔ اور آرزو وشوق پڑھنے کا اُن کو مستعد وآمادہ بنادے گا۔

ابو المحاسن مرزا محسن خان متین
مدرس فارسی مدرسہ وسطانیہ دار الشفاء

مدارس تحتانیہ میں تعلیم حساب

از جناب ڈی سی بھوگلے صاحب مددگار عثمانیہ ٹریننگ کالج بلدہ

مدارس تحتانیہ میں دو مضمون حساب اور زبان دانی لحاظ اہمیت خصوصیت رکھتے ہیں اور نظام الاوقات میں اسی لحاظ سے ان دو مضامین کے لئے زیادہ وقت رکھا جاتا ہے۔

حسابی تعلیم دو اغراض سے دی جاتی ہے

(۱) دنیاوی کاروبار و بازاری لین دین میں حساب کی تعلیم سے مدد ملے۔

(۲) بچوں کی قوائے ذہنیہ اور قوائے تخیلہ وغیرہ کی تربیت ہو سکے۔

ان اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے حساب کی تعلیم (۱) بہ حیثیت فن اور (۲) بہ حیثیت علم دینی چاہیئے۔

(۱) تعلیم حساب بہ حیثیت فن۔

چونکہ حسابی تعلیم کی ضرورت روزمرہ کے کاروبار و بازاری لین دین میں ہوا کرتی ہے لہذا دنیاوی کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے حسابی اصول سے ناواقف رہنا کوئی بھی پسند نہیں کرے گا۔ حسابی تعلیم کی ضرورت صرف بہی کھاتہ رکھنے یا اُس کی جانچ یا تنقیح کرنے یا فرد حساب تیار کرنے ہی میں نہیں ہوا کرتی ہے۔ بلکہ اُس کی ضرورت تمام پیشوں مثلاً نجاری۔ خیاطی۔ معماری۔ خانہ داری وغیرہ میں جو دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ہر وقت پڑتی ہے۔ اگرچہ حساب کی تعلیم محض دنیاوی کامیابی یا روٹی کمانے کی غرض سے دیجاتی ہے۔ پھر بھی بچوں میں سوالات عجلت اور صحت کے ساتھ حل کرنے کی استعداد پیدا کرنا ضروری ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے حساب کے اُصول اس قدر واضح طور پر سمجھانے چاہئیں کہ طلبہ مستقبل قریب میں اپنی حسابی واقفیت کا استعمال نئی نئی مشکلات کو رفع کرنے میں کر سکیں۔ الغرض بچوں کو حسابی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ اپنے عمل کو خود سمجھکر دوسروں کو واضح طور پر سمجھا سکیں اور لین دین کے حساب تیز اور درستی کے ساتھ حل کر سکیں۔

(۲) حساب بہ حیثیت علم۔

حسابی تعلیم سے دنیوی فوائد کے ساتھ ساتھ بچوں کی عقل کی تربیت بھی ہو سکتی ہے۔ اور اُن کے قوت استدلال میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ سوال کا جواب صحیح ہے یا غلط۔ اگر غلط ہے تو کہاں غلطی ہوئی۔ یہ اپنی قوت استدلال کو کام میں لا کر بتا سکتے ہیں۔ حسابی تعلیم سے بچوں میں کسی بحث پر خیال جمائے رکھنے کی عادت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور انکی قوت متخیلہ کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ حساب میں بے انتہا مثالیں حل کرنی ہوتی ہیں جن میں قوت متخیلہ کو کام میں لانا پڑتا ہے۔

حساب کا تعلق روزمرہ کے کاروبار سے بہت کچھ رہتا ہے۔ آدمی کی زندگی اُس کا ماحول اُس کے پیشہ کی ضروریات اُس کی عملی میدان میں ترقی وغیرہ غرض کہ ہر چیز سے حساب کا تعلق ہوا کرتا ہے۔ مدرسین بعض وقت حسابی تعلیم دینے میں انسانی دلچسپیوں کو نظرانداز کرتے ہیں اور اس مضمون کو خشک اور دقیق بناتے ہیں جس کی وجہ سے بچوں میں حسابی تعلیم سے خوف پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ اس خیال سے کہ حساب ایک مشکل مضمون ہے گھبراتے ہیں۔ مدرسین ہمیشہ یہ خیال مدنظر رکھیں کہ بچے اکثر انہیں باتوں کو پسند کرتے اور انہیں میں دلچسپی لیتے ہیں جن کا تعلق ان کے مشاہدہ سے ہو۔ اس لئے مدرسین اپنے مضمون کو اس قدر دلچسپ بنائیں کہ بچے خود بخود اس مضمون کی تعلیم کی جانب راغب ہوں۔ حسابی تعلیم میں دلچسپی پیدا کر کے مدرسین طلبہ کو ذاتی کوشش کرنے کا موقعہ بہم پہونچائیں بچے کام کرنا پسند کرتے ہیں اور خالی بیٹھنا اُن کو نہیں بھاتا۔ لہٰذا اُن سے عملی کام لیا جائے۔ اُن کو ذاتی تجربہ اور کوشش سے کوئی قاعدہ اخذ کرنے کا موقع دیا جائے۔

اگر حسابی تعلیم ٹھیک طریقہ پر دی جائے تو طلبہ کو یہ مضمون خشک اور بے مزہ ہرگز نہ معلوم ہوگا۔ حسابی تعلیم میں ناکامیابی کے اسباب اکثر غلط طریقۂ تعلیم اور بچوں کی طبیعت سے ناواقفیت ہی ہو سکتے ہیں۔ بچے ہمیشہ نقل وحرکت کو پسند کرتے ہیں اور زندگی سے تعلق رکھنے والے کاموں میں اُن کو بہت دلچسپی رہتی ہے۔ جس شخص نے بچوں کو بہترین مدارس میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے اُس کا یہ خیال کبھی نہ ہوگا کہ حساب کے اچھے نتائج برآمد کرنے میں

بچے مزاحم ہوتے ہوں یا اُن کی طرف سے کسی قسم کی کمی کا اظہار ہوا ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اکثر طلبہ حساب میں اوسط درجہ تک بھی نہیں پہونچتے ؟ اِس کے وجوہات مختصراً ذیل میں ظاہر کئے جاتے ہیں۔

(۱) ابتدائی حالت میں غیر واجبی عجلت (۲) ناموزوں تحریص کا استعمال (۳) موزون آلات تعلیمی کی کمی (۴) ناقص طریقہ تعلیم۔

(۱) ابتدائی جماعتوں میں جس قدر وقت اسباق کے سمجھانے میں اور مشق کرانے میں دینا چاہیئے نہیں دیا جاتا۔ ایک بات پوری طور پر بچوں کی سمجھ میں آنے کے قبل ہی دوسری بات سمجھانے کی کوشش مدرسین کرتے ہیں اس عجلت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے گھبرا جاتے ہیں اور علم حساب کو بہت مشکل سمجھنے لگتے ہیں۔ بچہ جب گنتی سیکھتا ہے اور گنتی کرنے لگتا ہے تو عجلت سے کبھی کام نہ لیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ جب بچہ ایک چیز (گولی یا بیج یا دانے) بار بار گنتا ہے تو مدرس کو پریشانی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس بار بار کے گننے سے یہ سمجھے کہ بچہ اپنے کام کی جانچ کے خیال سے متعدد بار گننا ضروری سمجھتا ہے۔ ایسی صورت میں اُس پر غصہ کرنا ٹھیک نہ ہوگا عجلت سے کبھی پختگی حاصل نہیں ہوسکتی۔

(۲) بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے خیال سے یا اُن کو کام کرنے کی ترغیب دینے کی غرض سے کوئی تدبیر سوچتے وقت مدرس اس بات کا لحاظ رکھے کہ ذہین بچوں کے مقابلہ میں کند ذہن بچوں کے قویٰ کو نہ کچلا جائے خواہ وہ ہم عمر ہی کیوں نہ ہوں۔

کند ذہن بچوں کے قویٰ کو دبانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن میں پست ہمتی پیدا ہوگی اور اُس مضمون میں کوشش کرنا وہ ترک کردیں گے۔ چند طالب علم بہت ہی آہستگی سے ترقی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بالکل صبر سے کام لیا جائے۔ اُن پر غصہ کرنے سے یا اُن کو متنبہ کرنے سے وہ ہمت ہار بیٹھیں گے۔ اور اُن میں خود اعتمادی باقی نہیں رہے گی۔ اُن کو متوجہ کرنا اور اُن سے سوالات حل کرانا مشکل ہوگا

(۳) ابتدا میں مجرد اعداد کا تصور دلانے کے لئے اور نیا قاعدہ بتانے کے لئے ٹھوس اشیاء کا استعمال سخت ضروری ہے محض لفظی معلومات بچوں کے ذہن میں ٹھیک

طور پر نہیں اُتر سکتے ہیں۔ اشیاء کی مدد اور اُن کے ذاتی تجربہ سے نئی بات بچوں کی سمجھ میں جلد آجاتی ہے۔ شروع میں گنتی سکھانے کے لئے مختلف اشیاء کا استعمال کیا جائے صرف یہ کہنا کہ ایک کا ہندسہ ایسے (۱) لکھا جاتا ہے اور دو کا ایسے (۲) لکھتے ہیں زبانی کہنا یا اُن کو تختہ سیاہ پر بتانا کسی طرح کافی نہیں۔ اس سے بچوں کی دماغی تربیت تو ہوئی نہیں سکتی اور مجرد اعداد کا تصور بھی چھوٹے بچوں کو ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا اعداد کا تصور دلانے کے لئے۔ پہاڑے بتانے کے لئے نیا قاعدہ سمجھانے کے لئے یا کسی نئی شکل کو رفع کرنے کے لئے بہت سے سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مدرس سامان نہ ملنے کی وجہ سے سبق کو خراب نہ کرے۔ اپنا تیار کیا ہوا سامان بازاری قیمتی سامان سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اعداد کے تصور کے لئے مٹی کی گولیاں۔ سیٹھے۔ بیج۔ اناج کے دانے وغیرہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔

(۴) بعض وقت ناموزون طریقہ اختیار کرنے سے اکثر طلبہ کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے وقت واحد میں بہت سا پڑھانے یا کسی قاعدہ کا تصور دلائے بغیر اُس کو حفظ کرانے سے کوئی بات ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔ اس سے بچے پریشان ہوتے اور آگے چل کر کاہل بنتے ہیں اس کے علاوہ اصول یا قاعدہ کو ٹھیک طور پر سمجھے بغیر رٹنے کی طرف مائل ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی دماغی تربیت بگڑ جاتی ہے۔ سوالات کی ناموزوں ترتیب بھی حسابی تعلیم میں ناکامی کا سبب ہو سکتی ہے۔ مشقی سوالات کی ترتیب نہایت احتیاط کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ حسابی تعلیم کی ناکامی کے وجوہات بتانے کے بعد مدارس تحتانیہ میں حسابی تعلیم عملی پیمانے پر کس طرح دی جا سکتی ہے اس کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مدارس تحتانیہ میں حساب پڑھانے کا خاص مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ طلبہ روزمرہ لین دین کے متعلق کام سرانجام دینے کے قابل ہو جائیں۔ روزمرہ کے کاموں میں ہمیں سکے وزن۔ طول۔ وقت وغیرہ کے پیمانوں سے کام پڑتا ہے اس لئے اُن کا جاننا ضروری ہے ہر موقعہ پر جمع۔ تفریق۔ ضرب۔ تقسیم کے عمل کرنے پڑتے ہیں اس لئے چاروں ابتدائی قاعدے جاننا ضروری ہیں کاشتکاروں کو زراعت پیشہ لوگوں کو پیداوار کا اندازہ لگانے اور زمین کی خرید و فروخت میں زمین کی سطح کا اندازہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے

پیمائش کا جاننا ضروری ہے۔ روپیہ کی لین دین میں سود کے حساب لگانے ہوتے ہیں اس لئے سود کے قاعدے سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ زبانی سوالات حل کرنے میں پہاڑوں کے ذریعہ جواب جلد نکل سکتا ہے لہذا پہاڑوں کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ مندرجہ بالا اُمور کی واقفیت سے معمولی طور پر ہر ایک شخص کا کام چل سکتا ہے۔

لہذا تحتانیہ مدارس میں چار دل ابتدائی قاعدے ضربی اور کسری پہاڑے سکے اوزان۔ پیمائش۔ وقت وغیرہ کے پیمانے۔ مرکب قاعدے۔ کسر کے قاعدے (آسان سوالات) سود۔ نفع نقصان وغیرہ کی تعلیم صحیح اُصول پر دی جائے تو بعد ختم نصاب جماعت چہارم بچے روزمرہ کے معمولی سوالات حل کر سکیں گے۔ ہر ایک قاعدہ بچوں کی کوشش سے اخذ کرایا جائے اور اُن سے عملی کام کرایا جائے تو اُن کی ذہنی قوائے کی تربیت بھی ہوگی۔ طلبہ کو سب سے زیادہ مشکل ابتدائی چار قاعدوں کے سیکھنے میں پیش آتی ہے۔ اگر ان قاعدوں کا تصور پختہ طور پر کرا دیا جائے اور اُن کی بخوبی مشق بھی ہو تو اور قاعدوں کا حاصل کرنا سیکھنا آسان ہوگا۔ مفرد قاعدوں کی نسبت مرکب قاعدوں کا سیکھنا آسان ہے۔

عملی تعلیم سے مراد یہ ہے کہ جب نیا قاعدہ یا اُصول بچوں کو سمجھانا ہو تو اُس میں بچوں کی ذاتی کوشش کا خیال رہے جہاں تک ہو سکے ان کو ذاتی تجربہ اور سعی سے علم حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے۔ محض لفظی معلومات کے بہم پہنچانے سے تعلیم کا مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ بچوں کی تعلیم میں زیادہ تر اُن اشیا کے استعمال کی ضرورت ہے جن سے وہ مانوس ہوں۔ جن کو وہ دیکھ بھال سکیں۔ ہاتھ میں لے کر اچھی طرح محسوس کر سکیں اور مشاہدہ کر سکیں۔ مدرسہ آنے سے پیشتر ہی سے بچے اعداد کے نام زبان سے ظاہر کرتے ہیں لیکن اُس عدد کا خیال اُن کو بالکل نہیں ہوتا دوسروں کو اعداد کہتے ہوئے سُن کر محض تقلید میں ایک دو چار آٹھ بارہ وہ بھی کہہ دیتے ہیں لہذا گنتی سکھاتے وقت مختلف اشیا کا استعمال جن سے وہ واقف ہوں کیا جائے اُن سے مختلف چیزوں کی گنتی کرائی جائے اور اعداد کا تصور اور صحیح نام بتایا جائے۔ بعض بچے ایک ایک چیز اٹھا کر ایک دو تین چار کہتے

اور آخری گنی ہوئی چیز ہی کو وہ چار سمجھتے ہیں حالانکہ وہ مجموعہ چار چیزوں کا ہے یہ اُن کا خیال نہیں ہوتا۔ لہٰذا صحیح گنتی اُنہیں کے تجربہ سے کروائی جائے اُن کی غلط فہمی عملی طریقہ سے رفع کی جائے۔ کوئی عدد چیزوں یا افراد کے مجموعہ کو ظاہر کرتا ہے یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرائی جائے۔ اور عملی طور پر جانچ بھی کرلی جائے مثلاً گیند کو چار مرتبہ اچھالو اسی دیوار سے اُس دیوار تک تین مرتبہ دوڑو۔ پانچ مرتبہ کودو۔ اس طرح اُن کا کھیل بھی ہوتا ہے اور تعلیم بھی ہوتی ہے۔ اعداد کا تصور پختہ طور پر ہوتے ہی اشیاء محسوسہ کا استعمال ترک کردیا جائے کیونکہ آلات تحصیل علم کا ذریعہ ہیں مقصد نہیں ہیں۔

ابتدائی چار قاعدے اور پہاڑے سمجھانے میں اشیاء محسوسہ کا استعمال بغرض تفہیم ضروری ہے جب کوئی بات بچوں کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھانے کے لئے ٹھوس اشیا توضیحات وغیرہ سے کام لیا جائے۔ مگر کسی قاعدہ کا تصور ہونے کے بعد ہر سوال کے لئے چیزوں کا استعمال مناسب نہ ہوگا۔ نیا قاعدہ یا اُصول بچوں کی سمجھ میں آنے کے بعد وہ اپنی قوت متخیلہ اور استدلال کو کام میں لاکر سوالات حل کیا کریں۔ ہر سوال سمجھانے کے لئے مقرون اشیا کا استعمال کرنا گویا بچوں کا وقت ضائع کرنا ہے اور اُن کی قوائے تربیت کو روکنا ہے۔

تھوڑے عرصہ میں بہت سا کام کرنے کے خیال سے اکثر مدرسین حسابی قاعدے بچوں کو خود ہی بتاتے ہیں اور اس قاعدہ پر چند سوالات دے کر جلد ہی دوسرا قاعدہ بتانا شروع کردیتے ہیں ایسی تعلیم سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا خاص خاص چھوٹے چھوٹے زبانی سوالات متعدد دے کر اُن کے طریقہ عمل سے کوئی ایک قاعدہ یا اُصول بچوں ہی کے کوشش سے اپنی نگرانی میں نکلوایا جائے۔ مدرس اُن کی صرف رہنمائی کرے تعلیم طلبہ کے تصورات اور تجربات کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا مدرس بچوں میں یہ عادت پیدا کرے کہ وہ حتی الامکان مشکلات کو خود حل کریں اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو۔

حسابی تعلیم میں اس بات کا خیال رہے کہ جو سوالات بچوں کو حل کرنے کے لئے دئے جائیں۔ اُن میں سے اکثر ایسے ہوں جو روزمرہ بازاری لین دین سے یا دنیاوی

واقعات سے تعلق رکھتے ہوں تاکہ بچوں کو یہ معلوم ہو کہ علم حساب کا دنیا سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے اور محض امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے طلبہ ایسے سوالات میں جن سے وہ مانوس ہیں بہت دلچسپی لیتے ہیں مثلاً (۱) والد نے بڑے بیٹے کو ۲ لڈو اور چھوٹے کو ۶ لڈو دیے تو بتاؤ کہ چھوٹے بیٹے کو کتنے لڈو زیادہ ملے یا بڑے بیٹے کو کتنے کم ملے (۲) تقسیم انعامات کے روز ایک جماعت کے پہلے نمبر کے طالب علم کو ۳ کتابیں دوسرے کو ۲ اور تیسرے کو ایک کتاب انعام میں ملی تو بتاؤ کہ اس جماعت میں کل کتنی کتابیں تقسیم ہوئیں وغیرہ ایسے سوالات جن کا دنیا میں عام طور پر کچھ کام نہیں پڑتا حل کرنے کے لئے ہرگز نہ دئے جائیں مثلاً ۷۸ تا ۱۵۶ پیسے کے روپیے بناؤ یا ۷۶۸۶۲ چھٹانک کے سیر بناؤ۔ اس قسم کے خشک سوالات میں بچے کبھی دلچسپی نہیں لیں گے۔ کیونکہ اس طرح کی تحویل کا کام کسی معمولی شخص کو نہیں پڑتا۔ ایسے سوالات سے طلبہ کے ذہن پر بیجا بار پڑتا ہے اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ لہذا جہاں تک ہو سکے سوالات ایسے دئے جائیں جن کا تعلق عملی دنیا سے ہو۔ مثلاً تانگہ کا کرایہ یا ریل کا کرایہ کسی ایک مقام سے دوسرے مقام تک دئے ہوئے شرح سے معلوم کرنا ریلوے کا نظام الاوقات (ٹائم ٹیبل) دیکھ کر یہ دریافت کرنا کہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو پہونچنے کے لئے کتنا وقت صرف ہوگا زمین کا محصول۔ اناج شکر، دودھ وغیرہ کا نرخ معلوم کر کے مطلوبہ مقدار کی قیمت دریافت کرنا محض کتابی سوالات دینے کی بجائے اس قسم کے سوالات اگر دئے جائیں تو بچوں کے حق میں مفید ثابت ہوں گے اور قاعدہ اور عمل دونوں پر حاوی ہوں گے۔

اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ مدرس کا خود تیار کیا ہوا سیدھا سادہ سامان بہ نسبت بازاری اور قیمتی سامان کے زیادہ موثر ہوتا ہے البتہ تحتانیہ مدرس کی غربت کا لحاظ کرتے ہوئے وہ سررشتہ تعلیمات کی امداد کا محتاج رہے گا۔ تاہم مندرجہ ذیل سامان آسانی اور کفایت شعاری سے تیار کیا جا سکتا ہے۔

گنتی سکھانے کے لئے مٹی کی گولیاں۔ ریشے۔ چنے یا اناج کے دانے مختلف رنگوں میں رنگے ہوئے سیتا پھل کے بیج وغیرہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔

جمع تفریق سکھانے کے لئے صندوقچہ کی بجائے زمین یا تختہ پر اکائی۔ دہائی سیکڑہ وغیرہ کے خانے کھینچکر کام لیا جاسکتا ہے یا مقوے کا صندوقچہ بھی تیار کیا جاسکتا ہے۔ بکلے مثلاً پائی۔ پیسہ آنا۔ روپیہ جلد میسر ہو سکتے ہیں بعض جگہ سکوں کے تصور کے لئے نقلی سکے استعمال میں لاتے ہیں۔

گز۔ فٹ۔ وغیرہ کا تصور دلانے کے لئے کپڑہ یا فیتہ کا گز یا فٹ تیار ہو سکتا ہے اوزان کا تصور دلانے کے لئے پتھر کے بٹ مٹی اور کاغذ کی تیار کی ہوئی ترازو کام دے سکتی ہے مدرسہ میں نقلی دکان کھول کر بچوں سے تجارتی حسابات حل کرائے جاسکتے ہیں۔

غرضکہ مدرس غور اور فکر سے ضروری سامان ذاتی کوشش سے اور بچوں کی مدد سے بنا سکتا ہے۔

پیمانوں کا تصور دیتے وقت صرف زبانی تفہیم کافی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً ۵ تولہ کا ایک چھٹانک۔ ۴ چھٹانک کا ایک پاؤ ۴ پاؤ کا ایک سیر یہ صرف تختہ سیاہ پر لکھ کر یا زبانی بتا کر بچوں سے حفظ کرانا مفید نہیں ہوتا اس طرح کی تعلیم سے بچوں کو ٹھیک تصور اوزان کا نہیں ہوگا۔ جب بچوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ تولہ کس قدر ہوتا ہے وہ چھٹانک۔ پاؤ سیر۔ سیر کیا چیز ہے۔ کیا جانیں گے۔ لہذا جن اوزان کے متعلق تصور دینا ہو وہ اُن کو بتائے جائیں اُن کے ہاتھ میں دئے جائیں تاکہ بچے اُن کو اچھی طرح دیکھیں بھالیں اور ہر وزن کا احساس کر کے تجربہ سے یہ معلوم کر سکیں کہ بہ نسبت تولہ کے چھٹانک وزن دار ہوتا ہے اور پاؤ سیر چھٹانک سے بھی زیادہ وزن دار ہوتا ہے عملی طور پر چند چیزیں تلوا کر چھٹانک اور پاؤ سیر کی نسبت بتادی جائے اس طرح پیمانہ بچے خود بخود تیار کر سکیں گے کہ ۵ تولہ ایک چھٹانک ۴ چھٹانک ایک پاؤ کے ۴ پاؤ۔ ایک سیر وغیرہ۔ ذاتی کوشش سے عملی طور پر تیار کیا ہوا پیمانہ بچے ہمیشہ کے لئے یاد رکھ سکیں گے۔ نقلی معلومات کے بھول جانے کا اندیشہ ہے چھوٹے بچوں کے ذھن میں کوئی بات بلا عملی کام کے زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکتی۔

اس طرح وقت کا پیمانہ بتانا ہو تو جیبی گھڑی جس میں سکنڈ بتانے والی سوئی ہو بچوں کے سامنے رکھی جائے۔ اُس گھڑی کی طرف دیکھنے کا موقعہ ہر ایک کو دیا جائے۔ بعد

میں سکنڈ کی سوئی کی گردش دکھا کر اُس کے ذریعہ منٹ کا تصور دلا دیا جائے۔ تین مختلف سوئیوں کا کام بتایا جائے اور مشاہدہ کے ذریعہ اُن سے پیمانہ بنوایا جائے۔

اسی طرح گز۔ فٹ انچ وغیرہ کا تصور بھی عملی طور پر دلا دیا جائے جب انچ۔ فٹ۔ اور گز کا کافی تصور نہ ہو فرلانگ۔ میل وغیرہ کا تصور اُن کو نہیں ہو سکتا۔ فرلانگ اور میل وغیرہ کا تصور دلانے کے لئے ٹیپ کی ضرورت بھی نہیں اور وہ ناممکن بھی ہے۔ یہ باتیں بچے قوت متخیلہ کو کام میں لاکر معلوم کر سکتے ہیں۔

الغرض کوئی پیمانہ بتانا ہو تو متعلقہ چیزیں پیش کی جائیں، اُن کا مشاہدہ کرایا جائے تجربہ کرایا جائے تاکہ پیمانہ کا تصور پختہ ہو جائے۔ پیمانوں کی مشق کے لئے عملی کام بھی بچوں سے لیا جائے۔ مثلاً میز کا طول۔ عرض۔ ناپنا۔ فرش کی لمبائی چوڑائی دریافت کرنا۔ بچوں کا قد ناپنا۔ اس طرح عملی کام کرانے سے پیمانہ کا استعمال کس طرح اور کس موقعہ پر کیا جاتا ہے۔ اس کا علم ہوگا محض کتابی سوالات حل کرانے سے بچوں کے عملی معلومات میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔

کسر کا تصور دلاتے وقت بھی $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{4}$، $\frac{3}{4}$، $\frac{1}{8}$، $\frac{7}{8}$ وغیرہ کی تفہیم کاغذ کو تہ کرنے سے یا کٹوانے سے دی جا سکتی ہے مثلاً ایک گول کاغذ لیا جائے (جس کی شکل روٹی کی جیسی ہو) اُس کے دو مساوی حصے کاغذ کو تہ کر کے یا کٹوا کر کئے جائیں اور بچوں سے سوال کیا جائے کہ اُن دو حصوں میں کا ایک حصہ کیا ظاہر کرتا ہے روٹی کی شکل سے مشابہت ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ بچے جواب دیں گے کہ وہ حصہ آدھا کہلاتا ہے اس کو بتایا جائے کہ کسر میں $\frac{1}{2}$ سے ظاہر کرتے ہیں اسی طرح اگر ایک چیز کے ۴ مساوی حصے کئے جائیں اور اُن میں سے ایک حصہ لیا جائے تو وہ حصہ پاؤ کہلاتا ہے اور کسر میں $\frac{1}{4}$ ظاہر کیا جاتا ہے روپیہ کی دو اٹھنّیاں ہوتی ہیں۔ ایک اٹھنی آدھا روپیہ کہلاتی ہے ایک روپیہ میں ۴ چونیاں ہوتی ہیں ایک چونی پاؤ روپیہ کہلاتی وغیرہ کسرات ظاہر کرنے والا تختہ بچوں سے بنوایا جائے اور مختلف کسرات کا مقابلہ تختہ مذکور سے کرایا جائے۔ کسرات کا تصور دلانے میں مختلف رنگین پٹیاں بھی استعمال میں لائی جائیں تو مناسب ہوگا۔

رقبہ کے سوالات حل کراتے وقت بچوں سے ایسی چیزوں کا رقبہ دریافت کیا جائے جو اُن کے پاس موجود ہوں مثلاً سلیٹ، کتاب کی سطح کاغذ وغیرہ جن کی لمبائی اور چوڑائی وہ خود ناپ کر معلوم کریں۔ اور رقبہ نکال سکیں اس طرح عملی کام کرنے میں اُن کو دلچسپی ضرور ہو گی۔ اس کے بعد جب ایسی چیزوں کا رقبہ نکالنا ہو جو موجود نہ ہوں تو اُن کی شکل کسی پیمانہ پر نکال کر رقبہ دریافت کیا جائے الغرض عملی کام اور روزمرہ کاروبار کے سوالات کے ذریعہ بچوں کو حسابی تعلیم دینے سے بچوں کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ حساب دُنیا سے تعلق رکھنے والا مضمون ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسابی تعلیم کی نسبت وہ کبھی نفرت ظاہر نہیں کریں گے بلکہ اُس کی تحصیل میں دلچسپی کے ساتھ آمادگی ظاہر کرنے لگیں گے بشرطیکہ تعلیم باقاعدہ ہو اور اُستاد مستعدی اور دلچسپی سے کام کرے۔

عجلت اور صحت کے ساتھ سوالات حل کرنے کے لئے روزانہ چند منٹ زبانی مشق کے لئے محفوظ رکھے جائیں۔ بعض مدرسین حساب پڑھاتے وقت زبانی حساب اور تحریری حساب دونوں کو الگ الگ تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ حساب کی الگ الگ شاخیں نہیں ہیں جو بچہ زبانی سوالات حل کرنے میں ناقص پایا جاتا ہے وہ تحریری سوالات میں بھی کمزور ہوتا ہے۔ حسابی مہارت کی بنیاد زبانی حساب سے واقفیت ہونے پر ہی ہوتی ہے۔

حسابی تعلیم میں زبانی حساب کی اہمیت تین اغراض سے ہوتی ہے (۱) اعادہ کے لئے (۲) نیا قاعدہ یا اُصول سمجھانے کے لئے (۳) روزمرہ سوالات عجلت اور صحت کے ساتھ حل کرنے کی مشق کے لئے لہذا زبانی حساب کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے سابقہ واقفیت کی جانچ کے لئے زبانی سوالات بہت کارآمد ہوتے ہیں ان سوالات کے ذریعہ اس کا علم ہوتا ہے کہ بچہ کی معلومات کیا ہیں نیا قاعدہ یا اُصول سمجھانے کے لئے خاص خاص مثالیں ایک ہی طرز کی دی جاکر اُن کے طریقہ عمل سے ایک عام بات اخذ کی جاتی ہے۔ اس کو استقرائی طریقہ (Inductive Method) کہتے ہیں جس سے نیا قاعدہ یا اُصول بچوں کی کوشش سے اور مدرس کی رہنمائی سے اخذ کرایا جاتا ہے۔ نئے قاعدہ کا تصور ہونے کے بعد اُس قاعدہ کا استعمال مختلف سوالات کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ روزمرہ بازاری

لین دین کے حساب اکثر زبانی کرنے ہوتے ہیں۔ تجارت پیشہ لوگ کاغذ پنسل لیکر حساب نہیں کرتے۔ فوراً زبانی حساب کرکے آپ کو کل قیمت بتا دیتے ہیں۔ اگر ہم ہر وقت مثلاً ترکاری خریدتے وقت دودھ کا حساب لگاتے وقت کسی مزدور کی مزدوری دیتے وقت کاغذ پنسل کا استعمال کرتے رہیں تو ہماری تعلیم بے سود ٹھیرے گی اور معمولی حساب کے لئے زیادہ وقت صرف کرنا تعلیم کا نقص ظاہر کرے گا۔ لہذا مدارس میں زبانی حساب کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ زبانی حساب کراتے وقت تمام جماعت کو متوجہ رکھنا چاہیئے پُرانے زمانہ کے مدارس میں زبانی تجارتی حساب پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اس کی اہمیت مدنظر رکھ کر اُس کو رائج رکھنا نہایت ضروری ہے اگر زبانی حساب تیزی اور صحت کے ساتھ حل کرنے کی عادت ڈالی جائے تو تحریری کام بھی عجلت اور صحت کے ساتھ ہوسکتا ہے پُرانے طریقوں کو بالکل ہی ترک کر دینا مناسب نہیں پُرانے طریقے جو اچھے ہوں اُن کے قایم رکھنے میں کچھ بھی نقصان نہیں اگر اُن کو جدید اُصول سے رونق دی جائے تو بچے زیادہ مُستفید ہوسکتے ہیں قدیم زمانہ میں قاعدہ یا اُصول مُدرسین خود ہی زبانی بتاتے تھے اور اُن قاعدوں کا استعمال بچوں سے سوالات کے حل کرانے میں کیا جاتا تھا حالانکہ بچے اُن قاعدوں یا ضابطوں (Formulae) کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھتے تھے۔ زمانہ حال میں تربیت یافتہ مُدرسین کا فرض ہے کہ وہ پہلے استقرائی طور پر خاص مثالوں کو مشق کرکے بچوں کی کوشش اور کچھ اپنی امداد سے اُنہیں سے قاعدہ اخذ کرائیں اور اُس قاعدہ کا استعمال سوالات کے حل کرانے میں کرایا جائے تا کہ اُصول قاعدہ یا ضابطہ سمجھانے کے بعد زبانی سوالات بچے آسانی سے اور صحیح طور پر حل کرسکیں۔ لہذا اگر تو جدید اُصول پر سمجھائے جائیں اور زبانی مشق پرانے طریقہ پر رائج رکھی جائے تو حساب میں بچے کمزور نہ رہیں گے استقرائی طریقہ (Inductive Method) پر قاعدہ سمجھانے کے بعد زبانی سوالات عجلت اور صحت کے ساتھ حل کرانے کے گر سمجھانا نامناسب نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک درجن یعنے ۱۲ چیزوں کی قیمت آنوں میں دی ہوئی ہو تو ایک چیز کی قیمت اتنی ہی پائیاں ہوں گی۔ کیونکہ درجن اور ایک میں جو نسبت ہے وہی ایک آنہ اور ایک پائی میں ہے۔ یہی قاعدہ

تولہ کی قیمت سے ماشہ کی قیمت دریافت کرتے ہیں یا سال اور ماہ کی صورت میں عاید ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایک سیر کی قیمت روپیوں میں دی ہوی ہو تو ایک چھٹانک کی قیمت اتنے ہی آنے ہو گی کیونکہ ایک سیر اور ایک چھٹانک میں جو نسبت ہے وہی نسبت ایک روپیہ اور ایک آنہ میں ہے۔ اس قسم کے مختصر گُر زبانی حساب کے حل میں بہت کارآمد ہوتے ہیں بشرطیکہ پہلے وہ اصول جس پر یہ گُر مبنی ہوں بچّوں کو اچھی طرح سمجھائے جائیں اور اُن کے ذھن نشین کرائے جائیں

اگر اس طرح عملی طور پر حسابی تعلیم دی جائے تو یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ بچّوں کے سرپرستوں سے حسابی تعلیم کی نسبت بہت کم شکایات وصول ہوں گی اور طلبہ بھی بہت کچھ اس مضمون سے مستفید ہوسکیں گے دینوی کاروبار کے حسابات حل کرنے میں دِقّت محسوس نہ ہو گی اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی ذہنی قوتوں کی بھی تربیت ہو گی۔

تعلیم تاریخ

اگر ہم کسی تعلیم تاریخ کی کتاب کو اٹھا کر دیکھیں تو شروع ہی میں ہم کو تاریخ پڑھانے کے کم ازکم تین مقاصد نظر آئیں گے۔

(۱) تاریخ کی تعلیم سے اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔

(۲) تاریخ کی تعلیم سے قوائے ذہنی میں پختگی و استواری پیدا ہوتی ہے۔

(۳) تاریخ کی تعلیم اس لئے بھی ضروری ہے کہ بچوں کو ماضی کے حالات معلوم کرکے حالات حاضرہ کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ اور بزرگوں کے قدم بہ قدم چلنے کی ہدایت ہو۔

لیکن اگر ہم کسی ہندوستانی مدرسہ کے معلم سے دریافت کریں کہ تاریخ مدارس میں کس غرض سے پڑھائی جاتی ہے تو وہ بلاشبہ یہی جواب دے گا کہ ہم بچوں کو تاریخ اس لئے پڑھاتے ہیں کہ وہ مقررہ کتاب میں جو واقعات و کوائف درج ہیں ان کو ازبر کرلیں اور امتحان میں کامیاب ہوجائیں۔

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ ہمارے مدارس میں تاریخ کے لئے ہفتہ میں ۳ گھنٹے محض اس واسطے نظام الاوقات کا لازمی جزو ہیں کہ تاریخ کا مضمون شریک نصاب ہے۔

مغربی تعلیم کی ترویج کے پہلے ہندوستان میں دو قسم کی درسگاہیں تھیں ایک ہندو دھرم شالے اور دوسرے مسلمانوں کے مکتب۔ دونوں میں زیادہ تر مذہبی تعلیم ہوتی تھی۔ اور دونوں میں تاریخ کو جن معنوں میں تاریخ کو ہم سمجھتے ہیں کچھ اہمیت نہ تھی۔ لیکن جب راجہ رام موہن رائے نے مغربی تعلیم کیلئے ہاتھ پیر مارنا شروع کیا اور پادریوں نے اس کی ہم نوائی کی اور لارڈ میکالے نے نہایت شد و مد سے ملکی طریقہ تعلیم کے خلاف جہاد کیا تو آخر کار مغربی وضع کے مدارس کھلے ان مدارس میں ملکی خصوصیات کی مطلق رعایت نہیں کی گئی بلکہ انگلستان کے مدارس کا نصاب جوں کا توں لاکر بنگال کے انگریزی مدرسوں میں رائج کر دیا گیا تاریخ جو خود

انگلستان میں بڑی جدوجہد وکشاکش سے مدرسوں کے نصاب میں گھسی تھی یہاں آپ سے آپ داخل نصاب ہوگئی۔ نہ نصاب رکھنے والوں نے کبھی یہ سوچا کہ آخر تاریخ کی تعلیم کا مُدعا کیا ہونا چاہیے اور نہ کبھی مدرسین کو موقعہ ملا کہ وہ تاریخ کو سوائے امتحان میں کامیاب کرانے کے کسی اور مقاصد کے لئے پڑھائیں۔ اسی طرح صدیاں گذر گئیں، مغرب میں تاریخ کے متعلق زاویۂ نگاہ میں تبدیلیاں ہوئیں نئے اغراض ومقاصد کے تحت نئی کتابیں لکھی گئیں، تاریخ بادشاہوں اور سیاسی چالوں کی داستان، لڑائیوں اور فرمانوں کی فہرست سے ترقی کرکے ارتقاءِ تمدن کا مرقعہ بن گئی لیکن ہمارے یہاں اس کی وہی حالت اور اس کی تعلیم کی وہی ایک غرض رہی جو تقریباً سو سال پیشتر تھی۔ یعنی کامیابی امتحان۔

نتیجہ یہ ہے کہ اخلاقی تربیت تو درکنار، برسوں کی شبانہ روز محنت و دماغ سوزی کے بعد بھی نہ بچوں میں قومی ولولہ پیدا ہوتا ہے اور نہ حُبِ قوم کا جذبہ نشو ونما پاتا ہے۔ تاریخ ان کے لئے خشک و بے مزہ مضمون ہے۔ بھارت ماتا کے سپوتوں کے کارنامے ان کے دلوں میں گرمی نہیں پیدا کرتے، آریہ ورت کے سورماؤں کا خونچکاں تذکرہ اُن کی غیرت ملی کو نہیں ابھارتا نہ وطن سے محبت نہ ابنائے وطن سے سروکار ہوتا ہے۔ نہ تاریخی سوانح اور اقوام کے عروج وتنزل کے اسباب وعلل پر غور کرنے کی عادت اور نہ اُن سے عبرت لینے کی اہلیت آتی ہے۔

اگر ہمارے بچوں کو دنیا میں تاریخ کی تعلیم سے کوئی فائدہ پہونچا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ رٹ لینے کی خاصی عادت پڑ جاتی ہے اور بس۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس طرح سے تاریخ کی تعلیم کو مفید اور سودمند بنائیں یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ہم تاریخ میں کیا پڑھائیں (۲) اور کس طریقہ سے پڑھائیں۔

پہلے سوال کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام ہندوستانی مدارس میں سرکاری طور پر نصاب مقرر ہے اور اسی مقررہ نصاب کی تکمیل معلم تاریخ کا فریضہ ہے۔ ہمارے یہاں تاریخ کی تعلیم جماعت چہارم سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے بچوں کو اپنے ملک کی تاریخ پڑھنا چاہیئے تاکہ اپنے وطن کی موجودہ وگذشتہ حالت معلوم ہو، اپنے بزرگوں کے

کارناموں سے واقفیت ہو اور رفتہ رفتہ قوم نے تمدنی و معاشرتی ترقی کے جو مراحل طے کئے ہیں وہ بھی معلوم ہوں۔ اس لئے چہارم میں تاریخ دکن پڑھائی جاتی ہے اور طبقہ وسطانیہ کی تین جماعتوں میں تاریخ ہند مقرر ہے۔ فوقانی جماعتوں میں پھر ہندوستان کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ اور تاریخ انگلستان شریک نصاب ہے۔

گو مقررہ نصاب سے سرمو ہٹنے کی گنجائش نہیں لیکن ہم دو تین باتوں کی طرف توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اولاً یہ کہ جب بچے چہارم میں ترقی پا کر آتے ہیں تو تاریخی معلومات سے معرّی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ بیحد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نیچے کی جماعتوں میں دکن کے بزرگوں، بہادروں اور مدبّروں کے مختصر حالات ذہن نشین کرادے جائیں۔ یہ حالات قصہ کے پیرایہ میں بتائے جائیں اور ہر ایک کی کسی نمایاں خصوصیت پر زور دیا جائے۔ اس سے نہ صرف اپنے بزرگوں کے سچے کارناموں سے خوں میں جوش آئے گا اور ان کارناموں کی ریس کرنے کی کوشش سے اخلاقی تربیت ہوگی بلکہ ملک کی تفصیلی داستان سمجھنے کے لئے ایک مضبوط بنیاد ہوگی جس پر مستحکم عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔

دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ وطن کی تاریخ کا آغاز و انجام چہارم میں ہو جاتا ہے اور بقیہ پانچ سال تک وہ ہندوستان کی عام تاریخ کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے بچوں کے دلوں میں وطن کی جو محبت و عظمت قائم ہونا چاہیئے وہ نہیں ہوتی یہ کوتاہی اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ موجودہ کتابوں کی جگہ جو شمالی ہند کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں دوسری کتابیں تیار کرالی جائیں جو ہندوستان کے عام اہم واقعات کے ساتھ ساتھ دکن کی حالات پر خاص طور پر زور دیں آخر میں ایک تجویز پیش کرنے کی جرأت کی جاتی ہے میٹرک میں تاریخ ہند کے ساتھ ساتھ انگلستان کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ انگلستان کی تاریخ نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ ہم کو حاکم قوم کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ انگلستان کی طرز حکومت دنیا بھر کے لئے شمع ہدایت ہے اور موجودہ سیاسی حالات کو خاطر نشین کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ان کی ابتدا اور درمیانی مدارج کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ ساتھ ہی اکثر حضرات کو اتفاق ہوگا کہ دور جدید کے پہلے بہت سے امور ایسے ہیں جن سے ہندوستانی

طالب علم کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ اور ان واقعات و حالات کو یاد کرنے پر زور دینا وقت و محنت برباد کرنا ہے۔ اگر کوئی کتاب تاریخ انگلستان ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی جائے تو بہت سا وقت اور محنت بچائی جاسکتی ہے۔ اور یہ وقت و محنت (جس کی مقدار تین سالہ مدت تعلیم ہونے کی صورت میں بڑھ جائے گی) جاپان کے دورِ جدید کے مطالعہ میں صرف کی جائے تو فائدہ سے خالی نہیں گذشتہ چالیس سال میں جاپان نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اور جس طرح وہ ایک گوشہ نشین، جاہل و کاہل قوم سے بڑھتے بڑھتے دنیا کی بڑی طاقتور سلطنتوں کے ہم پلہ اور صنعتی و حرفتی میدان میں جرمنی و امریکہ کے برابر ہوگیا ہے اور تہذیب و تمدن کے معیار میں کسی سے کمتر نہیں ہے وہ ایسے کارنامے ہیں جو ہندوستانی طلباء کے لئے۔ خصوصاً اس لئے کہ جاپان بھی ہندوستان کی طرح برّاعظم ایشیاء کا ایک ملک ہے۔ حوصلہ زا و ولولہ انگیز ثابت ہوں گے۔

گو نصاب تاریخ مقرر ہے اور درسی کتابیں ہمارے بس کی نہیں لیکن موجودہ حالات میں اور موجودہ کتابوں کے ساتھ بھی مدرس صرف اپنے طریقہ تعلیم سے بہت کچھ کرسکتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس طریقہ پر تاریخ کی تعلیم دیں جس سے کتابوں کی کوتاہی اور نصاب کی خامیوں کی تلافی ہوسکے اور تعلیم تاریخ سے جو فائدہ پہونچنا چاہیئے وہ پہونچے اور اس کی تعلیم کی جو غرض و غایت ہے وہ پوری ہو۔

طریقہ تعلیم کے متعلق کچھ لکھنے کے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ ان بچوں کو پڑھنا ہے اس کی تقسیم و ترتیب کیونکر ہو۔ ہمارے مدارس میں بالعموم تاریخ کی تعلیم عہدداری ہوتی ہے۔ طبقہ وسطانیہ سال اول عہد ہنود سال دوم عہد مسلمانان اور آخری سال عہد انگریزی پڑھایا جاتا ہے اور طبقہ فوقانیہ کی دو جماعتوں میں بھی یہی طریقہ رائج ہے جو کتابیں فی الوقت مدارس میں مروج ہیں یا جو تواریخ ہند دستیاب ہوسکتی ہیں ان کی موجودگی میں دوسرا کوئی طریقہ ممکن بھی نہیں۔ اس لئے ہمیں چاروناچار اسی طریقہ پر چلنا ہوتا ہے۔ ایک دوسرا طریقہ و ترتیب جس پر اکثر اساتذہ بہت زور دے رہے ہیں۔ وہ ہم مرکزی کہلاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کا ایک ایسا سلسلہ پڑھایا جائے جس میں پہلی کتاب میں خاص خاص واقعات اختصار سے بیان کئے جائیں۔ دوسری میں ذرا

وضاحت سے اسی طرح بڑھتے بڑھتے آخری کتاب میں پوری تفصیل ہو۔ اس طریقہ پر بہت سے اعتراض عائد ہوتے ہیں لیکن چونکہ اس اسلوب پر اب تک تاریخ ہند کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اسلئے اسکے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

تاریخ پڑھانے کا ہمارے مدارس میں صرف ایک طریقہ اور ایک اصول ہے اور اسی پر ہم اپنی پوری قوت سے جمے ہوئے ہیں۔ مدرس سارا گھنٹہ سناتا رہتا ہے اور بچے سنتے رہتے ہیں۔ اس طریقہ کے ہم کچھ ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ نہ تو ٹرننگ کالج کی تعلیم اور نہ مہتمم صاحبان کا مشورہ وتنبیہ ہمیں باز رکھ سکتی ہے۔ اور اگر ہم ایڑی چوٹی کا زور لگاکر ذرا زبان کو قابو میں رکھ بھی لیں تو ہمارے شاگرد رشید منہ پھلاتے اور ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اس لئے عادتاً و خاطراً تعلیم تاریخ داستان گوئی کی صورت میں دیجاتی ہے اگر کسی نے بڑا تیر مارا تو ایک نقشہ لٹکا لیا اور قسم کھانے کو دو ایک مقامات کا جائے وقوع دکھا دیا۔ کاش استادان فن تاریخ وجغرافیہ کے گہرے ارتباط کے متعلق کارلائل کی نصیحت پر کان دھرتے کہ بغیر نقشہ کے کبھی تاریخ کا مطالعہ نہ کرو اور جس ملک کے حالات پڑھ رہے ہو اس کو نقشہ میں اچھی طرح دیکھ لو،

اگرچہ زبانی تعلیم شروع سے آخر تک نہایت ضروری ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی بات کو خاطر نشین کرنے کا ذریعہ صرف کان نہیں ہے۔ جن باتوں کو کان سنتا، آنکھ دیکھتی اور ہاتھ چھوتے ہیں انکا نقش ذہن پر نہایت گہرا اور پائدار ہوتا ہے اور وہ بات دماغ میں محفوظ اور یاد رہتی ہے۔ اس لئے یہ کافی نہیں ہے کہ مدرس سبق کے سبق سناتا چلا جائے اور لڑکے سنتے رہیں بلکہ تاریخی واقعات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچنے اور ماضی کو زیادہ صاف دکھانے کے لئے آنکھ اور ہاتھ کی بیحد ضرورت ہے۔

اس غرض کے لئے تصویریں بہت مفید ہیں۔ بادشاہوں، مشہور لوگوں، عوام، قلعوں، قدیم اشیا، لڑائیوں، محفلوں، درباروں وغیرہ کی تصاویر خاص طور پر نتیجہ خیز ہوتی ہیں اور ان کے معائنہ سے نہ صرف طلبا میں تاریخ سے دلچسپی و دلبستگی پیدا ہوتی ہے بلکہ رسم ورواج، لباس، اسلحہ، وغیرہ کے متعلق مبہم تصورات واضح وصحیح ہو جاتے ہیں قدیم زمانہ کی اشیاء مثلاً تلوار، تیر و کمان، زرہ بکتر بادشاہوں کے تاج اور کپڑے۔ سکہ اور دوسری چیزیں جو فراہم ہوسکتی ہیں دکھائی جائیں یا بچوں کو عجائب خانہ لے جاکر ان کا ملاحظہ کروایا جائے۔ بعض مدارس خصوصاً حیدرآباد کے مدارس کو

خوش قسمتی سے آثار قدیمہ دیکھنے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ مدرس تاریخ قلعہ گولکنڈہ یا مقبرہ میں بچوں کو لے جاکر قطب شاہی عہد کو جس طرح واضح اور دلچسپ بنا سکتا ہے وہ ہفتوں کے درس سے ممکن نہیں۔ اسی طرح پرانے وقتوں کی مساجد، منادر، حصار، قلعے، پل، وغیرہ سب اچھا اثر ڈالتے ہیں۔

تاریخ کی تعلیم میں ہاتھ کا کام کان و آنکھ سے کم مفید نہیں۔ چھوٹے بچوں سے نقشے کھنچوانا خاکہ اتروانا، سیدھی سادی تصاویر وغیرہ بنوانا مفید ہوتا ہے۔ تاریخی اشخاص و واقعات کی تمثیل میں بھی بچوں کو خاص دلچسپی ہوتی ہے۔

بڑے لڑکوں کو البتہ ہاتھ سے کام کرنے کے زیادہ موقع ہیں ان سے نہ صرف نقشے مرقعے اور تصاویر اتروائی جا سکتی ہیں بلکہ وہ مٹی اور لکڑی کے پتلے بھی تیار کر سکتے ہیں ان کے لئے نوٹ بک رکھنا مفید ہے۔ جس میں نہ صرف استاد کی سنائی ہوئی داستان کا خلاصہ لکھتے ہیں بلکہ اپنی کتاب کا بھی۔ جس میں نقشے تصاویر، خاکے، قلعے، مرقعے سبھی کے لئے جگہ ہوتی ہے۔ نیز بڑے طلبار کو درسی کتاب کے علاوہ دوسری بڑی تاریخوں کے مطالعہ کی ترغیب دینا چاہیئے ان کتابوں کے اقتباسات اور ان کے حوالوں کو نوٹ بک میں درج کرنا چاہیئے۔

تاریخ کا سبق مذکورۂ بالا ذرائع سے واضح و دلچسپ ہو جاتا ہے لیکن جو تاثیر جماعت میں ماخذ کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور طریقہ سے ناممکن ہے۔ ان کتابوں میں واقعات ذرا تفصیل سے ہوتے ہیں اور تفصیل بعض موقعوں پر سبق میں جان ڈال دیتی ہے اور جو اشخاص زبانی تدریس میں محض ہڈیوں کا پنجر معلوم ہوتے ہیں وہ ان کتابوں کے حوالہ سے چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسی کتابیں اردو میں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی مدرسہ کے کتب خانوں کے لئے ہمدست نہیں ہو سکتیں یہاں پر ہم اس خیال کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سررشتۂ تعلیم اور دوسرے تعلیمی اداروں اور انجمنوں کا فرض ہے کہ وہ فارسی اور سنکرت اور عربی سے ماخذ کی کتابوں کا ترجمہ کرا کر ان کے سستے اڈیشن شائع کریں تاکہ مدارس کے بچے اور مدرسین ان سے مستفید ہو سکیں۔ موجودہ حالت میں خود مدرسین کو ماخذ کا مطالعہ کرکے ضروری

اقتباسات حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن یہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ ان تین زبانوں کی واقفیت عام نہیں ہے۔ بعض زمانوں کے متعلق حال میں چند عمدہ تفصیلی کتابیں لکھی گئیں ہیں جو اُتنی ہی مفید ہو سکتی ہیں جتنی کہ وہ کتابیں جو کسی واقعہ کے ظہور کے وقت لکھی گئی تھیں۔

مثلاً مولانا حسن نظامی کے افسانۂ غدر یا مولانا راشد الخیری کی نوبت پنج روزہ یا دلی کے کھنڈروں کی ایک صدا اور اسی قبیل کی دوسری کتابیں نہایت مفید ہونگی۔

اسی طرح تاریخی نظمیں اور تاریخی ناول سے فائدہ پہونچتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان کے متعلق تاریخی ناول خصوصاً اردو میں تو مفقود ہیں اور نظمیں مہابھارت اور رامائن کے علاوہ نایاب ہیں۔ مزید برآن چونکہ ان کی زبان اُردو نہیں اس لئے وہ زیادہ کام کی نہیں۔

ایک اور کام جس سے طلبار کا مطالعہ وسیع اور قوائی دماغی کی تربیت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مآخذ میں سے کوئی اقتباس مثلاً اورنگ زیب کا خط جو اسنے اپنے بڑے بیٹے کے نام لکھا تھا۔ بچوں کو لکھوا دیا جائے اور اس پر چند سوالات دئے جائیں۔ پھر جن مآخذ سے اس عہد پر روشنی پڑتی ہے اُن کا حوالہ دیا جائے۔ اس طرح جو جوابات مرتب ہوں گے وہ بچوں کی خود اپنی محنت کاوش کا نتیجہ ہوں گے۔ چونکہ ایسے کام میں بچوں کو بہت سا پڑھنا اور مفید مطلب باتیں چن لینا متضاد بیانات میں فیصلہ کرنا اور اس کے وجوہ قائم کرنا ہوتا ہے اس لئے اچھی خاصی ذہنی ریاضت ہوتی ہے اور قوت فیصلہ اور انتخاب میں ترقی ہوتی ہے۔

طریقۂ تعلیم، آلات، آثار قدیمہ، وغیرہ کی کامیابی کا دار و مدار زیادہ تر مدرس کے اُوپر ہے ہمارے مدارس میں ہر سند یافتہ مدرس تاریخ پڑھانے کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے اور بڑی حد تک تعلیم تاریخ کے غیر موثر ہونے کی وجہ معلم تاریخ کی نااہلیت ہوتی ہے۔ جرمنی اور فرانس میں تو تاریخ پڑھانے والوں کو خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے مدارس کا بھی فرض ہے کہ وہ تاریخ کی تعلیم صرف ایسے مدرسین کے تفویض کریں جو اس کام کے لئے موزوں ہوں۔ معلم تاریخ کے لئے تین خوبیاں ضروری ہیں۔

(۱) تاریخ کا وسیع مطالعہ کر چکا ہو تاکہ درسی کتاب کے اجمال کی حسب ضرورت تفصیل و توضیح کر سکے۔ جو مدرس صرف درسی کتاب پر قانع ہوتا ہے وہ کبھی اپنے سبق میں دلکشی و تاثیر نہیں پیدا

کرسکتا۔

(۲) بچوں کی ذہنی قابلیت کا صحیح اندازہ رکھتا ہو کیونکہ جب تک مدرس بچوں کی استعداد کا لحاظ نہ کرے گا اس وقت تک اس کی تعلیم ذہن نشین نہیں ہوسکتی۔

(۳) زبان پر حاوی ہو اور آواز میں درد و سحر آفرینی ہو طرز بیان اور آواز کی پستی و بلندی واقعات کی تصویر کھینچنے میں بہت کام دیتی ہیں۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے کمرۂ تاریخ کا تھوڑا سا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ہماری درسگاہوں میں کمرۂ تاریخ کا کوئی خاص انتظام نہیں حالانکہ ایک علیحدہ کمرہ سے نہ صرف بچے اپنے چاروں طرف ایک تاریخی فضا محسوس کرتے ہیں بلکہ انکے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کے لئے بھی جگہ نکل آتی ہے۔ نقشوں اور خاکوں کے علاوہ کمرۂ تاریخ میں دو چیزوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاریخی کتب خانہ اور خط دوران۔

کمرۂ تاریخ کے کتب خانہ کے متعلق جس قدر بھی زور دیا جائے کم ہے۔ یہ احساس البتہ حوصلہ شکن ہے کہ اردو زبان میں موزوں کتابوں کا قحط ہے۔ ہمارے نزدیک تاریخ کا مطالعہ اس وقت تک منفعت بخش نہ ہوگا جب تک کہ کمرۂ تاریخ میں۔ قدیم و جدید تاریخوں اسماء الرجال، تاریخی نظموں تزک سفرناموں وغیرہ کا کافی ذخیرہ نہ فراہم ہوگا۔

'خط دوراں' میں کوئی خاص دقت نہیں، جب کمرۂ تاریخ علیحدہ ہو جائے تو لال روشنائی سے فرش سے تقریباً تین گز اونچا ۳/۴ انچ چوڑا خط افقی کھینچا جائے۔ ایک مقام پر سال مسیحی کا خط عمودی ہو اور اس کے سیدھے و بائیں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر (جس کا تعین کمرہ کی وسعت پر منحصر ہوگا) اور عمودی خطوط کھینچے جائیں اور دو خطوں کے درمیان کا فاصلہ زمانی ایک صدی کا ہو سیدھے جانب کے سال بعد مسیح اور بائیں جانب کے سال قبل مسیح قرار دئے جائیں یہ خطوط بھی لال رنگ کے ہوں جا بجا چھوٹے سیاہ خطوط کھینچے جائیں جن کے نیچے کے سرے پر اہم واقعات کا سنہ درج ہو اور اوپر کے سرے پر اس خاص واقعہ کا نام لکھا جائے۔ مثلاً حملۂ سکندر، فتح گولکنڈہ، جنگ پانی پت وغیرہ وغیرہ اب ہر صدی کے متعلق جتنی تصویریں، سکے، مجسمے، وغیرہ دستیاب ہوسکیں آویزاں کئے جائیں۔ بچوں کی بنائی ہوئی چیزیں بھی کام آسکتی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ماڈلنگ نقشہ کشی مصوری

دستی مشاغل، وغیرہ سے ارتباط پیدا ہو سکتا ہے۔

اگر مذکورہ بالا طریقوں پر عمل کیا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ تاریخ خیالی واقعات اور بے جان ڈھانچوں کا مرقعہ نہ معلوم ہو گی بلکہ سلف کے لوگ ہماری طرح انسان، ہماری طرح چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہنستے بولتے نظر آئیں گے اور اُن کے کارناموں سے ہم متاثر ہوں گے ہمارے بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہو گی اور ان کے دلوں میں ملک و قوم کی محبت پیدا ہو گی جس کی ہندوستانی بچوں میں افسوسناک کمی ہے۔

سید فخر الحسن

تنقید و تبصرہ

مبصّر۔ انجمن معراج الادب لکھنؤ کا ماہوار مصور رسالہ ہے جو حکیم آشفتہ صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے اور اس کے صفحات زیادہ تر ادبی نقد و نظر کے لئے وقف ہیں۔ عام ناظرین کے لئے زیادہ دلچسپ نہیں ہے لیکن جس ادبی خدمت کا بیڑہ اس نے اُٹھایا ہے اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ زبان کے لئے بس اتنا کہنا کافی ہے کہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ لکھائی چھپائی نفیس اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ چندہ سالانہ (للعہ) ملنے کا پتہ دفتر مبصر وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

انتخاب سودا۔ مولفہ ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری۔

یہ مرزا محمد رفیع سودا کی صرف غزلوں اور رباعیوں کا انتخاب ہے کلام سودا کی روح کھینچتے وقت لائق مولف نے خاص خیال رکھا ہے کہ منتخب اشعار میں سودا کی خصوصیات یعنی نادر تشبیہات استعارات لطیف و شوخی بیان موجود ہوں لیکن مذاق جدید کے طبع نازک پر بار نہ ہوں۔ اسی نقطہ نظر سے اکثر چیتے عاشقانہ اشعار جنکو سنکر خواجہ باسط کہہ اُٹھے تھے کہ سودا کا کلام واہ ہے، نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی انتخاب اچھا ہے اور اس قسم کی کوششوں سے توقع ہے کہ نہ صرف شعرائے متقدمین کے دماغی جواہر ریزوں کو ملک کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سے روشناس کرانے کا باعث ہونگی بلکہ ان سے اُردو کے اساس تعمیری پر کافی روشنی پڑے گی اور جو بیگانگی اجنبیت اور غیر مانوسی متذکرہ بالا طبقہ کو اپنی مادری زبان سے عام طور پر ہے وہ بڑی حد تک رفع ہو جائے گی

لکھائی چھپائی اچھی ہے قیمت نامعلوم۔

تاریخ مغربی یورپ حصہ اول | مترجمۂ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے۔ ایل ایل بی وکیل۔۔۔

یہ کتاب ترجمہ ہے ڈاکٹر رابن سن کی تاریخ کا جس کا منشا "تاریخ یورپ کے واقعات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ موجودہ یورپ کے تمدن کے ہر شعبہ کو بآسانی سمجھ لیا جائے" یہی خصوصیت ہے جس نے اس کتاب کو دوسری تاریخوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ اور مترجم صاحب نے خوب کیا کہ ترجمہ کے لئے اسے منتخب کیا۔

ترجمہ بحیثیت مجموعی اچھا ہے لیکن ہم کو افسوس ہے کہ باوجود مصنف کی سفارش کے کہ "آپ اپنی کتاب اس بیان سے شائع فرمائیں کہ یہ آزاد ترجمہ ہے" لائق مترجم نے کتاب کا لفظی ترجمہ کر ڈالا ہر مترجم ڈاکٹر نذیر احمد نہیں ہوتا کہ لفظ کی جگہ لفظ اس طرح رکھ دے کہ ٹس سے مس نہ ہو اور عبارت میں لطف و سلاست پیدا ہو جائے اور محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اس لئے اس لفظی ترجمہ کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے یعنی انگریزی بیچدار جملوں کی جگہ اردو مشتق جملے جما دئے گئے ہیں۔ اور انگریزی الفاظ کا غیر مانوس مترادف چپکا دیا گیا ہے جملوں کو انگریزی داں حضرات تو شاید اس لئے سمجھ لیں کہ وہ انگریزی ترکیبوں سے مانوس ہوتے ہیں لیکن غیر انگریزی دانوں کے لئے ان کا سمجھنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ جوئے شیر کا لانا۔ الفاظ کے ترجمے سراسر مضحکہ انگیز ہیں۔ ان الفاظ سے بھلا بتائے کہ کسی کے سمجھ میں کیا آئے گا جفاکش حکمت عملی، فوری توابعین نصف مفروضہ سوسائٹی، خیالی طور پر کھیل کی لڑائیاں ایک دوسری قابل اعتراض بات یہ ہے کہ فرانسیسی ناموں کے تلفظ غلط دئے گئے ہیں۔ فرانسیسی زبان میں ڈیاٹ کہاں سے آیا جو ڑدبے ڈورس ڈی مونٹ فورٹ وغیرہ صحیح ہوئے آخری × دی عموماً ساکن ہوتے ہیں لیکن اُن کا تلفظ روا رکھا گیا ہے مثلاً ایکس لاشاپل آرلیانس ٹورس وغیرہ ہمیں توقع کہ دوسرے ایڈیشن میں مترجم صاحب ان غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ قیمت نامعلوم۔

دونوں کتابیں مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی سے مل سکتی ہیں۔

شذرات

تعلیم بذریعۂ لاسلکی آج کل یورپ کے اکثر ماہرین فن لاسلکی کے ذریعہ تعلیم دینے کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اس کا طریق کار یہ ہوگا کہ طلبہ اپنے اسباق بذریعہ لاسلکی سنیں گے کتابیں پڑھیں گے اور پھر باہمی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ اپنے دائرۂ معلومات کو وسیع کریں گے۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ ڈربی شائر کے ایک موضع میں اس طریق کا تجربہ کیا گیا جو بہت کامیاب رہا۔

شاہ فواد کی علمی و ادبی مصروفیتیں شاہ فواد عربی زبان کے فطری خصائص قائم رکھنے کے لئے ایک عربی انجمن ادبیہ کے قیام کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس زبان کو سہل الحصول بنانے کے لئے جلی حروف اور رموز اوقاف بھی ایجاد کرنا چاہتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے بہترین تجویز پیش کرنے والے کو بنات خاص پانچسو پاؤنڈ انعام دینے والے ہیں۔

نیوزی لینڈ میں اسکول یونیفارم نیوزی لینڈ کے مدارس کے لڑکے اور لڑکیاں سب کے سب یونیفارم پہنکر اسکول جاتے ہیں۔ یونیفارم دراز قامت، مضبوط اور تنومند طلبا کے سڈول جسموں پر بیحد بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لڑکے گہرے نیلے فلالیں کی کالردار قمیص پہنتے ہیں جس کی آستینیں کہنیوں کے اوپر سمیٹ لی جاتی ہیں۔ جانگھیاں (نکر) بھی نیلے رنگ کی ہوتی ہیں۔ جاڑے اور گرمی دونوں موسم میں ایک ہی یونیفارم استعمال ہوتا ہے۔ لڑکیاں بھی سفید بلاوز کے اوپر گہرے نیلے سرج کا سایہ، سیاہ پائتابہ اور سیاہ جوتہ اور نیلے سرج کی ٹوپیاں پہنتی ہیں مختلف مدارس کے طلباء میں امتیاز کرنے کے لئے لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے مدرسہ کا بیاج (نشان) اپنی ٹوپیوں میں لگاتی ہیں۔

لباس نیلگون گویا کہ ہے ایک حرز جان نیلا
بچائے رکھتا ہے بچوں کو چشم زخم بدبیں سے

کانفرنس تعلیمی ضلع کریم نگر انجمن اساتذہ کریم نگر نے سالانہ گیمس و اسپورٹس نمائش و اجلاس کانفرنس تعلیمی بصدارت جناب نواب ملک یار جنگ بہادر تعلقدار ضلع ۱۲ تا ۱۵ اسفندار ۱۳۳۹ف ضلع کے مستقر پر منعقد کئے۔ مدارج تعلیم کے اعتبار سے ٹورنمنٹ کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) تحتانی (۲) وسطانی (۳) فوقانی۔

ان تمام سرگرمیوں کے لئے میدان مدرسہ فوقانیہ۔ میدان کوتوالی و میدان کتب خانہ اور عجائب خانہ مقرر ہوئے تھے۔

میدان مدرسہ فوقانیہ کے مشرقی حصہ پر خیموں کا ایک خوبصورت اور شاندار پنڈال بنایا گیا تھا جو تعلیمی مجالس کے لئے مختص تھا۔ جس میں خواتین کی نشستوں کا پردے کے لحاظ سے انتظام کیا گیا تھا۔ تماشائیوں کے لیے میدان فوقانیہ کے اطراف متعدد خیمے اور راؤٹیاں نصب ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک خیمہ صدر مدرس صاحب مدرسہ فوقانیہ کریم نگر نے اپنے مدرسہ کے لئے نصب کیا تھا۔ اور باقی منجانب ٹورنمنٹ بورڈ نصب ہوئے تھے۔ پنڈال اور جملہ میدانوں کے اطراف نہایت سلیقہ سے بانس سے حد بندی کی گئی تھی۔ تاکہ تماشائیوں کے ہجوم سے مقابلوں کی رونق متاثر نہ ہونے پائے۔ یہ سب جھنڈیوں اور بیرقوں سے آراستہ ہونے کی وجہ سے نہایت دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ میدان مدرسہ فوقانیہ کے چاروں کونوں پر انجمن اساتذہ کے چار جھنڈے زعفرانی زمین اور سبز حاشیہ میں انجمن کی سرگرم کوششوں کا بلندی سے اعلان کر رہے تھے عمارت عجائب خانہ کریم نگر میں نمائش کا باسلیقہ انتظام تھا۔ اس عمارت کے بیرونی حصہ کو خوش رنگ کاغذ کے پھولوں اور بیل بوٹوں سے اس طرح سجایا گیا تھا۔ کہ گویا عمارت انوار کا سرچشمہ معلوم ہو رہی تھی۔ دروازے کے دونوں جانب سرخ کپڑے پر سنہری حروف میں یہ شعر مرقوم تھا۔

زندہ کردی اے مسیحا علم و فن را در دکن　　زندہ باش اے حضرت عثمان علیخاں زندہ باش

جلسہ تقسیم اسناد مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل کا جلسہ تقسیم اسناد بصدارت جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کنٹب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ۔ بتاریخ ۲۹ ہ خورداد ۳۹ ف منعقد ہوا انتظامات نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئے تھے اور صحن مدرسہ میں ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا جس نے مہمانوں کو اپنے آغوش میں لے لیا تھا۔ صدر مدرس صاحب نے رپورٹ مدرسہ پڑھ کر سنائی جس میں گوناگوں تعلیمی و ورزشی ترقیوں کے ذکر کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ مدرسہ مذکور میں تعلیم نجاری کا بھی آغاز ہو گیا ہے اور اب بچے فرنیچر وغیرہ کی مرمت خود کر لیتے ہیں۔ مولوی سید معین الدین صاحب ایم اے صدر مدرس مدرسہ آصفیہ نے مدرس اور اولیا طلبا کے تعلقات پر نہایت پر معز اور موثر تقریر فرمائی۔ صدر جلسہ کی اختتامی تقریر کے بعد بیشمار انعامات تقسیم ہوئے۔ بعد ازاں متحرک انسانوں کا ایک بھر ذخار تنگنائے سے گذرتا ہوا بیرونی صحن میں تھا جہاں پرچم کشافہ لہرا رہا تھا۔ مدرسہ کے اسکوٹ پھریرے کے گرد نیم دائرہ بنا کر کھڑے تھے۔ قومی ترانہ کے بعد جناب

مولوی سید محمد ہادی صاحب ایم اے ناظم کشافہ نے نشان کشائی اپنے ہاتھ سے عطا فرمائے آخر میں معزز مہمانوں کو ایٹ ہوم دیا گیا۔

جلسہ تقسیم اسناد مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ ۲۸ ہر خورداد ۱۳۴۳ف کو مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ بلدہ میں جلسۂ تقسیم اسناد وانعامات منایا گیا جس کی صدارت جناب مہتاب خان صاحب میر محلہ نے فرمائی۔ اساتذہ کی حسب موقعہ تقریروں اور طلباء کے تقریری نمونوں کے بعد جناب مولوی سید علی محمد صاحب اجلال نے ایک نظم بعنوان علم کیا ہے؟" پڑھی جس نے حاضرین کو پھڑکا دیا بعد نماز مغرب مولوی غلام دستگیر صاحب بی اے اول مددگار مدرسہ کی تمہیدی تقریر کے بعد ایک چھوٹا سا اخلاقی ڈرامہ بھی دکھایا گیا محلہ چنچل گوڑہ او رحوالی کے حضرات نے اپنی شرکت سے جلسہ کی رونق بڑھادی تھی اس جلسہ اور ڈرامہ کی کامیابی مولوی غلام دستگیر صاحب، مولوی عبدالقدیر صاحب، اور مولوی اظہار حسن صاحب کی مساعی جمیلہ کی منت کش ہے۔

انجمن امداد باہمی

مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ

حیدرآباد دکن

امداد باہمی (Cooperation) کے اصول پر دکن میں

اردو مطبوعات کا پہلا وسیع اور قابل اعتماد

ہر حصہ (مار) حالی جو بیس ماہ میں فی قسط صہ کے حساب سے ادا شدنی ہیں منافع بعد ادائی زکوٰۃ دس فیصدی تقسیم ہو رہا ہے

تھوڑے حصے باقی رہ گئے ہیں

خریدار جلدی کریں

مکتبہ کے شعبے

۱۔ **فروخت کتب**۔ اردو زبان کی تمام کتابیں ملتی ہیں کمیشن پر فروخت کی جاتی ہیں۔

۲۔ **مطبع**۔ بہترین ماہر فن لیتھوگرافر کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ ہر قسم کی طباعت بہترین۔

۳۔ **دار الاشاعت**۔ مؤلفین کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

جس میں ہر قسم کا سامان اسپورٹس مثلاً۔ ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس، بیڈمنٹن، پولو، گولف اور انڈور گیمس کے علاوہ سامان ورزش جسمانی مثلاً۔ ہاریزنٹل بار، پیریلل بار، والٹنگ ہارس، ڈمبلز، انڈین کلبز ڈیو سپیرز وغیرہ رعایتی نرخ پر دستیاب ہوسکتا ہے۔

بوائز اسکوٹس اور گرلز گائیڈ سے متعلق مکمل سامان کثیر تعداد میں ہمارے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے خریدیں اور آزمائیں۔

تقسیم انعامات کے لئے ہمہ قسم کے دیسی وولایتی سلور اور ای۔پی کپس، شیلڈز، اور میڈلز کی واجبی نرخوں پر سربراہی کی جاتی ہے۔

کم دام اور اعلیٰ قسم، ہماری ترقی کا راز ہے (مکمل فہرست باتصویر طلب کیجئے)

شائقین بلیرڈ کی خدمت میں ضروری اطلاع۔ نہایت مسرت سے اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم مسٹر جان ڈبلیو، رابرٹ لمیٹیڈ، میکرز آف ٹیبل کے سول ایجنٹ ہیں۔ اگر آپ کو نیا ٹیبل خریدنا یا پرانے کو درست کرانا ہو یا دیگر سامان متعلقہ بلیرڈ کی ضرورت ہو تو ہم سے خط وکتابت کریں آزمائش شرط ہے۔

یونگا برادرس، اکسفورڈ اسٹریٹ سکندرآباد

شاخ عابد بلڈنگ، حیدرآباد دکن۔

اعلان

جامعہ ملیہ کا "شعبہ تصنیف و تالیف" جدید انتظام کے بعد "اُردو اکادمی" کہلاتا ہے۔ "اکادمی" کا مقصد یہ ہے کہ اُردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کر شائع کرے۔ اب تک یورپ کی مختلف زبانوں سے بہترین کتابوں کے چند تراجم اور متعدد اور مکمل تصانیف شائع ہو چکی ہیں آیندہ کے لئے اہتمام کیا گیا ہے کہ کم سے کم چھ نئی کتابیں ہر سال لکھی جائیں۔ "اکادمی" نے اپنے قدردانوں کی آسانی اور اپنے فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا ہے کہ جو حضرات ۲۴ روپیہ سال اکادمی کو عطا فرمائیں وہ اس کے رکن قرار دئے جائیں اور ان کی خدمت میں رسالۂ "جامعہ" اور "اکادمی" کی سال بھر کی جملہ مطبوعات نذر کے طور پر پیش کی جائیں۔

زرِ چندہ کی وصولی کا یہ طریقہ ہے کہ ہر سہ ماہی کے شروع میں ۶ روپیہ کا وی پی بھیجا جائے گا اور اُس کے وصول ہونے پر ہر رکن کے نام رسالہ "جامعہ" ماہوار بھیجا جائے گا اور اُس کے وصول ہونے پر ہر رکن کے نام رسالہ "جامعہ" ماہوار بھیجا جائے گا اور "اکادمی" کی جو کتاب تیار ہو گی وہ فوراً روانہ کی جائے گی، اگر کسی سہ ماہی میں وی پی وصول نہ کیا گیا اور واپسی کے بعد پندرہ دن کے اندر وہ چندہ منی آرڈر سے نہ پہنچا تو مجبوراً رسالہ جامعہ اور کتابوں کی روانگی بند کر دی جائے گی۔

اس کا خیال رکھا جائے گا کہ رسالہ جامعہ اور سال بھر کی مطبوعات کی مجموعی قیمت ۲۴ سے کم نہ ہو اُس کے علاوہ پندرہ روزہ رسالہ "پیام تعلیم" جس کی سالانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے تحفتہً ہر رکن کی خدمت میں حاضر ہو گا۔ جو صاحب ان شرائط پر "اکادمی" کا ممبر بننا منظور فرمائیں وہ اپنا نام معہ پورے پتہ کے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی، ایچ ڈی

ناظم اُردو اکادمی۔ جامعہ ملیہ قرول باغ - دہلی

المعلن

احمد الیاس مجیدی

in his masterly summing-up at the meeting of the Women's Association mentioned above, the scheme will be positively useful for the education of those girls who have left school at an early age to enter the wedlock.

We should like, in passing, to offer a few suggestions, if we may, in respect of the period of training for teachers and the syllabus proposed to be followed. The period of training proposed for prospective teachers is, in our opinion, too short, and we would suggest its being extended to at least 2 or 3 months. As regards the course of studies, we should like to invite the attention of the Women's Association to the following points :—

(*a*) Domestic science, hygiene and household management should be emphasised in the curriculum.

(*b*) In preparing the syllabus of studies in the various subjects, due regard should be paid to the actual and practical requirement of the pupils.

(*c*) While the curriculum may include the study of English, the medium of instruction for non-language subjects should, as far as possible, be the vernacular of the pupils. This is essential on cultural as well as utilitarian grounds.

freely expressed in regard alike to the underlying principles and the practicability of her scheme, could not have failed to carry conviction home to the entire audience not only of her mastery of the subject and skill in marshalling her facts, but of her great enthusiasm and sincerity and of her deep and abiding interest in work for ameliorating the condition of the Zenana.

We take this opportunity of congratulating the Women's Association for Educational Advancement on the promptitude and enthusiasm they have displayed in taking up a scheme well calculated to advance the interests of the Zenana, if only as a beginning and precursor of the much needed and long over-due crusade against female illiteracy in the Dominions. We are zealous champions of all forms of activities and new tendencies in educational reform, and have great pleasure in commending the proposed scheme to all concerned, as we are confident that by directing its attention first on the middle and upper classes of the Zenana, it will pave the way for the unrestricted enlightenment of all our women-folk, irrespective of class. We say this advisedly, for we believe in the growing tendency all the world over for "equal opportunities" for all, and in the increasing trend towards the acceptance of democratic ideals even in India. We hope, therefore, that the benefits of the proposed scheme will, in course of time, reach down to the lowest classes, and we trust that the Association will devise means to embrace in the proposed scheme the poorer classes as well, so that it may not, at the very outset, be branded as 'highbrow' or 'bourgeois'.

As regards the clientele that the scheme under consideration is designed to serve, we hope we are right in inferring that it will include unmarried girls only in exceptional cases. We are sure that the Association agrees with us that a system of ready-made Home education can never supplant or be a substitute for School education. We do think, however, that, as pointed out by Sir Akbar Hydari

ously the scheme does not go far enough. There is a pressing need for introducing a scheme of medical inspection of schools which will embrace the whole school population in the State and which will provide not only for the examination of the spleen but also of the nose, throat, ear, heart, eyesight, teeth and the lungs. We trust that steps in this direction will soon be taken.

A Scheme of Home Education for Women.

We have published elsewhere the texts of the leaflets issued by the Women's Association for Educational Advancement, outlining a scheme of private teaching for adult women and such girls as find it impossible or inconvenient, on account of social customs, environments or other considerations, to go to school.

In this connection, we may, relevantly, request our readers to refresh their memories by referring to Mrs. Tasker's very able and interesting article on "The P. N. E. U. and Charlotte Mason's Philosophy of Education," published in our last issue, which has an important bearing on the scheme under review. We had further practical evidence of Mrs. Tasker's interest in educational matters, in general, and her great sympathy and solicitude for the Zenena, in particular, when we were present by invitation at a meeting which was held recently in the Nizam College under the auspices of the Women's Association for Educational Advancement, at which Mrs. Tasker read an excellent paper dealing with the principles and the practical aspects of the proposed scheme, and invited criticisms and suggestions from the audience The lucid, ready and reassuring answers which Mrs. Tasker gave to the veritable volley of questions to which she was subjected by the audience, and the confident and constructive palliatives she offered to disarm all fears and doubts that were

The establishment of contact between school work and the life and environment of the pupils is not so much a question of what subjects are taught at school as of the manner in which they are taught. Ultimately, therefore, the problem all comes back to the teacher. Is he prepared for the hard thinking and work involved in the task of relating his subjects to life ? The right kind of training may help, but more depends on the spirit in which he takes his work.

Medical Inspection of Schools in Hyderabad.

We have had occasion to refer in some of our previous issues to the various measures adopted by the Hyderabad Residency for improving the facilities for education in the Administered Areas. The Residency authorities have given a further proof of their progressive educational policy by introducing a scheme of medical inspection of schools, the main features of which are as follows :—

(1) Every pupil is to be examined at the time of admission and thereafter once a year by a qualified medical practitioner approved by by the Residency. (2) The medical officer is to be paid a fee not exceeding 12 annas for every first inspection of a pupil and 6 annas for each of the subsequent annual inspections. (3) Aided schools are to receive a grant amounting to one-third of the expenditure incurred by them subject to an upper limit of 4 annas for the first inspection of each pupil and of two annas for each of the subsequent annual inspections. (4) The award of grants to aided secondary schools is contingent on the levy of special fees from the pupils so as to cover at least one-third of the cost of medical inspection. (5) No fees are to be levied from the pupils in primary schools.

In the meantime, the question of making provision for the medical inspection of schools in the Dominions has been engaging the attention of H. E. H the Nizam's Government. A beginning has already been made by arranging for the examination of the spleens of the pupils of the schools in Hyderabad by the Malaria Expert, whose appointment was sanctioned a few months ago. We have no doubt that this measure, coupled with the improvement in sanitation which is being rapidly effected, will help to stamp out malaria in course of time in the city of Hyderabad. But obvi-

The same applies to mathematics, which is often taught as an abstract thing without any bearing on the pupil's daily life. Sums should not be *ad nauseam* in foreign coinages, which are unreal to the pupil, but in local coinages and weights, etc.; also, examples set in arithmetic in rural areas should be based on the rural environment of the pupil and those given in town schools should be related to urban environment.

History especially should be taught in relation to local institutions. Indeed there is something to be said for the idea of one headmaster who maintains that history should be taught "backwards", starting from the present. Civics certainly can be treated in this way, and history so often to the pupil a mere string of unreal events in the past could at any rate be linked to local institutions and antiquities.

The same, of course, applies to geography, but we cannot do better than refer the reader to Miss Wookey's article in this issue for helpful details.

The Project Method of Teaching is a modern way of teaching, which seeks to relate the pupil's work to life and practical effort on his own part (*Vide* Mr. Simpson's articles in the *Hyderabad Teacher*, Vol. III No. 4 and Vol. IV No. 2). This method has much to commend it in relation to the point we are considering. It also has a fine character basis, and this is an important point that is apt to be neglected at times. In morals especially the danger of unreality is serious. It is not by talking about virtues but by engendering purposeful action that character grows. A moral lesson does not necessarily result in moral behaviour Moral behaviour is much more than this. It means that in the various situations of life people will make the right responses and do moral acts. Such situations can be created at school in various ways. Opportunities for cooperative effort, especially, should be provided; and in many ways an appeal made to those moral instincts, which when rightly evoked and exercised, result in a full moral personality.

Editorial Notes.

Education in relation to Practical Life.

THE Hyderabad Teachers' Association appointed three Sub-Committees last year for preparing reports on "The Teaching of History", "The Teaching of Geography" and on "Mathematics in relation to practical life" respectively. The reports of these Sub-Committees are under preparation and will be placed before the Fourth Annual Conference of the Association, which is to be held on the 3rd and 4th July, 1930. At the meetings held by the Sub-Committees so far, the discussions have mainly turned on how to bring about harmony between school work and life outside school. We have published elsewhere the papers contributed by Mr. Hughesdon and Miss Clough to the Mathematics Sub-Committee and a paper prepared by Miss Wookey for the Geography Sub-Committee. All the three writers have dealt especially with the practical aspects of the subjects entrusted to them by the Sub-Committees concerned.

A favourite maxim of Thring of Uppingham was that education should always be "from life to life", and it is one that should never be forgotten if the education imparted is to savour of reality. It is the unreality and lack of such life contact in the system of teaching in Indian schools that tends to engender distaste in our pupils. Life is many-sided and education should be the same; the academic type at present largely prevailing must be adjusted to the life of the pupil and his environment. Such life contacts can be made in many ways: open-air schools, school excursions, especially in connection with history, geography and science are invaluable in making the subjects real; and when a subject is thus vitalised, the problem of securing the pupil's interest is also solved.

Obituary.

Since the publication of our last issue, the Hyderabad Teachers' Association has suffered a great loss by the sad and untimely deaths of Mr. K. P. Shastri, B.A., L. T., Head Master, Mufidul Anam High School and Mr. Ahmeduddin, M. A., B. T., Head Master, Kachiguda Middle School. The former succumbed to an attack of pneumonia on the 30th. March 1930, while the latter died of intestinal obstruction after only 4 days' illness on the 29th. April 1930.

Throughout his connection with the Association, which lasted for nearly 5 years, Mr. Shastri took a keen interest in all its activities and rendered valuable assistance at the 2nd. and 3rd. Annual Conferences. This year he had been elected Secretary of the Geography Sub-Committee, and so great was his enthusiasm and so keen his sense of duty that, in spite of ill-health and the great sorrow which he was feeling owing to the loss of his son, he attended a meeting of the Sub-Committee only about 10 days before his death.

The late Mr. Ahmeduddin was extremely popular among the members of the Association owing to his polished manners and genial disposition. The success of the Residency Branch of the Hyderabad Teachers' Association was due in no small measure to his interest and co-operation

Both Mr. Shastri and Mr. Ahmeduddin died quite young, being 32 and 34 years old respectively. We extend our heartfelt sympathies to the bereaved families.

May, 1930. The opening ceremony was performed by Mr. Fazl Mohamed Khan, M. A., Director of Public Instruction. The competitions which were organised in connection with the Rally included knot-tying, kit-race, swimming, first aid and signalling. The championship prizes for Rovers and Scouts were won by the First Hyderabad Rovers and the 11th. Hyderabad Troop (Residency Middle School) respectively. The Scoutmasters' Conference was presided over on the first day by Mr. S Ali Akbar and on the second day by Professor Hanmantha Rao. The Conference passed resolutions urging the need for introducing such modifications in scouting in India as would meet the national demands and suit the local conditions; requesting the Director of Public Instruction to give more leisure to scoutmasters to enable them to devote sufficient time to scouting; and drawing the attention of the Head-Quarters to the need for organising advanced courses for patrol leaders and for appointing a special committee to work out the details of a Rover scheme. In his presidential address at the Patrol Leaders' Conference, after explaining the responsibilities of a patrol leader, Mr. S. M. Hadi, Director of Boy Scouts, remarked that patrol leadership was a training in higher leadership which was badly needed in India. On the last day, in the morning Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Home Secretary, delivered an eloquent address to the campers on 'Scout Laws', while in the evening after inspecting the camp, Sir Akbar Hydari (Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur), Minister of Finance, gave away the prizes to the winners of the various contests held during the Rally and in a suitable speech exhorted the scoutmasters and scouts to do their best to advance the cause of scouting in the State. The Rally was a great success, on which the Director and Assistant Directors of Boy Scouts deserve to be congratulated.

Under the auspices of the All-India Federation of Teachers' Associations, the First All-Asia Educational Conference will be held at Benares from the 26th to 30th. December 1930.

higher respect shown by the students to the teachers and deeper affection on the part of the teachers towards their pupils. The old spirit of "Guru" and "Chela" should be revived and the old World idea of sanctity restored to education.

Mr. Abdur Rahman Khan also spoke on the importance of Adult education and on the value of educational exhibitions, fine arts, games and educational excursions. In conclusion, referring to the question of education and unemployment, he said, "I don't think there is any cause to fear that unemployment has reached such proportions as to foster unrest among the educated classes. But it would be a wise policy to go to the root of the evil and modify the system of education. More stress should be laid on manual training in schools and more technical and agricultural institutions should be opened. Agriculture being the chief occupation of the country, every facility should be given to bring under the plough the vast acres of land now lying idle and the people (especially educated people) should be encouraged to take more kindly to this ancient occupation of India. In due course the industries of the country should be developed under expert guidance and foundation laid for a happier and wealthier Hyderabad".

Among the resolutions passed by the Conference were the following :—

(1) "That this Conference, in view of the present condition of the State, invites the attention of the Educational Department to the need for linking up technical education with literary instruction in the lower middle course in the Dominions".

(2) "That this Conference resolves that industrial schools should be organized for women similar to those for men."

A resolution was also passed urging the need for opening agricultural schools.

Dominion Scout Rally.

Nearly 550 scouts from various places in the Dominions took part in the First Hyderabad Dominion Scout Rally which was held at Govind Bagh, Hyderabad Deccan, on the 6th., 7th., & 8th.

Proceeding, the President drew the attention of the Education Department to the urgent need for providing more sanitary school buildings. He expressed gratification at the interest which the Education Department was taking in the Boy Scout movement and in physical education.

Referring to technical education, Mr. Abdur Rahman Khan rightly remarked that for such education to be successful, it was necessary that there should be a nucleus of industrial plants and factories in the country whose proprietors would be willing to admit as apprentices students leaving technical schools and colleges with diplomas and degrees. He further pointed out the need for introducing manual training in the school curriculum and for laying greater stress, especially in High schools, on science and mathematics, which form the ultimate basis of all kinds of technical training.

On the subject of higher education, the learned President described briefly the excellent progress which the Osmania University and the Nizam College had made in recent years. He said that though research work had been started, it required further encouragement and more outlay on the equipment.

Mr. Abdur Rahman Khan deplored the backwardness of the State in female education. He thought that the curriculum of Girls' schools should be different from that of Boys' schools. It was necessary, he said, to provide in Girls' schools training in midwifery, nursing and household management. Only those girls who have a special aptitude for higher education should receive such education.

With regard to moral training, Mr. Abdur Rahman Khan remarked that no education could be sound unless an attempt was made to safeguard the morals of the students. This, he said, depended largely on the spirit in which education was imparted. Education should not be pursued from a purely mercenary point of view. There should be

Chief Inspector of Physical Eduction and Director of Boy Scouts, F. Weber, M. A., B. P. E., Director of Physical Education for Colleges, W. Turner, M. A., Officiating Principal, Nizam College and S. Ali Akbar, M. A. (Cantab.) Divisional Inspector of Schools, to consider the recommendations of the Sub-Committee on Physical Eduction appointed last year by the Hyderabad Teachers' Association under the chairmanship of Mr. K. Burnett, M. A. (Oxon :), formerly Principal of the Nizam College.

Mr. P. Satyanarayan Rao, B. A., L. T , has been appointed Assistant Divisional Inspector of Schools, Administered Areas.

The Hyderabad Educational Conference.

The tenth annual session of the Hyderabad Educational Conference was held on the 12th. and 13th. May under the presidency of Mr. Abdur Rahman Khan, B. Sc., Principal, Osmania College. In his welcome address, Dr. Nazir Yar Jung, Chairman of the Reception Committee, rightly suggested that besides drawing the attention of the Government to the various educational problems of the State, the Conference should endeavour to interest the public in these problems.

Mr. Abdur Rahman Khan's address covered a wide range of subjects. Speaking about primary education, he stressed the need for including in the curriculum of village schools such subjects as would suit rural requirements, so that the students of these schools might not be tempted to give up the profession of their forefathers. He expressed the opinion that training in practical agriculture should form an important part of primary education in rural areas. On the other hand, primary education in urban areas should take cognizance of the fact that the town students naturally look to service for their means of livelihood He also suggested that provision should be made in the town schools for teaching such subjects as carpentry, smithy, draftsmanship, typewriting and short-hand, etc.

Hyderabad Teachers' Association.

PROGRAMME

OF

The Fourth Annual Conference.

Thursday 3rd July 1930 A. D.

First Session : 9 a. m. to 12 noon.

---

1. Opening of the Exhibition.
2. Prayers.
3. Welcome address by Mr. Syed Zahoor Ali, B.A., B.T., Chairman of the Reception Committee.
4. Secretary's Report by Mr. S. M. Sharif Mushahdi, General Secretary.
5. Resolutions of Condolence. *From the Chair.*
6. Presidential Address by Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Secretary, Home Department.
7. Lecture on "Personal Hygiene" by Dr. Latheef Sayeed, M.B., C.H.B. (Edin.)
8. Resolution :—

"This conference recommends that Science, including Hygiene, should be made a compulsory subject in the Middle stage and that immediate steps should be taken to provide each middle school with a qualified science teacher and a well-equipped laboratory."

Second Session : 2 to 4-30 p. m.

1. Report of the Sub-Committee on the "Teaching of Geography".
2. Report of the Sub-Committee on the "Teaching of History".
3. Resolution :—

"This Conference recommends that with a view to make instruction in Oriental Languages more efficient, provision should be made in the Osmania Training College for training such teachers with Oriental qualifications as are in service at present."

To

THE HONORARY SECRETARY,

Women's Association for Educational Advancement,

UMID MUNZIL, KHAIRATABAD.

I am interested in the scheme of the Association for the spread of education amongst women in Hyderabad. I would like to take the month's special training that will fit me for the teaching of children or adults in private families. I would be willing to pay a total sum of Rs. 50/-(O.S.) for my training inclusive of my membership fee of your proposed organisation, which would arrange my classes and protect my interests, set the syllabus of lessons and supervise my work.

I consider that a remuneration for teaching at the approximate rate of Rs. 25/- (O. S.) per hour per month (recognized holidays excepted) is adequate. I would expect to be provided with conveyance in addition to salary.

I fill in this form as an indication of genuine interest and intention to join the organisation, should it develop on lines which meet with my approval, but it is understood that I am under no obligation at this stage. I expect to be informed of any further development of the scheme.

Name..

Address ....

Notionality ....

Languages (in addtion to English)

Remarks :—

them to obtain it otherwise. A scheme has been suggested whereby an educationist (trained at the Ambleside House of Education which for nearly 40 years has specialised in home education) will undertake the organisation and training of a group of women as teachers for this purpose. No previous training in teaching is required, and it is thought that educated women, whose home duties do not occupy their whole time, would be well suited for the work.

If there is an adequate response to the proposed scheme, which has received the encouragement of outstanding leaders in education in the State, Government will be approached for its support. In the beginning, in order to take the training, a knowledge of English is essential. Women of all nationalities are invited to send in their names on the form which is attached to this appeal.

APPLICATION FORM A PUPILS.

To

THE HONORARY SECRETARY,

Women's Association for Educational Advancement,

UMID MUNZIL, KHAIRATABAD.

I am anxious to have private teaching for the $\frac{\text{children}}{\text{women}}$ of my household, ifit can be arranged to my satisfaction.

I am willing to pay fees at the rate of 1—2 hours a day Rs. 40—Rs. 75 (O. S.) per month, 3 hours a day Rs. 75—100 (O. S.) per month, the fees to be fixed according to the qualifications of the teacher, the number of subjects taught, and the number of pupils in the class.

It is understood that the signing of this form places me at this stage under no obligation but is a genuine indication that the scheme suggested may meet the need of my own household.

Signed..

Address..

Date..................................

Remarks:—

Women's Education:

Suggested Scheme of Private Teaching.

A. The Women's Association for Educational Advancement brings forward this suggestion for a scheme of private teaching for families in Hyderabad to meet the following three-fold demand:

(1) The education of girls whose home circumstances make it quite impossible for them to go out to school.

(2) The continuation of education of girls who have left school at an early age for marriage.

(3) The education of adult women.

The suggestion is that an educationist (trained at the Ambleside House of Education, which for nearly 40 years has specialised in home education) should be brought to Hyderabad, firstly to get in touch with families that are anxious to obtain private teaching; and secondly to recruit and train suitable local women for teachers, supervising continuously their work in the private families.

The Commitee of the Association recognizing the general demand for such private teaching, and encouraged by outstanding leaders in education in the State, is anxious to obtain accurate information, in order to have ground on which to approach Government for help in starting the proposed scheme. A form is herewith attached which, it is hoped, will encourage households to send in the information that is required.

B. The Women's Association for Educational Advancement appeals to educated women in Hyderabad to help with the work of taking education for both girls and adults to households where custom and circumstances make it impossible for

We train for life, not livelihood; and Geography is the subject which demands the help of all hobbies which are loved by man, hobbies which though directly useful during the school period of education, are perhaps even more useful when our children go out into the world to play their part in the national life.

Are we making photography, stamp collecting, drawing, nature study, geology, carpentry, and reading such an integral part of Geography that the pupil gets so interested in their pursuit at school that he will go on with the study unaided when his time at school is over; when perhaps as a forest ranger, or engineer, he must make his own amusements or go down the road of ruin and degradation:

A man with wide contacts is the man who will make most friends, and a man with a wide range of interests is the man who may be the statesman for whom India is seeking and who will be acclaimed as leader because he has first learnt leadership at school and in the service of others.

The administration of the village or town will be the province of the History specialist; but once local government, justice, and the police, force, and their relation to the Central Government have been treated the rest of the field is open to the Geography specialist. He must guide the investigation so that no important part of the life of the people escapes recognition.

What is the population of the township? How do the people earn their living? What food do they eat? Where does it come from? What is exported? What trades are carried on? How is the knowledge of the trade obtained? What wages are earned? How are they spent? What do the women do? How many schools are there? How many attend them? How are the sick, the orphans and the destitute helped? How many live in one house? What are the amusements of the people? How many money lenders are there? What cooperative societies are there? What diseases are most common? Why? Are diseased animals left in misery?

These and other questions form an endless list, and the facts, although self-evident, are usually taken for granted. It is the duty of the specialist to see that they are not taken for granted, and by skilful suggestion and well thought out schemes to set on foot a crusade to get rid of undesirable conditions, and show the villagers that those who have the greatest opportunities are those to whom they can look for practical help in making their houses cleaner, their amusements purer, and their whole lives happier.

Moral teaching without application is useless. A virgin field is at our doors, as teachers let us use it.

The Use of Leisure.

In the use of leisure a man's inmost desires will be most evident. Our leisure periods are often our times of greatest growth.

The special conditions of the time which led to their enunciation must first be appreciated before we think of taking the principle set forth and seeing how best its spirit can be interpreted in the very different world conditions of to-day.

And in nearly every case it will be found that the reason for the founder's teaching being readily listened to or for his insistence upon some special command or prohibition was that of some special historical happening, which had as *its* antecedent some factor of Geographical control.

Could Christianity have spread as it did had the way not been made ready for it by the might of Imperial Rome, who tolerated no wars within her boundaries, and within which men might travel as they have never done, till up to some seventy years ago?

Detailed study of this sort is not possible for school children, but it must come within the teacher's equipment before he can pass on to the children the true meaning of the teaching set forth in their sacred books.

Implicit religious teaching.

Fiery enthusiasm for the very highest qualities reached by man can seldom be more strikingly portrayed than in the thrilling stories of those who cared not what risks they ran provided they went forward.

Forcing a moral–that crime of pedagogy–will not be needful. All we as teachers need is to read widely, to sympathise greatly, and to present convincingly. The tale of the exploit itself will do the rest.

CIVICS.

This seems the special province of the Geography specialist. To him will fall the duty of drawing the children's attention by actual first hand research to the facts of civics as revealed in an investigation into the immediate environment of the school.

subject specialists is daily (owing to the steady raising of the standard demanded) becoming more evident.

In such cases is not the practice customary in England for students doing the Advanced Course suggestive for modification of custom here? Advanced course pupils taking a foreign language, English and History as their subjects do one at least of the prescribed foreign languages books not with the "French" teacher but with the History specialist, thus getting historical perspective and colour.

But the English specialist, if he is to give willing co-operation to the other specialists, must be assured that they in their turn will help him and refuse work which has glaring faults of language, expression and style. Geography wants far more than facts; it demands statements viewed in their right perspective, and well arranged.

The aid of the English specialist will also be sought in selecting the books to be placed in the Form room Library and in bringing to the notice of the Geography teacher present-day poems and extracts which have a close connection with Geography, even as the latter will bring forward passages of worth while beauty which he has met within his reading.

Geography and Ethical teaching.

Consideration of this leads us to see that correlation must be sought under four heads: (1) that of direct religious teaching, (2) that which is implicit in a fine presentation of character as revealed in the exploits of the great discoverers, (3) that found in the study of civics, and (4) that driven home by the training which we give our children in the right use of leisure.

Fully to understand the doctrines of the great founders of the world religions means placing them against the background in which they were conceived and from which they grew.

Geography and English (or the vernacular).

As "every lesson should be an English lesson" the correlation of language with Geography has been left till near the end.

Lecturettes by the children on matters of interest to them and the writing of the words to be spoken in their dramatisations are obvious needs.

But how often is a map considered an essential of many literature lessons? How can Hardy be successfully taught without a knowledge of Southern England and Wordsworth apart from the Lake District; or how can Masefield's unforgettable pictures of ships and seamanship really mean anything apart from "Geography, or his classic Reynard the Fox be divorced from a study of the English countryside?

Only a knowledge both of Geography and History will make possible a sympathetic reading of the work of Yeats or other Irish writers with their extraordinary blend of mysticism and common sense, their land hunger, and their joy in the beauties of nature.

And to take the other side of the picture, Geography cannot be understood without a sound knowledge of English. Silent reading is essential for a real knowledge of the subject, but of what use is it unless the children have been wisely guided in their early attempts, and taught the application of the advice that "some books are to be swallowed, some are to be tasted, and some few to be chewed and digested"? And the language teacher may take comfort in the fact that rapid and thorough testing of comprehension is usually easier in books which bear on Geography than in those which deal with another subject.

The correlation of language with all the subjects of the curriculum is certainly far less likely to be forgotten when the allocation of teachers in a school is on a class, and not a specialist, basis. But for Senior divisions the need of the

Work in the Senior School.

Here Science will become more specialised, but, whatever be the course, the first year's work is certain to include a grounding in Physics; and a knowledge of the real significance to be placed upon readings of rainfall, temperature, pressure and humidity, *must* have its roots in the Science room. It is the task of Geography to trace the influence of those factors upon the vegetable and animal zones, and hence upon man.

Science and Mathematics combined will play their part in making clear the principles underlying *accurate* map work, and the intricate problems faced by meteorological stations in mapping the atmospheric changes which are so vital to aeronauts. But many of these problems and those of astronomy lie outside the range of the majority of our seniors.

Geography and Drawing.

An essential part of the study and preparation of simple maps, relief maps and models, lies in the power to make a simple sketch from the data given of the area surveyed. This must begin from actual outdoor sketch work of a selected area, and how many children can accomplish the first step, much less the second ?

Simple perspective can be taught to any class in school, and once the idea has been grasped almost all lessons during the cold months should be given out of doors.

Could not posters also be produced to show the art and craft workers of any bazaar at their work? Even children of nine can draw people, if most drawing lessons are given up to the drawing of every-day objects. And for younger children a study by the teacher of the work done by Professor Cizec with his children's cut-outs in colured paper shows that seeming miracles are of daily occurrence, when the children are asked to illustrate scenes with which they are thoroughly conversant.

Mathematics should stress the need for giving *only* what is necessary; and nowhere is the ability to do this more lacking than in the usual total neglect (by both teacher and pupil) of informative sketch maps and the useless emphasis laid by many teachers upon the meticulous production of a few carefully traced maps, which usually end by showing nothing, because they attempt to show too much.

Statistics of India's trade in the staple articles of her wealth should be sought for by the pupils, and such information as her percentage of deaths per thousand of small children and that of other countries be found tabulated and reduced to manageable form by the mathematicians (who will thus see a real use for logarithmic and other tables); while the Geography teacher will find plenty of interest shown as he draws out the causes which have led to such results.

Geography and Science.

Work in the Junior School.

All Junior children are intensely interested in animals and the study of how animals adapt themselves to their environment forms a convenient starting point. Plant adaptation is equally valuable and essential for a true understanding of Geography, and from that to the finding of specimens of different kinds of rocks, then to talks on how they are formed, their uses to man (with special reference in certain areas to the wonderful buildings of India's past) fossils, the formation of coal and man's use of it, is most attractive to all at this stage. From rocks we pass to clays and their formation, and before we know where we are we find ourselves thinking of rivers and their work, and much that is associated with "purely physical geography".

Science too should introduce the Juniors to the actual knowledge, *by use*, of the different world systems of weights and measures.

The only outlay is upon wood, for all sorts of scrap material finds a use, e. g. disused tins and canisters, cigarette boxes, scraps of mirrors, old balls etc. The utilisation of such material will form a valuable side-light to some children, and the joy of making something that works is a keen incentive to others. In actual use the elder Juniors (those up to 14) can do the accurate surveying and the younger ones secure the data for the human aspect, such as the number of shops in a street, what is sold, and so on.

Work in the Senior School.

Here the demands of an Examining board will probably result in the Handwork period being abandoned for Science, so that the children will have to work almost unaided, and in their free time.

But it is possible to get some boys interested enough in some special topic for them to want to make models to illustrate it. "Pictorial Education", a publication *no* school should be without (published by Evans Bros.), gives invaluable help by providing a series of pictures illustrative of one aspect of life through the centuries, e. g. modes of transport, great inventions, etc.

Girls might delight in learning some craft work, and thus realise what skill goes into tbe making of articles of beauty, such as vases and jugs, all forms of leather work, bookbinding, weaving and other arts

Geography and Mathematics.

If the ideal of order is emphasised in the teaching of all mathematical subjects, it should have as one outcome the production of, during the Geography preparation period, neat maps with essentials *only* inserted, and the production each week from the mathematics periods, of one card reference per class of inferences (in round numbers, which can be most conveniently handled in diagrammatic representation) which can be got from a study of returns puplished weekly in the various papers.

which enabled them to hold out against the martyrdom of Spanish rule, and finally to bring Spain to terms.

Physical features again have, until recently, made plague and famine in the East inevitable, and the consequence has been a fatalistic outlook.

Within wide areas the particular mode of life,, and hence the growth of common interests, speech and culture have resulted in an awareness of nationhood. But here again a nation's true development will only be found in channels laid down for it by its world position and natural resources.

Geography and Handwork.

Many of the models prepared for use when illustrating the life of a nation (as suggested in the History section) can only be done really well with the aid of the Handwork specialist, but his services will be even more essential in the presentation of the first stages of Geography, for it *must* proceed from the school outward.

Simple maps embodying the child's relation to his environment (1. his desk and his class room. 2. his class room and his school building. 3. his class room and his home) will all want the aid of Handwork, especially after the last step has been taken, for we come at once to the need for a fixed line from which to measure direction, and individual shadow sticks are much more valuable than one fixed upright in the playground.

Simple surveying and the making of the apparatus necessary for this will give a two years' course in Handwork alone. Mr. Robinson, F. R. G. S., has made over two hundred pieces of apparatus for such a course. He tells in his two books (published by Pitman) how this has been done, and it is interesting to note :—1. that all apparatus was made by his own primary school children in England, and 2. that the cost rarely exceeds six annas, and is usually less.

Asia is the country of Marca Polo's travels, or the scene of the exploits of Alexander. France was the home of the Maid who led a nation to victory, while the British Commonwealth abounds in tales of the great explorers, thus bringing us in time close to our own day.

For the practical side of such correlation a history wall chart and a geography development chart might well form a complementary frieze. Picture post cards and drawings of places and peoples, of costumes, of modes of life (both past and present); dramatic representation of stirring events: the making of models of tools, of weapons and armour, of houses; and the drawing of simple maps to indicate where all the above were once found, is as much History as Geography. Delocalised history has as much value as a mummy. The parts are there, but the life is absent.

Work in the Senior School

If the foundations, such as have been indicated above, have been truly laid, the Seniors will be led to see that environmental factors have been and *are* largely instrumental in forcing upon a people a particular mode of life, usually within certain well defined physical boundaries. Where these are absent, the area becomes a battlefield where through the ages neighbouring powerful states have striven for mastery, and within which areas states "are cut and pared as if they were Dutch cheeses". Could anything be more full of misery than the struggle for mastery in Poland, or in Italy?

In the early days of medieval and modern history physical boundaries played an incalculable part in moulding the destiny of a people. England was forced into becoming the World's carrier. France exalted militarism in her attempt to make the Rhine her boundary, and lost in the struggle her far flung American dependency. Their endless combat with the sea gave to the Dutch a dogged persistence

which is taking place before our eyes :- let us think of what is being done by men whom we may all of us conceivably see and perhaps talk with and know.

India is building up for herself a new order, and other countries of Europe are doing the same ; they are meeting the problems that we and our children must settle, and that all of them know something about. What is to be done with minorities? Is a tariff wall good? How much of a nation's income should be set aside for defence? These and other questions are being met in Europe to-day.

And we spend our time in school telling of conditions which we have never seen, and of struggles of princes and rajas whom we can never know, while our children are asking us questions about what is actually happening in their country to-day, or why they cannot settle in Australia or the United States, if they want to do so.

Camparison is one of the most fruitful of teaching devices ; so let us use the material waiting for us and stop going back into the past for our illustrations, when much of what is of the greatest value is to be found here and now.

Were such a course adopted, the correlation between history and geography would be almost self-evident. The close bond that exists between the two subjects is unknown to the average pupil because history usually deals with a period remote from the present day. But, although the danger of cramming would be great were such a course adopted, the sudden "live" interest which would of necessity be introduced, both into history and the study of Europe, in particular, in Geography would, I think, offset the dangers. And the *utter* impossibility of teaching either subject in a water-tight compartment would also be of untold value·

Work in the Junior School.

Here children are at the Romantic period of mental development. The countries of the world are best visualised as the homes of the great figures of History.

don in the time of Akbar the Great; and, in view of the rapidly increasing economic relationship between all lands, international relationships will become more and more important, so that a knowledge of the cultural and historical background and outlook of our neighbours is necessary. Only contact will prevent distrust, which in its turn leads to war and destruction.

And here we would plead for serious consideration to be given to placing before Examining authorities the need for a radical alteration in the place given to World History; and also for the need for a course bearing directly upon the actual work of the League of Nations, especially that section of its activities which fights against disease and under the International Labour Organisation attempts to deal with a low standard of living.

In the Kindergarton Stage the children will be told stories of their own country's heroes and heroines, but once that stage is past, surely the time is ripe for bringing before them a wider canvas, from the Homeland outwards to where the World Heroes pass before our eyes. Let us draw our material from the princes of story telling, Herodotus and his successors. That will give us also broad outlines of world geography; and then at about the age of eleven let us come back again to the Homeland, giving *not* a detailed study but one in plain black and white of a few outstanding figures And then from that, just when their minds are at their most idealistic stage, to the men of to-day in Europe and elsewhere, and to the countries where they are working.

I have never yet met a child who liked Irish History, as forced upon him by the demands of an examining board. It is little but a confused medley of wars and rebellions with misery and unhappiness in their train. In India too let us get away from the period of a nation's life when wars were accepted as inevitable and let us turn our thoughts to Europe to a concrete picture of growth and development

The Correlation of Geography with other Subjects

BY

MISS F. N. WOOKEY, B. A.
(St : George's Grammar School)

CORRELATION is an ideal which theoretically is given its rightful place in many schemes, but which in actual practice is apt to be disregarded.

The reasons for this are not far to seek. 1. A Principal has little time in which to work out an effective scheme with his staff, and there is need for constant, and often radical revision consequent upon staff changes. 2 He has many outside calls upon his energy. 3. His staff has a varying outlook, and provision is seldom made in school estimates for staff visits to other schools, especially those run on special lines of development, which would give fresh inspiration and contacts. 4. The climatic factor makes preparation by the teacher very burdensome.

But correlation is possible if the staff have before them a clear sighted objective. For convenience, it is helpful to think of correlation under subject headings ; although in no subject is overlapping more self evident, or an attempt to teach it in a watertight compartment more fatal.

(As a Kindergarten department is usually under the charge of one, or at the most four teachers, and follows a different time-table from the rest of the school, a discussion of correlation at that stage of mental development will not here be considered).

Geography and History.

To-day, owing to the use of wirless and aeroplane, India is relatively nearer to Europe than was Edinburgh to Lon-

This having been done, the pupil in the upper classes will draw suitable diagrams when necessary. Calculations as to the cost etc. of whitewashing matting or paving the various rooms in the school would be more interesting than taking imaginary rooms. The results obtained might be compared with actual bills for the same, if these were available.

It is necessary to keep in mind that throughout the course revision work must constantly be employed and accuracy insisted upon together with speed as far as possible. Oral work should be a feature of each lesson.

A teacher may master the methods of teaching the various rules and demonstrate them ably to his class, but that will not necessarily make him a good teacher of arithmetic. More than teachers of other subjects, he needs to be keenly observant and alive in his class, observant as to the amount of effort his pupils are putting into the solving of a problem, observant as to the speed and accuracy of their work, and quick to see whether the shortest methods have been used and unnecessary working avoided. He must also be able to make his own examples based on the knowledge of what is of practical interest to the class.

If such is the quality of the teaching the pupils meet with in their arithmetic lesson, not only will the knowledge acquired be of practical use to them in life, but the mental discipline undergone will lead to clearer and more accurate thinking and the world consequently be the richer.

5/8inches long. Paste these on to the longer strip and it is found that 7 such pieces are needed, leaving a small piece uncovered. This being measured is found to be $\frac{1}{5}$ as long as the 5/8 inch piece.

A lesson or two spent thus make fractions real and not a mechanical cancellation of number. Problems on fractions should deal with numbers and situations a child can visualise, e. g., fractions of his pocket money, his Scout Company Funds, his probable income on taking up work. Decimals being fractions of another form need no separate treatment here.

Once fractions are thoroughly grasped the Unitary Method is seen to be merely an application of the principles of multiplication and division.

In 5 days 8 boys dig their garden. How many boys will be required to dig it in 4 days?

In 5 days 8 boys are needed
,, 1 ,, 8 x 5 boys are needed
,, 4 ,, $\frac{8 \times 5}{4}$,, ,, ,, 10 boys.

Care should be taken as more advanced examples are given that the fractional form of the sum is preserved till the last line and only simple cancelling done in the intervening lines.

Interest and Percentage need not be treated as separate rules except as involving certain technical terms, since they are only sums in proportion. Several text books present various problems as if they were rules involving some new principle, *i. e.*, proportional parts, time and work, income tax, thus merely spoonfeeding the pupils, for these are only proportion in problem form necessitating clear thinking on what the required statement for the first line should be.

Square Measure should present no difficulty if in the lower classes measures of length have been taught through a lot of practical work and plans have been made to scale.

We now come to the work of the Third and Fourth Standards, where more tables are embarked upon, more written work done. Apparatus of seeds and sticks is no longer necessary, but that does not confine us to abstractions. More ambitious shopkeeping and more involved transactions at a Post Office can be carried on; bills made out for purchases and telegrams and Money Orders sent. Here care should be taken to use the weights in use in these Dominions. A Booking Office at a station might be kept with tickets made by the children to places they know, and distances calculated together with the cost at so much a mile. If the school time-table permits, here is the place for the Project Method of teaching—a real school shop instead of a play one.

Fractions have next to be tackled, but to go into any detail of the teaching of these would take too long in a general paper, but let us remember here particularly that a child needs to visualise fractions first before he can really grasp the addition, subtraction, multiplication and division of the same. It is neither child's play nor waste of time to use coloured papers and diagrams for purposes of demonstration, taking care that the children do the demonstration themselves. Thus prove that $\frac{1}{2} = 2/4$, 3/6 4/8 etc. and $1/3 =$ 2/6, 3/9, 4/12. Having proved this the way is open for the addition and substraction of fractions of a different denominator, and incidentally L. C. M. is taught in the process instead of arbitrarily being made a rule on its own.

For multiplication of fractions to show that $2/3$ of $3/4 = \frac{1}{2}$ take a 2 inch squared paper and cover $\frac{3}{4}$ of it with another colour and form a second square. Cut a piece 2/3 as large as the 3/4 and paste it on the first square and show thus that it is equal to $\frac{1}{2}$ of the whole.

In the same way, division may be demonstrated e. g. to prove that $4\frac{1}{2} \div \frac{5}{8} = 7\frac{1}{5}$. Take a strip of paper $4\frac{1}{2}$ inches long and then cut several pieces of coloured paper

cannot be laid on the importance suitable apparatus plays in the real understanding of this. Bundles of sticks are the best for this purpose as they can be grouped as wholes or broken up as required, the units loose, then ten units tied together to form a ten, and then ten of these laid together to form a hundred. In this way children realise what they are doing when they borrow in subtraction or carry in addition.

Counting in single units should gradually give place to counting in two's, five's, ten's etc., which incidentally prepares the way for the formal teaching of tables. These should be built up of equal groups of seeds by the children to ensure apprehension and then learnt thoroughly by heart. Division, of course, would be taught in a similar way beginning with the larger group and then breaking it into the required number of smaller groups.

Weights, Measures and Money should also play their parts in these sums, care being taken not to embark on those beyond a child's comprehension, *i. e.*, nothing beyond seers or yards. Here too the elementary idea of fractions enters, but in a concrete way. Seer measures, ½ seer, ¼ seer, 1/8 seer can be used, filled with sand and the child learns how many times the half measure or the quarter measure goes into the whole and how many times the quarter or the eighth into the half. Similarly, with parts of the rupee. Again games can be used, a shop can be kept or a post office and measuring can be done in connection with paper work or in the making of plans of their class rooms or immediate surroundings

Once the principle of these operations is grasped care should be taken that the children increase in speed and accuracy, and throughout all these early stages oral work should be predominant, nor must it ever be neglected in the more formal work that follows.

therefore these had to be measured to get the best out of life : how much land was necessary for how many cattle for grazing ; how heavy the arrow for the bow ; how much wood or stone required for the building of a house etc., together with the exchange and barter necessary for these transactions.

Thus should it be with the child, only with the way shortened by the experience of the race. Number, for example, should be taught through the things a child has to use which are of importance to him, incidental teaching preceding formal teaching, i. e., in playing a game of ball he might count the number of catches, in threading groups of different coloured beads to form a pattern the child can count the different groups. Then comes the more formal teaching of the composition of number, and here we must remember that the child does not think abstractly. The number must be made of concrete things ; seeds, marbles, sticks etc. Each should be presented as a whole to begin with, *i. e.* 8 seeds. These are then capable of being broken up into 7+1, 5+3, 2+6, etc., capable of being divided into equal groups-4 groups of 2, 2 groups of 4, and then each little group being equal to each other forms one-fourth or one-half of the whole. In short, addition, subtraction, division and multiplication are taught concretely with seeds in front of the child to touch and see, to divide out among his class and so forth. Various games can be devised in this teaching ; e. g. the child shuts his eyes while the teacher takes some of his seeds away and then opens them to see how many are gone. Similarly, to teach multiplication each child in a little group of children can run and touch an article near by twice and then the total number of times the group has touched that article can be calculated.

As a child's knowledge of number grows, there comes the introduction of the value of a number according to its position, *i. e*, units, tens, hundreds; and too much stress

yet we teach as if we had twenty compound rules, taking each process of each table as if it were one rule, and we divide Fractions up into simple, complex, concrete and do the same with decimals also. Similarly, instead of teaching Simple Interest as Proportion, we speak of finding the Interest, the Time, the Rate, the Amount, as if each was a separate rule.

Thus year after year we unconsciously present arithmetic to the child as something formidable to be tackled, and the very word arithmetic to most means something incomprehensible that must be got through somehow or other, a jig-saw puzzle that only fits if the teacher gives the clue, or some child near by happens to hit upon it. Not only do we magnify difficulties by presenting rules as manifold, but also by offering unreal abstractions and situations as examples to be worked by these rules; e. g., any compound proportion sum, complex fractions several inches long, whose answer is probably right if it comes to 1, A's and B's entering into partnerships or getting legacies is some fractional ratio to half a dozen others and so on *ad infinitem*. Meanwhile, in all probability the child cannot tell what change should accrue out of Rs. 5 if 3½ yards of stuff @ 7½ as. a yard are bought, or rule a straight margin one inch wide.

It is in this respect of examples especially that arithmetic is of so little practical value to girls, as the situations imagined have no bearing at all on their own lives. Few, if any, arithmetic books, for example, give any sums bearing on the cost of making children's clothes, of running a household, or on proportionate food values or in fact on anything that has to do with the domestic side of life.

It is a truism to say that the individual's development largely reproduces the development of the race, but it is a truism we overlook in the teaching of arithmetic. In the race quantity arose when anything had to be measured. Man found that land, food, energy, time were limited and

may find it advisable to adopt one method with one class, while a different method obviously suits a different class better. Let the teacher himself first be highly practical in his selection of method, guided mainly by the prime requirement, the *sine qua non*, of all practical work in any field, namely COMMON SENSE.

In the end, a word may be added about the homework. The aims of homework should be mainly:—

(1) To drill on work the theory of which is already well understood.

(2) To inculcate neatness in setting out and in writing.

(3) To develop correctness of expression, involving the use of more or less technical words and phrases.

In awarding marks for homework exercises, severity should be exercised in dealing with faults included under heads 2 and 3.

Methods of Teaching Arithmetic in Primary and Middle School Classes.

BY

MISS. D. M. CLOUGH, B A.

(*Wesleyan Girls' Normal School, Secunderabad.*)

ARITHMETIC, we are told, is studied with a twofold aim: (1) to aid clear and accurate thinking, that is, as a mental discipline; (2) to enable us to take part in the daily activities of life such as buying and selling, computing expenses, and it is with this second aim that we are concerned.

For this second purpose the fundamentals are a knowledge of the four simple rules, fractions and proportion, and

Such a laboratory lends itself well to what in Germany is termed the art of being able to "Talk and Chalk" at the same time. German students are encouraged in this art from the very beginning. It requires and develops three simultaneous activities,—thinking, writing, speaking; and requires considerable practice, but is nevertheless a desirable practical feature, as in actual life we are often called upon to do these three things at the same time. It also has its advantages as a very practical method for the teacher to adopt, if he wishes his proof to *grow* under the pupils' observation. His instruction thus possesses a life which a text can never have. Earlier steps are thus not encumbered by what is not required till later. The blackboard should not be treated simply as a place where an enlarged copy of the text can be displayed before the eyes of all. Also the attention of all the pupils is directed to the same point in the proof at the same time. It acts as a strong barrier to mechanical work, as a pupil thus demonstrating at the board, must explain each step as he takes it. Questions may be asked and discussions arise form stages of the process, so that it is an effectual antidote to simply reproducing memorised work. The method demands the strongest appeal at all times to common-sense, and hence as shown at the outset, fulfills one of the main requisites of a practical method.

This bring us to the conclusion of actual methods which may be adopted in the class room. Each has certain advantages over others, and it should now be the object and desire of each teacher of mathematics to carefully consider all factors concerned, before blindly binding himself down to employ only one single method. Even the teacher's ability to do justice to a method must be regarded. The pupils' ability, and former training, also influence the result obtained with any specific method. The most successful teacher will be the one who knows, and uses, all good practical methods, but with discretion. Even in the same school he

simply measure the lines and accept the practical result ?

Proofs involving free use of motion are often far more convincing to the child mind than the usual cast-iron, strictly logical ones formerly used, e. g. to show that the sum of the external angles of a convex polygon is 360 degs, suppose a man to walk around the polygon. At each corner he turns through the external angle at that corner, and when he reaches the starting point he has made one complete turn, namely 360 degs.

Teaching through the eye is admittedly one of the best and most practical ways of imparting new ideas. To this end, therefore, teachers of mathematics should try and cultivate some measure of dexterity in the rapid execution on the black-board of clear and tolerably accurate diagrams, making the fullest possible use of coloured chalk to distinguish either differences in time, or importance, or plane, or between data and construction, or known and unknown. In fact the possibilities of coloured chalk suggest themselves "ad lib" as the teacher makes more and more use of them. A word as to suitable colours may be said by way of warning against unnecessary expense. Only certain colours show up well on a black-board, the most striking being yellow. Green and red show well, but other colours are practically useless.

The use of the Laboratory is intended rather to supplement much of the existing class work in mathematics, not to entirely displace it. It could however, well displace the present mathematics homework. Much of the theory developed in the ordinary class periods should be put into actual practice in the mathematical laboratory, and for this it has been recommended in America, that the mathematical periods be doubled. This will of course necessitate a longer school day at school; but the idea is not to give more mental work per day to the pupils, rather to permit a larger portion of their time to be spent in school under supervision.

apparatus, the very simplest consisting of pencils and paper, supplemented as desired by mathematical instruments, squared paper, coloured chalks for black board use, or coloured crayons for the pupils' use on paper. With these much can be actually *done*, which used to be only *thought about*, and treated abstractly. More elaborate apparatus of great value in a fully equipped mathematical laboratory would be:— sufficient black-board space for each pupil to work at the same time, some squared boards for graphs. Spherical blackboards and hinged blackboards are useful for special work in solid geometry.

Mathematical models, which can well be made at the teacher's direction, illustrating various phases in "locus" and linkages, etc., Other pieces of apparatus may follow; slide rules, surveying instruments, balances, steelyards. pendulums, levers, pulleys, screws, mercurial barometer, hydrometers etc.

The main thing is to get the fundamental use of material activity, including drawing. Then generalise from the concrete to the abstract. Squared paper is exceedingly useful in demonstrating points. The graphic method should be encouraged not from the point of view of "introducing graphs", but rather from the aspect of an easy solution to the problem. Pupils are interested in drawing graphs, and enjoy reading off other information brought out by the graph.

Also an important point should be that various modes of proof may be admitted, not necessarily adhering rigorously to the old time-worn ones. Intuitional proofs should be accepted, as in actual life it is one of the most practical methods of gauging the correctness of any conclusion. Proofs based on actual measurement may also be accepted as satisfactory; e. g. that the perpendicular from a point to a line is the shortest way of joining that point to the line. This is customarily done by an elaborate method of greatest sides being opposite greatest angles. Why not

does not prove that it will appeal at all to the child mind, since circumstances requiring the use of pulleys etc. have not yet arisen within his own life experience. They are not practical to him at this stage of his existence.

The method of nature has been more or less closely followed. Nature always dissimulates her true end, in most things natural. The true end of eating is to nourish the body, but nature would have us believe it was simply to tickle the palate, or to assuage the pangs of hunger. A healthy child romps and plays. Nature's end in this is the development of muscle, bone, and physique generally. From this we may take a lesson, that the mathematics teacher should not so much attempt to interest children in mathematics itself, or even in the purpose for which it is taught, but rather in the way he teaches it. All children love, instinctively, to *do*—to exert their powers. If the child can *do* successfully, then he usually *likes* that which he attempts. If he can bat successfully, he usually likes cricket, and so on in all natural things. The same applies to mathematics. If he can do successfully, it is equivalent to his liking mathematics. Then half the battle has been won. He does not worry much about the question of usefulness, practical though it may seem to an adult. The child's idea of a practical method, is a method in which he finds just sufficient difficulty in doing to keep him occupied and interested, and yet one in which he is moderately easily successful. If the rules of cricket were made so intricate and impossible that only a genius could play successfully, cricket would at once become distasteful to the average boy, and would soon cease to be. Mathematics has been saved from this extreme fate, by being forced on the child mind in the past. Let it be made sufficiently interesting, by being made practical, incorporating many things to *do* and not simply to *think about*, and the subject will take its place alongside other favourite subjects and even games. This implies the use of certain

(2) Each pupil works all the time.

(3) Self-reliance is cultivated in the pupil.

(4) The pupils do more thorough work.

(5) They do more work.

(6) The weaker ones need not be carried beyond their depth.

(7) The pupils are more thoroughly interested in their work.

All must admit that these are all very great, as well as practical, advantages. In fact the method lends itself extraordinarily well to introducing a practical touch to the teaching, since no two pupils' minds are exactly alike; an illustration or example which appeals to one, drawn from his practical experience of life, may leave another quite unmoved. Hence the opportunity of dealing along a practical line with each pupil is offered. A knowledge of the pupil's special interests may also be acquired, and turned to good account in rendering the practical touch needed to make him see and acknowledge the "use of it", as applied to many more or less abstract processes in mathematics. This last leads to another great advantage, namely, that there is a more cordial feeling towards the teacher. He is a friend in need, not a task-master, or even a drill master.

We now come to a method of which all the above methods may be taken as antitheses, so it will be dealt with alone. This is a method which in America has been given the term "*The Laboratory Method*". The method grows more directly out of the psychology of the child mind than do the others. A slight sacrifice of the strictly logical may have to be made in favour of the psychological. Interest is the key-note. What will interest the child must be sought, and is not the same as will interest the adult in many cases. Because the adult grows interested in combinations of pulleys, mainly because he sees the "use of it",

that pupil. Briefly the essential characteristics of the method are as follows:—

(1) Assignment in advance of specific work to be done. (Theory and problems of a text book.)

(2) The pupil works at his own rate, unhindered.

(3) The class exercise is modified as the work progresses. At the commencement all are working on the same problem, but as time progresses, finally each one is working on a separate problem, and still at his own rate. The teacher passes about the room helping those pupils who ask assistance, and leaving the remainder undisturbed

(4) The work assigned is divided up into certain convenient sections. A pupil has the choice of presenting himself for a test in any section when he is satisfied that he has mastered it. He is then assigned supplementary work or promoted to commence working on the next section.

(5) Having completed the customary amount of work in that subject, the pupil is excused from further attendance in the class, and can then concentrate on some other subject at will. The advantages of this method are many and striking, but there are also several grave disadvantages from the teacher's point of view. First, it is extremely tiring to keep up the urelenting alertness required to seize and grapple well and quickly with the diverse needs of pupils all working on a different problem. Second, there is no uniformity in written tests, and this demands much longer time in corrections.

The advantages are mainly seen from the pupil's point of view.

(1) There is a fair chance for even the slowest pupil, who would ordinarily be left to flounder along behind.

There is a danger, however, that the outward form of the heuristic method be retained, while the spirit is entirely lost. The questions may be made too much of the "leading question" type, so that the pupil simply has to assent to a whole series of truths asked him, and does not do any real thinking on his own behalf. An example will help to make this necessary distinction clear.

False Heuristic.—

Is ABCD a parallelogram? Is it true that the diagonals of parallelograms bisect one another? Is therefore, A E equal to EC?

True Heuristic:—

What sort of a figure is ABCD? What do you know about the diagonals of such a figure? What lines in the figure are therefore equal? How does this knowledge help us in our (main) problem?

Thus the essence of this method lies in the fact that the pupil is not told things directly, but is rather made to see them for himself. The actual mode adopted of attaining this heuristic spirit in the class may vary from practically individual work, to that of getting the class *as a whole* to rediscover these things. This may be termed the "genetic" mode.

(4) The Lecture Method and the Individual Method.

This bring us to the fourth pair of antitheses. The first cannot be recommended for schools. It is the usual method of many Universities. It is not at all practical, so will not be discussed here.

The Individual method aims to shape the work so that there may be individual progress according to individual strength. It is a practical method of overcoming the very practical difficulty of the different rates of work of varying pupils. The need for this is great since if yesterday's work in mathematics or physical sciences is passed over not properly understood, the work today will seem harder still to

which he will henceforward use with pride, as they were discovered by himself, and were not thrust upon his unwilling soul. The teacher here should, of course, see to it that such definitions agree with those current, and by one or two timely hints, towards the finalisation of these definitions, bring the pupil so to mould them in phraseology, that they will be easily recognised by any other workers in that field. He may be allowed, for the first attempt or two, even to use his own arbitary signs, but this should not be prolonged until a habit has been formed. The easiest way of diverting the pupil from using his own signs, at this stage, is to demonstrate to him the danger of a clash of meaning between his own symbols and those already in use in other branches of mathematics or physics. He will then readily, even cheerfully, resign his own choice of a symbol for one suggested by the teacher, without feeling that he has in any way been robbed of his own discovery.

NOTE:—This paper is limited to methods suitable for high schools, but it might here be pointed out that the very first acquaintance with the terrifying unknown "x" in primary classes, just starting algebra, can be happily accomplished in this way with beneficial results. In dealing with the first several simple equations involving the use of "x", get the pupils to write out in full the part of the problem usually denoted by "x". Suggest that by some very simple diagram or picture, roughly representing this part of the problem, a great deal of unnecessary writing would be saved. For example, if the unknown part deals with the number of sheep a man bought, etc., then let the pupil try his hand at sketching, very rapidly, the outline of a sheep, and substituting this for the whole phrase. Let him continue with this abbreviation for a few problems. Then set a problem where it is difficult to represent the required part by any diagram. He himself will probably suggest some letter, say the first letter of the most important word in the sentence. If he does not, hint at it. Then it is only a step to introduce the ubiquitous "x", by suggesting a letter, which we could use like this in all problems, yet which very very seldom comes at the beginning of a word. Thus the idea of "x" is welcomed, as saving the trouble necessary to think of a suitable letter to place as a substitute for a long phrase. "x" at once becomes the pupil's own, and he loves to use it thenceafter.

(3) *The examination method and the Heuristic method.*

The examination method cannot be too strongly condemned, consisting as it does in assigning to the pupils certain matter to be memorised, and certain problems to be solved. The actual class period is then taken up by what amounts to an examination by the teacher to find out by various means whether or not the pupils have done their assignments satisfactorily. It can very easily degenerate until the teacher becomes hardly human, little more than a machine. The pupils receive no help, stimulus or inspiration from the lesson period. Such teachers could almost be economically replaced by gramophones, which had a device to shout out, "Wrong, the next", every time the familiar words of the text were not spoken into it correctly. The subject dies of sheer inanition, and is as far removed from the normal test of every-day life as the north pole is from the south. Hence as a practical method it must be relegated to the days of ancient things. However as an occasional check on the general work of the class, by way of a quick revision, it is excellent.

The Heuristic method, on the other hand, makes the teacher the focus point of attention, as a source from which the desired information may be obtained, though not so cheaply as to make the student feel that he has been given it without some definite effort on his part. Coming as it does from a Greek word meaning "I find," the name itself is a slight explanation of the method. It aims at making the student a discoverer, not a passive recipient of knowledge. The student, in a sense, rediscovers the subject for himself, though unlike a real pioneer, he is doomed to pure success and not to utter failure, since his teacher ever stands ready with encouraging remarks, often half choosing the path for him, where it would appear the young adventurer would wander sadly astray, and thus lose valuable time, as well as growing downcast in his endeavour. It is specially adaptable in getting the pupil to formulate his own definitions,

publishing reasons, thus the teacher will be wanted for a long while to come to put into actual practice with the class in the class room the antithesis of this method, namely the Analytical Method. This is the natural method of life, of chess, of war and of a thousand other practical things Its principles are well known:—namely, assume the desired fact proved, and work backwards, noting mentally all the subsequent facts which must in that case also be true. When the path has been retraced till familiar ground is reached, the problem is solved, and by setting the facts so discovered down in the reverse order to that in which they were discovered a synthetic proof may be obtained, but a sense of mastery accompanies it, and the student sallies forth encouraged to attack and conquer fresh and more impregnable fortresses. It is a safe method from the primary school right up to the university.

(2) *The Deductive and Inductive Methods.*

The first of these proceeds from the general to the particular, while the second proceeds from the particular to the general, thus lending itself to a more practical method of treatment and development, while the first does not. Once a formula has been established, the deductive method lends itself admirably for the written setting-out of problems, which is often so badly done by the average student, that his work is scarcely readable.

The Inductive method may however, be used with advantage in geometry, by giving the student some specific problems, as practical as possible, even to the extent of cutting figures out of thin cardboard to prove those specific cases. These should be so carefully chosen that they foreshadow, and lead up to, the theorem in question. This is to be continued until the pupil himself, (with some prompting if necessary,) announces the theorem, and sees the need for its rigorous proof. He is now ready for the proof, and after it is given, more examples of its application should be given.

will melt away under his highly trained faculty of common sense, the king of the faculties.

We may now consider the various methods available to inculcate this practical atmosphere into mathematics teaching.

If the existing modes be considered, it would appear that they fall naturally into roughly four groups, each group consisting of two modes almost directly opposed to each other. It has probably became thus owing to a swing of the pendulum, as it were, away from any one mode being driven to death to the exclusion of any other, thus obtained poor results.

(1) *The Analytic and the Synthetic modes* may be taken as constituting one of these pairs of opposites, as their very names imply.

The synthetic method is the method of the text books, and it alone is evidently a failure since very few students can make much headway working unaided from a mathematical text book without a teacher. The truth of each step is evident and flawless, and the gradation often perfect, the whole proof growing before one's very eyes, yet at the end the question often is asked, "How did the author arrive at this proof?" It leaves the pupil disheartened, when he considers himself compared with some monstrous brain which could see the end from the beginning as it were, and go right through all those intricate steps, even tricks, as many of them appear to him, and arrive safely and victoriously at the desired haven. "I will never be able to do that," he says in disgust. Therefore the method is not a suitable one for the class room, for the simple reason that it does not accord with our definition of a practical method. Conclusions in actual life are not arrived at that way; unless by prophets! Moves in chess are not evolved that way so why adopt this unpractical method in mathematics? Text books would find it difficult to adopt any other method, for

this nature, mathematical study is almost useless for culture. In all original research work, correctness and certainty are the first desiderata. Time is only of secondary consideration. Thousands of research workers spend months over one small section of work, but it is original, and herein lies its cultural value. Hence the pupil should not be hurried in any way but given all the time he needs. Not " how soon? " but " how well ? " is the question. By this standard all scientific original work is judged, why not the pupil's first few attempts at orginal work in mathematics ? If the student be permitted to adopt this system, then memorising automatically gives place to remembering, and thus does away with much of the horror of mathematics to pupils with weak memories, yet keen understanding. For memory requires no understanding; whereas remembering requires bringing up to the conscious part of the mind facts which have been perfectly understood at some former date, but through lack of use have subsided to the subconscious. Such facts only present themselves to the conscious when the corresponding complex is aroused, in this case a specific type of problem. On the other hand, memorised facts are liable to assert themselves at all sorts of inopportune moments, and are sometimes in desperation accepted as correct, whereas they often have not the slightest connection with the problem, leading to those oft-times ludicrous replies all teachers have been nonplussed to find, and to explain the reason of their use.

The spirit underlying the introduction of a practical touch into teaching mathematics thus does not depend only add entirely on the nature of the mode adopted, but rather on the whole attitude of teacher and class to the subject, its correlation with life and nature and above all, the insistence of the use of Common Sense in everything. Common sense constantly employed in school in mathematics will become part of the very nature of that pupil, so that in all his after life, problems admitting of no specific formula for solution

in the ordinary mathematics lessons, but the ideal would be that all possible problems, set often by the mathematics teacher merely for the sake of exemplyfying some mathematical process, such as factorisation, and the removal of brackets etc., in algebra, should be actual simple problems arising in physics, and needing these processes for their correct solution. The very atmosphere of algebra thus taught then becomes practical, and the uses of the algebraic processes so employed at once become self evident, and therefore worth learning, in the pupil's estimation.

It should be the pupil's privilege as well as that of the teacher, to know *why* his subject is part of the curriculum. A correlation such as this would answer, the oft-asked question, "What's the use of Algebra?" The obvious answer, reached by the pupil's own mind, would undoubtedly be, that we cannot properly understand Nature without it.

(3) *Progress :*

This is an important object, worthy of attainment. It often applies to progress in the attitude of the student to his work, and if by making the work sufficiently practical to arouse his interest, so that instead of passively traversing the path mapped out for him by teachers and curricula, his hearty co-operation in the work is obtained, much good results, and definite progress rapidly ensues. This leads to the ultimate aim or object to be attained, *viz.*

(4) *Original work :*

A state of mind having been developed as outlined in the previous section, the teacher and the text should simply assist and guide in the work, and not actually do it. This is the essence of practical work in any science The cream of the world's mathematics consists in so-called "originals". But the mental value is the same whenever a student does *his own* work, for he is then in all reality actually doing original work, whether formally stated and publicly recognised or not. The value is the same to him. Without work of

The meaning in mathematics, then, may be taken to include all those methods which savour of practical use in everyday life, above all, the simplest, most direct, and most common-sense methods, which succeed in quickly proving the problem or theorem, but may not necessarily employ all the higher flights of theoretical mathematics, which so readily present themselves for employment to a professor of the subject, but certainly not to the tyro. Thus in selecting suitable "practical" methods, it would be well to bear in mind the main objects we wish to attain in teaching Mathematics. Some of the most important of these are as follows :—

Objects to be Attained :—

(1) *To meet every-day thinking needs.*

There is to-day such a vast gulf separating the thought processes required for solving the standard mathematical problems, and that required to deal with the thousand and one problems presented by modern every-day life, that training in the former department does not seem to be carried over into satisfactory thinking requisite for solving the latter problems. Thus a practical turn must at all times be definitely introduced, so that the mental processes made more or less habitual, quick and accurate, may be carried over into the realm of every-day life without losing their characteristics, and without the pupil feeling that he is now in entirely uncharted seas. Mental alterness may be fostered by solving problems mentally.

(2) *Correlation with nature :*—This should not be left to accident as it were, but the connection between nature in its most obvious forms of natural phenomena on the one hand, and pure mathematics on the other extreme, should be given due consideration. The best medium for this correlation is the study of Physics, which touches both extremes. The mathematics of Physics should not be kept in a water-tight compartment, as it were, and never mentioned

field measurements, as its name implies. In view of this, the above quoted excuse for weakness in this subject must be regarded simply as an opiate for something far more serious either on the part of the pupil or teacher.

If this "no head for mathematics" excuse be really true, then it is hard to see how any one really lacking such capacity could prove equal to the far more difficult reasoning demanded of him in any walk of life. Is he to be a lawyer? How can he learn to analyse a complicated legal case if he cannot learn to analyse a simple problem in Geometry? Is he to be a student of History? How can he estimate the effect of Swaraj for India on the rest of the world, if he cannot determine the influence of a co-efficient in a simple equation in Algebra? Is he to be a linguist? How is he to translate some masterpiece from one language into another, rendering all its myriad shades of delicate meaning, if he cannot learn to translate a trifling "reading problem" into its corresponding mathematical symbols?

However, the very fact that in the face of all these reasons the general public, and parents particularly, still hold the firm opinion that some special brain qualification is necessary for success in mathematics, is an alarm signal to teachers of mathematics to look sharply to their own modes of instruction in this subject. Their subject evidently lends itself to universality of attainment, then it must be the METHOD adopted which is at fault if universality of success is not obtained. This revelation leads to the fourth need, *viz.*,

(4) The need for good, practical modes in the teaching of Mathematics. The meaning of "practical" in this connection need not be confined to a corresponding meaning as in connection, for example, with Chemistry. Here it means actual hand work to be done by each pupil, since the whole of Chemistry, in the last analysis, is purely practical, being all built from the results of practical experiments.

calm feeling that mathematics, at least, is a finished subject, and that therefore its teaching can admit of no improvement. This idea is of late rapidly being dissipated, Germany and America being leading workers in this field.

(2) A need that the teacher not only know *what* to teach and *how* to teach it, but that he also know the reason *why* he teaches. Without this last he can perform neither of the former two intelligently, or even correctly.

(3) A need for making full efficiency in mathematics universal in all pupils in all schools. In the past there has been ready tolerance given to pupils very weak in mathematics, on the score of that time-worn phrase, "He has no head for mathematics." The validity of this objection to the aim of universality in efficiency in mathematics disappears when we consider the facts relating to mathematics the world over. All nations, in all ages have evolved some mathematics for themselves, as they have done languages, and forms of civilisation. However in all these others, the greatest range of diversity is at once apparent. Not so, however, in the case of mathematics. "Instead of diversities, we find a remarkable uniformity in the type of thought, a body of results so essentially characteristic of the human mind, so little influenced by chances of environment, so uniformly present in every age and civilisation, that we are forced to the conclusion that mathematics is actually ingrained in the human mind," even as it is in all the processes of other works of Nature, beside man. The very elements of the study of Nature leads to weighing and measuring, and to the establishment of relations which can be expressed in mathematical formulae and hence dealt with by mathematical methods. The most important feature of natural phenomena is change, and variation; while the most important single branch of mathematics, the Calculus,—is also a study of variation, and may thus even be called the mathematics of nature. Geometry is simply an out-growth of

Practical Methods in Teaching Mathematics in High Schools

BY

R. S. HUGHESDON B. Sc.

(*St. George's Grammar School*).

Introduction.

To obtain a clear idea of the practical value of any subject is a step in advance when searching for practical methods of imparting that subject in schools. In the case of mathematics, it becomes practically an axiom that, except the use of the mother tongue, there is no other subject so intimately concerned and connected with everyday life, and so necessary to the successful conduct of affairs in our modern world, as mathematics. Turn where we will in these modern days of steel, steam and electricity, we shall find that mathematics has been the pioneer in all advances, and that mathematics has guaranteed the results. It is safe to say that, were mathematics removed from our material civilisation, it would as surely collapse as would a man were his backbone removed.

With such an obvious practical value, there are many practical uses resulting from the study of mathematics. One of these is the ability acquired to grasp a situation, to seize the facts, and to perceive correctly the state of affairs. This is hard to do in any walk of actual life, yet circumstances demand it, if success is to be obtained. It leads to the formation of independent judgments, to the understanding of many laws of Nature, and, most important, it cultivates the clear expression of thought in correct language.

Needs in the Teaching of Mathematics.

(1) Perhaps the greatest is the need for improvement. This is so because there has for some time past been the

THE HYDERABAD TEACHER

April—June, 1930.

CONTENTS.

ERRATA.

Page 168	L 10	from bottom	"alterness" read "alertness".
,, 169	L 3	from bottom	"exemplyfying" read exemplifying".
,, 170	L 7	from bottom	"add" read "and".
,, 171	L 9	from top	"became" read "become".
,, 175	L 11	from bottom	"bring" read "brings"; " antitheses" read " antithesis"
,, 176	L 9	from bottom	"urelenting" read "unrelenting".
,, 177	L 10	from bottom	"antitheses" read "antithesis".
,, 181	L 17	from bottom	"form" read "from".
,, 183	L 16	from bottom	"infinitem" read "infinitum".
,, 204	L 3	from bottom	"notionality" read "nationality".